پنجشیر، شبرغان، بامیان اور ایران کے...... قید خانوں اور عقوبت خانوں میں
طالبان قیدیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی کہانی... ایک قیدی کی زبانی

پنجشیر سے لاہور تک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com



ڈاکٹر حامد اصغر شیخ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فرمانِ باری تعالیٰ

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا
وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝٢ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ
لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝٣ (العنکبوت)

''کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں اُن کو اُن کے یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟ ہم نے اُن کو بھی آزمایا جو اِن سے پہلے ہو گزرے۔ اِس طرح اللہ اُن لوگوں کو ظاہر کرے گا جو سچے ایمان والے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔ کیا جو لوگ برائیاں کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہم سے بچ جائیں گے۔''

پنجشیر، شبرغان، بامیان اور ایران کے قیدخانوں اور عقوبت خانوں میں
طالبان قیدیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی کہانی ایک قیدی کی زبانی

پنجشیر سے لاہو تک

ڈاکٹر حامد اصغر شیخ

مکتبہ شاہ اسماعیل شہید خانیوال

نام کتاب : پنجشیر سے لاہور تک
تالیف : ڈاکٹر حامد اصغر شیخ
طابع : مکتبہ شاہ اسماعیل شہیدؒ
اہتمام : محمد فیصل، لاہور
:

برائے رابطہ

0322-3089370 0323-4813936

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَّعَلٰۤی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
عَلٰۤی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰۤی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰۤی
اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰۤی
اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰۤی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

انتساب

والدہ محترمہ کے نام (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین) جن کی محبتوں، قربانیوں اور دعاؤں سے مجھے مجاہدین اسلام، طالبان کے لشکر میں شامل ہونے کی توفیق نصیب ہوئی اور جن کی دعائیں مصائب کی کڑی دھوپ میں ہمیشہ میرے اوپر سایہ فگن رہیں۔

محترم ابوعبیدہ، محترم عبیداللہ شاہین، محترم عبیداللہ سندھی، محترم خالد ایرانی، محترم رحمت اللہ اور محترم ریاض گجر کے نام کہ جو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں میرے لیے منارہ نور بنے رہے اور جنہوں نے جیل کی پر مشقت زندگی میں تنگی اور مشقت کے باوجود مجھے اور دیگر زخمی قیدیوں کو ہمیشہ مقدور بھر راحت پہنچانے کی کوشش کی اور جنہوں نے مجھے معذور ہو جانے کے باوجود کبھی بھی معذور ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔

اور ابولبابہ نقشبندی کے نام جنہوں نے آزادی کے بعد میری معذوری کا مجھے احساس تک نہیں ہونے دیا۔

اور ان تمام شہیدوں، غازیوں، اسیروں اور مجاہدین کے نام جو اسلام کی سربلندی کے لیے اخلاص اور استقامت کے ساتھ جہاد کی پرخطر راہوں پر گامزن ہیں۔

ڈاکٹر حامد اصغر شیخ

فہرست

تیسرا حصہ

چوتھا حصہ

پانچواں حصہ

چھٹا حصہ

ساتواں حصہ

آٹھواں حصہ

نواں حصہ

دسواں حصہ

گیارھواں حصہ

بارھواں حصہ

☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

﴿وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا﴾ (النساء: ۷۵)

''اور تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں نہیں لڑتے ان کمزور مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کی اسی بستی میں سے نکال اور ہمارے لیے کوئی دوست اور مددگار بھیج۔''

آج پوری دنیا میں مسلمان انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور ان پر زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ کی جارہی ہے اور آج اللہ کے کلمے کو بلند کرنے اور نظام خلافت کے نفاذ کی جدوجہد کی پاداش میں اسلام آباد سے واشنگٹن اور یورپ تک، قندھار سے بگرام تک، کشمیر سے دہلی تک، مشرقی ترکستان (سنکیانگ) سے چائنہ تک، بغداد سے ابوغریب تک، گوانتاناموسے ماسکو تک، تاجکستان سے چیچنیا تک، فلپائن سے برما تک، انڈونیشیا سے صومالیہ تک اور عرب سے افریقہ تک ہر جگہ پر عظیم مسلمان مرد اور عورتیں ان دجالی پیروکاروں کے عقوبت خانوں میں ظلم وستم کی بھٹیوں کا ایندھن بنے ہوئے ہیں اور رو رو کر اللہ رب العزت

کے حضور التجا کر رہے ہیں کہ:

﴿رَبَّنَآ اَخرِجنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا﴾

''کہ اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں کی اس بستی (جیلوں عقوبت خانوں) سے نکال اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار پیدا (بھیج) فرما۔''

انہیں مظلوم اور ظلم و ستم کی چکیوں میں پستے ہوئے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی آہ و بکاء پر اللہ ربّ العزت مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے تنبیہاً پوچھ رہے ہیں کہ:

﴿وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ.....﴾

''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں نہیں لڑتے ان کمزور (مظلوم و مقہور) مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے۔''

میری یہ کتاب ''**پنجشیر سے لاہور تک**'' لکھنے کا مقصد فقط اور فقط مندرجہ بالا فرمان الٰہی کہ جس میں اللہ ربّ العزت طواغیت کے خونی شکنجوں میں جکڑے ہوئے بے بس اور مجبور و مقہور مسلمانوں کی حالت زار اور ان کی آہ و زاری کا نقشہ ہمارے سامنے پیش فرما رہے ہیں، کی طرف امت مسلمہ کو متوجہ کرنا ہے کہ اگر آج ہم نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے فرامین سے روگردانی اور غفلت کا مظاہرہ کیا تو کل روز قیامت اللہ تعالیٰ کے اس قیمتی سوال کہ اور تمہیں کیا ہو گیا کہ اللہ کے راستے میں نہیں لڑتے......'' کا کیا جواب دیں گے۔

اے ایمان والو! یاد رکھو...... محبوس و مظلوم مسلمانوں کو ظلم و ستم سے نجات دلانا تمہارے اوپر فرض بھی ہے اور قرض بھی کیونکہ نبی الملاحم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

''جس نے ایک مسلمان قیدی کو آزاد کروایا گویا اس نے مجھ محمد ﷺ کو آزاد

کروایا۔" (طبرانی ص: ۱۵۱، مجموعہ زوائد، ج: ۵، ص: ۳۳۲)

اس پرفتن دور میں انفرادی طور پر شاید ہم اپنے ستم رسیدہ مسلمان بہن، بھائیوں کے لیے کچھ بھی نہ کرسکیں اس لیے ہمیں چاہیے کہ افغانستان میں احیائے خلافت کی تحریک تحریک طالبان کے مجاہدین کے ساتھ ہر سطح پر بڑھ چڑھ کر اخلاقی، مالی اور جانی تعاون کریں تاکہ وہاں پر اسلامی خلافت کا قیام عمل میں آجائے اور پھر جب خلافت قائم ہوجائے گی تو مجبور ومقہور مسلمانوں کے لیے نجات کی سبیل پیدا ہوجائے گی کیونکہ خلافت تمام دنیا کے مسلمانوں کی محافظ اور نگہبان ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے محترم ومکرم سیّد مقصود علی شاہ صاحب (مدیر ھدی اللناس) کو جنھوں نے سب سے پہلے مجھے اپنی قید وبند کی روداد لکھنے کی ترغیب دی بعد ازیں جیل کی اس داستان "**پنجشیر سے لاہور تک**" کی تکمیل میں محترم مولانا ابولبابہ نقشبندی صاحب، محترم ابوعبیدہ صاحب اور محترم ابونور الدین صاحب کا بہت بڑا کردار ہے کیونکہ یہ حضرات وقتاً فوقتاً اور گاہے بگاہے اپنے اپنے انداز میں مجھے کتاب مکمل کرنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور یہ سچ ہے کہ یہ حضرات اگر کتاب لکھوانے پر مسلسل زور نہ دیتے اور اصرار نہ کرتے تو شاید میں یہ کتاب مکمل نہ کرسکتا، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ (آمین)

علاوہ ازیں میں مشکور ہوں محترم ریاض گجر، محترم قاسم علوی، محترم عبدالحفیظ (شیخوپورہ)، محترم شاہ ثاقب اور ماہنامہ ہدی اللناس میں "**پنجشیر سے لاہور تک**" کا قسط وار

سلسلہ پڑھنے والے قارئین کا جنہوں نے بھرپور طریقے سے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

اللہ ربّ العزت سے دعا کہ وہ میری اس حقیر سی کاوش کو امت مسلمہ میں بیداری کا ذریعہ بنائے اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔ (آمین یارب العالمین)

احقر

ڈاکٹر حامد اصغر شیخ

۱۱-۱۴۳۱۵ھ

25-4-2010

مقدمہ

زندگی غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے، انسان کو جہاں خوشیاں ملتی ہیں وہاں غموں کو بھی سہنا پڑتا ہے، جہاں کھلتی ہوئی ترو تازہ بہاروں کی شادابی سے لطف اندوز ہوتا ہے وہاں خزاؤں کی پژمردہ ویرانیوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، یہ دونوں چیزیں یعنی خوشی اور غم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ دونوں میں سے اگر ایک چیز نہ ہوتو دوسری چیز اپنی قدر کھو دیتی ہے، اگر ہمیشہ خوشیاں ہی ہوتیں تو خوشیوں کی کوئی قدر نہ ہوتی کیونکہ اس خوشی اور شادمانی کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے جو غموں کے بعد میسر آتی ہے اور بہت زیادہ مصائب کے بعد ملنی والی خوشیوں اور راحتوں کی قدر بھی بہت زیادہ ہوتی ہے اور پھر جب بات باطل قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کے بعد درپیش مشکلات پر آتی ہے تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے اور حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی ہمیشہ سے ہے اور قیامت تک رہے گی، اگر چہ ہر دور میں حق والوں پر کڑی آزمائشیں آتی رہی ہیں مگر کبھی بھی حق گو حضرات حق بات کہنے سے باز نہیں آئے کیونکہ حق پر ڈٹ جانے کی پاداش میں ظلم وستم سہنے، رنج و الم اور مشکلات کے کوہ گراں کو برداشت کرنے میں جو مزا ان کو آتا ہے اور جو روحانی راحت وسکون ان کو نصیب ہوتا ہے اس کا ادراک وہ آدمی کبھی بھی نہیں کرسکتا جو معرکۂ حق و باطل سے لاتعلق ہو۔

بندہ کا تمہید باندھنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنی سرگزشت اسارت کو صفحۂ قرطاس پر لاکر امت مسلمہ کو مشکل ترین پر اوز مصائب حالات میں اللہ رب العزت کی مدد و نصرت کے آنکھوں دیکھے حالات و واقعات سے باخبر کروں۔

اللہ رب العزت کی مدد ونصرت کا تو ہر مسلمان قائل ہے لیکن پھر بھی بہت سے لوگ ایسے

ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ آج کے پر خطر دور میں کہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ونصرت آئے گی مگر ہم نے جیل کی اندھیر کوٹھڑیوں کے اندر جہاں ظاہری طور پر مایوسیوں اور نا امیدیوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا رب کائنات کی مدد ونصرت کو بہت قریب سے دیکھا ہے وہ پر سوز اور بڑے بڑے بہادروں کا دل ہلا دینے والے منظر، جب ایک ساتھی پندرہ پندرہ بیس بیس آہنی ہنٹر برداروں کے شکنجے میں ہوتا اور وہ ظالم اس ساتھی کے ناتواں جسم پر ہنٹر برساتے اور غلیظ ترین گالیاں اپنی ناپاک زبان سے بکتے، یہاں تک کہ وہ ساتھی تکلیف کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہوجاتا تو اس پر بھی ظالم بس نہیں کرتے بلکہ درجہ انجماد کو پہنچے ہوئے ٹھنڈے پانی میں ان کو پھینک دیا جاتا، ہنٹروں کے لگے ہوئے زخموں پر ٹھنڈا پانی تیزاب سے بھی بڑھ کر ثابت ہوتا، ہوش آنے پر ظلم وستم کا وہی سلسلہ پھر سے شروع ہوجاتا، دوسری طرف دوسرے ساتھی اپنے ساتھی پر ظلم وستم ہوتا دیکھ کر خون کے آنسو رو رہے ہوتے اور گڑگڑا رہے ہوتے، بارگاہ الٰہی میں اپنے ساتھی کے لیے دعائیں مانگ رہے ہوتے حالانکہ ان سب کو معلوم ہے کہ یکے بعد دیگرے ہم سب کا نمبر آنے والا ہے لیکن پھر بھی اپنے سے زیادہ زیر شکنجہ ساتھی کے لیے دعائیں مانگ رہے ہوتے تھے لیکن ان حالات میں بھی جب ظاہری طور پر مایوسی اور نا امیدی منڈلاتی نظر آتی، ہر ساتھی اپنی جگہ پر مطمئن اور صبر واستقامت کا پہاڑ نظر آتا تھا۔

ہائے، وہ منظر میری آنکھوں سے کیسے اوجھل ہوسکتا ہے جب ساتھیوں کو یخ بستہ پانی کے اندر کھڑا کر کے ان کی زبانوں اور جسم کے دوسرے نازک حصوں پر برقی چونٹیاں لگا کر بجلی کے جھٹکے دیے جاتے تھے اور سب سے اذیت ناک لمحے وہ ہوتے تھے جب ایک ساتھی کو دوسرے پر تشدد کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

یہ ایسے لمحات ہوتے تھے جب روح تک لرز اٹھتی تھی کیونکہ ہر ساتھی دوسرے ساتھی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، لیکن وہ ظالم بھی ہمارے ساتھیوں کے ایثار وقربانی کے جذبہ سے واقف تھے اسی لیے وہ ہمیں جسمانی تشدد کے ساتھ ذہنی تشدد سے بھی دوچار کرنا چاہتے تھے لیکن

میں سلام پیش کرتا ہوں دین مبین کے متوالے اپنے عظیم مجاہد طالبان اسیر ساتھیوں کی عظمت کو کہ ایسے ظالم و جابر کی قید میں رہتے ہوئے کہ جن کے ہاں انسانیت اور قانون نام کی کوئی چیز نہیں ایثار و قربانی کے نئے باب رقم کیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ میرے ان تمام ساتھیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور صراط مستقیم پر اللہ رب العزت ان کو استقامت عطا فرمائے۔ (آمین)

سرگزشت اسارت کی ابتداء کرنے سے قبل اللہ رب العزت سے میری دعا ہے کہ وہ مجھے ریاکاری اور دکھاوے سے محفوظ رکھے اور اپنی بارگاہ میں میری اس حقیری سی کاوش کو قبول فرمائے اور میری اس حقیری سی کوش کو تمام مسلمانوں کے لیے فائدہ مند بنا دے۔ (آمین)

☆☆☆

پہلا حصہ:

محاذ جنگ سے گرفتاری تک

محاذ جنگ کی طرف

قید و بند کی یہ داستان اگرچہ اپنے اندر مشکلات اور آلام و مصائب کی طویل روداد لئے ہوئے ہے لیکن دوسری طرف جب نگاہ عارضی زندگی سے ہٹ کر آخرت کی ابدی زندگی کی طرف جاتی ہے تو دل مطمئن ہو جاتا ہے اور دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ الٰہی یہ جسم و جان تیری ہی عطا کردہ نعمتیں ہیں اس جسم و جان کو تیرے ہی راستے میں قربان کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں تکالیف اور مشکلات کی کوئی پرواہ نہیں لیکن اے اللہ! ہماری اس حقیر سی کوشش کو شرف قبولیت عطا فرما کر نجات اخروی کا ذریعہ بنا دے اور اے اللہ ہم سے راضی ہو جا۔ (آمین)

ستمبر 1996ء کے ایک دن صبح نماز پڑھنے کے بعد میں مسجد سے باہر نکلا تو ہر طرف خاموشی کا راج تھا، صرف وہ نمازی جو میرے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلے تھے اپنے گھروں کو جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے یا پھر مسلح طالبان کی گاڑیاں جو شہر کے امن و امان کو برقرار رکھنے کے لیے گشت (پٹرولنگ) پر مامور تھیں گزرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں لیکن میں اپنے خیالوں میں گم کابل کے ماضی کی طرف جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک اسلامی ملک افغانستان میں ظلم و ستم کا دور دورہ تھا، خاص طور پر کابل کے اندر ظلم و ستم اور بے حیائی اپنے عروج پر تھی، افغانستان اگرچہ غیور مسلمانوں کی آماجگاہ تھی یہی وجہ ہے کہ جب روسی استعمار پورے کروفر کے ساتھ سرزمین اسلام افغانستان پر قابض ہوا تو یہاں کے غیور اور بہادر مسلمانوں نے اپنے جذبۂ ایمانی کے بل بوتے پر سولہ لاکھ شہداء کی قربانی دینے کے بعد سرخ روسی استعمار سے آزادی حاصل کر لی لیکن بدقسمتی سے روس تو شکست و ہزیمت کے بدنما داغ لئے اپنے بل میں گھسنے پر مجبور ہو گیا لیکن روس نواز جمعیت اسلامی احمد شاہ مسعود کی زیر کمان کرسی اقتدار کابل پر براجمان ہو گئی، کرسی اقتدار پر غاصبانہ و بہیمانہ قبضہ کرنے کے بعد

کابل کو اس طرح تباہ و برباد کر دیا گیا کہ روس نے بھی اس طرح نہیں کیا تھا، احمد شاہ مسعود کے دور میں کسی کی بھی جان و مال اور عزت محفوظ نہیں تھی، اس حکومت کا ہر کمانڈر ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے مصداق اپنی اپنی جگہ پر خود مختار تھا، جگہ جگہ پر پھاٹک لگائے ہوئے تھے جہاں پر لوگوں کی زبردستی جیبیں خالی کر کے ان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

کوئی پرسان حال نہ تھا، کسی غریب کو اپنے دفاع میں بولنے اور اعتراض تک کرنے کا حق نہ تھا بلکہ جو آدمی ہمت کر کے اپنے دفاع کی کوشش کرتا تھا اسے اپنے سمیت پورے خاندان کی تباہی کی صورت میں خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا غرض یہ کہ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو شمالی اتحاد کے علاقوں میں روا نہ رکھا گیا ہو یہ ساری صورت حال پہلے میں اپنے لوگوں کی زبانی سنا کرتا تھا اور ذہن میں یہ خیال آتا تھا کہ شاید ہمارے لوگ کچھ مبالغہ سے کام لے رہے ہیں، لیکن دوران اسارت یہی باتیں اور یہی صورت حال بلکہ اس سے بھی دو چند شمالی اتحاد کے اپنے لوگوں سے سننے کو ملی جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے چل کر آ رہی ہے۔ لیکن آج وہی کابل ہے کہ یہاں پر شریعت محمدی کا راج ہے، انصاف ہر امیر و غریب کے لیے یکساں ہے، ظلم و ستم اور ناانصافی کرنا تو دور کی بات ہے کوئی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

طالبان کے تمام علاقوں میں امن و امان اور خوشحالی اپنی مثال آپ ہے، عوام اطمینان اور امن و سکون کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔

میں انہی سوچوں میں غرق مسجد کے قریب پارک میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ساتھی نے آ کر مجھے ماضی سے حال کی طرف کھینچتے ہوئے کہا کہ امیر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں، جب میں امیر صاحب کی طرف جانے کے لیے اٹھا تو پہاڑوں کے پیچھے سے سورج اللہ رب العزت کے حکم کو پورا کرتے ہوئے نمودار ہو کر عالم کو بقعہ نور کر رہا تھا، پہاڑوں پر سے ابھرتا ہوا سورج بہت ہی دل کش نظارہ پیش کر رہا تھا، چلتے چلتے میں نے آنے والے ساتھی سے پوچھا کہ بھائی خیریت تو ہے جو امیر صاحب نے بلایا ہے......؟ تو اس ساتھی نے جواب دیا کہ امیر صاحب نے سب ساتھیوں کو حویلی میں جمع کرنے کی تاکید کی ہے شاید آج محاذ پر تشکیل ہو جائے، اسی اثناء میں ہم ''اوطاق'' یعنی حویلی میں پہنچ گئے، جہاں پر تقریباً سب ساتھی جمع تھے ہم بھی جا کر

ان ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ گپوں میں مصروف ہوگئے، ہماری گپوں کا زیادہ تر تبصرہ محاذ پر تشکیل کا تھا، ہر ساتھی محاذ پر تشکیل کے لیے بے چین نظر آرہا تھا اور اللہ رب العزت سے اپنی تشکیل کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا، اسی اثناء میں خدمت پر مامور مجاہد ساتھی نے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دی، ہم سب ساتھی اٹھ کر دوسرے کمرے میں ناشتہ کرنے کے لیے چلے گئے اسی دوران امیر صاحب اور کچھ دوسرے اساتذہ کرام بھی آگئے اور ہمارے ساتھ ناشتہ کرنے کے لیے بیٹھ گئے دوران ناشتہ امیر محترم نے ہمیں ناشتہ کے بعد اپنا اپنا اسلحہ صاف کرنے کی ہدایت کی، ناشتہ کے بعد تمام ساتھی اپنا اپنا اسلحہ صاف کرنے میں مصروف ہوگئے تو بعد ازیں امیر صاحب نے سب ساتھیوں کو جمع کر کے بیان فرمایا، بیان میں انہوں نے کہا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا بہت بڑی فضیلت رکھتا ہے اس راستہ میں مشکلات آتی ہیں مگر صحیح معنوں میں مجاہد وہ ہوتا ہے جو کسی بھی حالت میں حوصلہ، استقامت اور صبر کا دامن نہ چھوڑے، مزید انہوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ سب مجاہد ساتھی محاذ پر تشکیل کے لیے بے تاب ہیں، لیکن میری آپ سب مجاہدین کو یہ نصیحت اور گزارش ہے کہ ہر حال میں امیر کی اطاعت کو مقدم رکھیں اور جن حضرات کی تشکیل محاذ پر ہو جائے وہ بھی محاذ جنگ پر رہتے ہوئے اطاعت امیر سے ذرا بھر بھی روگردانی نہ کریں اور جن کی تشکیل محاذ پر نہ ہو ان کو بھی چاہیے کہ آزردہ نہ ہوں اور جن کاموں پر ان کی تشکیل کر دی جائے بطریق احسن ان کاموں کو سرانجام دینے کے لیے مستعد ہو جائیں کیونکہ اطاعت امیر میں خیر ہے پھر آخر میں امیر صاحب نے محاذ پر تشکیل کیئے گئے ساتھیوں کی فہرست پڑھنی شروع کی تو سب ساتھیوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں میں بھی اپنے تمام ساتھیوں کی طرح فہرست میں اپنا نام پڑھے جانے کا منتظر تھا آخر کار انتظار کی گھڑیاں اس وقت ختم ہوئیں جب تقریباً چھٹے یا ساتویں نمبر پر میرا نام آیا، نام سنتے ہی میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا، جب محاذ پر تشکیل کیئے جانے والے تمام ساتھیوں کے نام لئے جا چکے تو آخر میں امیر صاحب نے محاذ پر تشکیل والے ساتھیوں کو مستعد رہنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ آج کسی بھی وقت محاذ پر روانگی کا حکم آسکتا ہے اس لیے سب ساتھی حویلی میں ہی رہیں، امیر صاحب اپنی بات مکمل

کر کے باہر نکل گئے اب تمام ساتھی ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے میں مصروف تھے اور جن ساتھیوں کی تشکیل محاذ پر نہیں ہوئی، وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے، میں نے ان میں سے ایک ساتھی جس کا نام غالباً فیصل تھا، اس سے پوچھا کہ فیصل بھائی آپ لوگ جن کی تشکیل نہیں ہوئی مجھے کچھ افسردہ اور پریشان دکھائی دے رہے ہیں، فیصل نے کہا کہ پریشانی کی یہ وجہ نہیں ہے کہ ہماری تشکیل محاذ پر نہیں ہوئی بلکہ ہم سب لوگ تو امیر کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے میں ہی راحت محسوس کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کی جدائی پر کچھ غم زدہ ہیں کیونکہ کافی عرصہ سے ایک ساتھ رہے ہیں اور کئی معرکوں میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال چکے ہیں اور یہ وقتی پریشانی فطری چیز ہے، فیصل نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ان شاء اللہ ہم جلد ملاقات کی امید پر ایک دوسرے سے جدا ہوں گے، فیصل اس وقت بہت جذباتی نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی پلکوں پر نمی صاف محسوس ہو رہی تھی، جلد ہی اس نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا کہ وہ وقت دور نہیں جب پوری دنیا پر اسلام کا جھنڈا لہرائے گا اور باطل قوتیں ناکام و نامراد ہو کر اپنی بلوں میں گھسنے پر مجبور ہو جائیں گی اور ہمیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ رب العزت ہم سب مجاہدین ساتھیوں کو استقامت عطا فرمائے۔ (آمین)

اس وقت فیصل اپنے دبلے پتلے جسم کے باوجود عزم و ہمت کا پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ بعد ازیں میں نے فیصل سے اجازت لی اور زادراہ کو ترتیب دینے کے لیے اپنے سامان کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی گن، میگزین، پوچ اور دیگر اشیائے ضرورت سنبھالنے کے بعد دوسرے ساتھیوں کے ساتھ چشم براہ ہو کر بیٹھ گیا کہ کب روانگی کا حکم آتا ہے آخر کار بعد از بسیار انتظار تقریباً دس بجے کے قریب ہمارے انتظار کی گھڑیاں اس وقت ختم ہوئیں جب امیر صاحب چند اساتذہ کرام اور کچھ مہمانوں کے ساتھ حویلی میں داخل ہوئے، داخل ہوتے ہی امیر صاحب نے حکم دیا کہ تشکیل والے سب ساتھی حویلی کے صحن میں جمع ہو جائیں، ہم کم و بیش تیس ساتھی جن کی تشکیل ہو چکی تھی امیر صاحب کے پاس حویلی کے صحن میں جمع ہو گئے، اس کے بعد امیر صاحب نے مہمانوں کا ہمارے ساتھ تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ معزز حضرات آپ ساتھیوں کو ملنے کے

لیے تشریف لائے ہیں، مہمانوں کا تعارف سننے پر ہم سب ساتھیوں کا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا کیونکہ آنے والے مہمان پاکستان کے جید علماء کرام میں سے تھے، ہمیں اپنی قسمت پر فخر محسوس ہو رہا تھا کیونکہ ہم جیسے گنہگاروں کو ملنے کے لیے انبیاء کرام کے وارثوں یعنی علماء کرام کا چل کر آنا ہمارے لیے بہت بڑی فضیلت کی بات تھی، میں اپنے دل ہی دل میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ الٰہی یہ شریعت محمدی کے رہبر و رہنما ہم جیسے گنہگاروں سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں ہمیں دنیا اور آخرت میں سرخرو کرنا اور معرکہ حق و باطل میں ہمیں ثابت قدمی عطا فرمانا یا الٰہی بزدلی اور کم ہمتی سے ہم تیری پناہ چاہتے ہیں یا رب العالمین ہمیں آخرت میں اپنے اور اپنے نبی آخر الزماں ﷺ کے سامنے اور دنیا میں ان اکابر علماء کرام کے سامنے شرمندگی اور رسوائی سے بچانا۔ (آمین)

اسی اثناء میں تمام ساتھی امیر صاحب اور مہمان حضرات مین گیٹ کی طرف جانا شروع ہوگئے تو میں بھی ان حضرات کی اقتداء میں گیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ گیٹ سے باہر آ کر اساتذہ کرام نے ملک کے نامور اور مشہور عالم دین حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ وقت رخصتی مجاہدین کے لیے دعا فرمادیں، حضرت ڈاکٹر صاحب دامت برکاتہم نے پہلے مجاہدین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ اللہ رب العزت کے راستہ میں لڑنے کے لیے جارہے ہیں، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا آپ لوگوں پر خاص کرم ہے کہ اس نے آپ حضرات کو اپنے راستہ میں قبول فرمایا ورنہ آج کے اس نفسانفسی اور آپا دھاپی کے دور میں بہت سے لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد تک سے غافل پڑے ہوئے ہیں۔ آج کے اس پرفتن دور میں آپ حضرات نے آرام و آسائش اور گھر بار کو چھوڑ کر اللہ رب العزت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جہاد کے عظیم اور پرخطر راستے کو اختیار کیا ہے یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا آپ لوگوں پر بہت بڑا احسان ہے بعد ازاں مولانا صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہم سب ساتھی بھی ان کے ساتھ دعا میں شریک ہوگئے حضرت مولانا صاحب بہت ہی عجز و انکساری کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دعا مانگ رہے تھے اور ہم سب ساتھی آمین کہہ رہے تھے، دعا کے بعد مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب اور دیگر علماء کرام نے ہم سب

ساتھیوں کے ساتھ فرداً فرداً معانقہ کیا اور اپنی دعاؤں اور نصیحتوں سے مستفید کیا، بعدازیں ہم سب ساتھی دو چھوٹی روسی ساخت کی گاڑیوں میں سوار ہوگئے، سفر میں استاد کمانڈر حذیفہ صاحب (شہید بابری مسجد) کو ہمارا امیر مقرر کیا گیا تھا ہمارا دو گاڑیوں پر مشتمل قافلہ خراماں خراماں کابل کے ''قول اردو'' (چھاؤنی) کی طرف رواں تھا، میں گاڑی میں بیٹھا کابل کے حسین اور دلکش مناظر سے لطف اندوز ہورہا تھا کہ دفعتاً گاڑی کے ڈرائیور نے جو کہ فارسیبان تھا اور پہلے احمد شاہ مسعود کی خودساختہ حکومت کا ملازم رہ چکا تھا اور پاکستان میں بھی کچھ عرصہ گزار چکا تھا جس کی وجہ سے اردو زبان سے بھی کچھ واقفیت رکھتا تھا،ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے پوچھا آپ لوگ کتنی تعداد میں پاکستان سے طالبان کے ساتھ مل کر لڑنے کے لیے آئے ہیں؟ میں نے ابھی جواب کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کمانڈر حذیفہ (شہید رحمہ اللہ) نے جو کہ میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے ٹوکتے ہوئے کہا اس طرح کے لوگوں سے زیادہ بات چیت مناسب نہیں ابھی تک ان لوگوں کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ یہ لوگ کل تک احمد شاہ مسعود کی حکومت کے ملازم تھے اور ان کے جاسوس ہونے کا خدشہ بھی بعید نہیں ہے۔ یہ باتیں استاد کمانڈر حذیفہ نے آہستہ سے کہیں تھیں تاکہ ڈرائیور نہ سن سکے بہرحال میں ڈرائیور سے اپنی توجہ ہٹا کر گاڑی سے باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگا جہاں پر طالبان سیاہ وسفید پگڑیاں باندھے اسلحہ سے لیس، سفید جھنڈوں والی گاڑیوں میں بیٹھے ادھر ادھر آجارہے تھے، میں چودہ سو سال پہلے اس وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جب جاں نثاران محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم دین مبین کی سربلندی کے لیے گھوڑوں پر بیٹھے اسلحہ زیب تن کئے کبھی بدر کے میدان میں علم جہاد بلند کئے داد شجاعت دے رہے ہوتے ہیں اور کبھی احد کے میدان میں نبی الملاحم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی عزیز جانوں کو نچھاور کررہے ہوتے ہیں تو کبھی خیبر میں، خیبر خیبر یا یھود، جیش محمد سوف یعود کے ترانے پڑھتے ہوئے یہودی ملعونوں سے دو دو ہاتھ کررہے ہوتے ہیں آج اللہ رب العزت کا یہ لشکر طالبان کی صورت میں نبی الملاحم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین اطہر ومطہر کی سربلندی اور نفاذ شریعت محمدی کے لیے اپنی قیمتی جانوں کے نذرانے پیش کررہے ہیں۔ جب گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو

مجھے اپنی سوچوں سے واپس آنا پڑا، گاڑی ایک بہت بڑی عمارت کے گیٹ کے سامنے رکی تھی دوسرے ساتھیوں والی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آ کر رک چکی تھی، امیر صاحب سب ساتھیوں کو فی الحال گاڑی میں بیٹھے رہنے کا کہہ کر نیچے اتر گئے اور گیٹ پر معمور محافظ طالبان کے پاس گئے اور گاڑیوں کے عمارت میں داخلے کی اجازت لے کر واپس گاڑی میں آ گئے، مجھے اور دوسرے ساتھیوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے، میں اس بارے میں بہت متجسس تھا آخر کار جب گاڑیاں گیٹ کے اندر داخل ہو کر دور سے نظر آنے والی عمارت کی طرف آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگیں تو میں نے کمانڈر صاحب سے پوچھا کہ کمانڈر صاحب یہ کون سی جگہ ہے اس پر کمانڈر صاحب نے جواب دیا کہ یہ ''قول اردو'' (چھاؤنی) ہے اور یہیں سے ہماری تشکیل آگے محاذ پر ہوگی، گاڑیاں عمارت کے قریب رک گئیں، کمانڈر صاحب نیچے اترے اور دونوں گاڑیوں کے سب ساتھیوں کو گاڑیوں سے نیچے اترنے کا حکم دیا جب ہم سب نیچے اتر آئے تو کمانڈر صاحب نے سب ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے عسکری نوعیت کی چند نصیحتیں کیں اور ہمیں سامنے نظر آنے والے گراسی پلاٹ میں درختوں کے نیچے بیٹھنے کا کہہ کر سامنے والی عمارت کی طرف محاذ پر روانگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو گئے، میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گراسی پلاٹ میں جا کر بیٹھ گیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے ہمارے سامنے کچھ ہی فاصلہ پر ایک بہت بڑا سوئمنگ پول تھا، بائیں جانب پختہ میدان سے گزر کر مین گیٹ تھا، دائیں جانب بہت ہی خوبصورت اور بہت بڑی پختہ عمارت تھی جہاں پر عسکری عہدیداروں کے دفاتر وغیرہ تھے، اس عمارت سے گزر کر پچھلی جانب پھر ایک وسیع میدان تھا جہاں پر بہت سارے کمرے تھے جو غالباً فوجی بیرکیں تھیں۔ یہیں پر ایک بہت بڑا ہال تھا جہاں پر بہت بڑے بڑے ڈائننگ ٹیبل اور ٹیبلوں کے اردگرد بے شمار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں یہ چیزیں سابقہ حکومت کی باقیات تھیں، کیونکہ طالبان چھوٹے سے لے کر بڑے تک زمین پر دسترخوان لگائے سنت کے مطابق کھانا کھاتے تھے اس ہال کے باہر دائیں جانب مٹی سے بنی ہوئی کچی دیوار تھی جس کی اونچائی تقریباً چار فٹ کے قریب تھی اس کچی دیوار کے باہر سبزیوں وغیرہ کے کھیت تھے یہ سب معلومات مجھے اس وقت حاصل ہوئیں

جب میں عمارت کو دیکھنے کے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر تقاضے کے بہانہ سے ساتھیوں کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تھا بہرحال کچھ دیر بعد میں واپس ساتھیوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا، استاد کمانڈر حذیفہ صاحب بھی آ چکے تھے جن کی زبانی معلوم ہوا کہ تا حکم ثانی ہمیں انتظار کرنے کا کہا گیا ہے، ہمارے چاروں طرف خوب گہما گہمی تھی مسلح طالبان کے دستے آ جا رہے تھے، طالبان مجاہدین سیاہ اور سفید پگڑیاں باندھے کھلے کھلے اور کھلی آستینوں والے کپڑے پہنے بہت ہی خوش نما اور باوقار نظر آ رہے تھے ہر مجاہد اپنی اپنی جگہ پر باہمت اور باحوصلہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہماری طرح اور بھی بہت سارے گروپ اپنے اپنے کمانڈروں کے ساتھ ہمارے اردگرد روانگی کے منتظر بیٹھے نظر آ رہے تھے، جو آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے اور کہیں پر کسی گروپ کی طرف سے پشتو میں جہادی ترانے پڑھے جانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں تو کہیں پر افغانی طالبان اخلاق کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کر کے وقت گزاری کر رہے تھے حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ تازہ تازہ فتح کابل کی جنگ کی ہولناکیوں سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اور ان کے بہت سے ساتھی جو کل تک ان کے ساتھ تھے اور ہر جنگ میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ دادِ شجاعت دے چکے تھے اور فتح کابل کے دوران اپنی جانوں کے نذرانے خون میں نہا کر اپنے مالک حقیقی کے حضور پیش کر چکے تھے اور سب سے بڑھ کر طالبان کے ہر دل عزیز اور شیر دل چیف کمانڈر ملا بورجان بھی ہمت و عزیمت کی نئی داستانیں رقم کرتے ہوئے فتح کابل کے دوران شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہو کر سفر جنت پر روانہ ہو چکے تھے جہاں پر حوریں بہت ہی بے چینی سے ان کی منتظر تھیں لیکن قربان جاؤں ان خاک نشینوں پر کہ جو قرونِ اولیٰ کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ایک بار پھر گلشن اسلام کی آبیاری اپنے تازہ اور جوان خون سے کر رہے تھے اور موت سے خوف کی بجائے شہادت کی تلاش میں ہر جنگ میں پیش پیش نظر آ رہے تھے گویا زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہوں، "این الموت این الموت" کہ موت کہاں ہیں ہم تو اسی کے متلاشی ہیں ہم تو چاہتے ہیں کہ اللہ رب العزت کے دین کی سربلندی کی خاطر موت کو گلے لگا لیں اور دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کر لیں یہی وجہ تھی کہ طالبان کا ہر مجاہد شاداں و فرحاں نظر آ رہا تھا

اور جنگ کے سائے میں بیٹھ کر بھی کسی کو کسی قسم کی پریشانی اور غم نہیں تھا، یہ ساری صورت حال دیکھ میرے ساتھیوں نے بھی کمانڈر حذیفہ صاحب سے مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی نظمیں پڑھنی چاہئیں، اس پر کمانڈر صاحب نے اجازت دے دی اب مسئلہ یہ تھا کہ نظم پڑھے گا کون، میں خود تو دبک کر ساتھیوں کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا کہ کہیں کمانڈر صاحب مجھے نظم پڑھنے کے لیے نہ کہہ دیں کیونکہ مجھے تو نظم پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا، بہر حال ایک ساتھی غالباً عبید اللہ شاہین کو نظم پڑھنے کے لیے کہا گیا، بھائی عبید اللہ شاہین کو بھی میری طرح نظم طرز کے ساتھ پڑھنی نہیں آتی تھی لیکن کمانڈر صاحب کے حکم پر بھائی شاہین نے ایک جہادی نظم کے کچھ اشعار پڑھ دیے، ان کے بعد شاید ایک دو لڑکوں نے اور بھی نظمیں سنائیں جس سے سب ساتھی بہت ہی محظوظ ہوئے، آخر میں میرے سمیت، سب ساتھیوں نے کمانڈر صاحب سے فرمائش کی کہ اب آپ کوئی نظم سنائیں، کمانڈر ابو حذیفہ صاحب نے بہت ٹالنے کی کوشش کی لیکن ساتھی برابر اصرار کرتے رہے آخر کار کمانڈر صاحب کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور انہوں نے نظم پڑھنی شروع کر دی جو تقریباً یہ تھی ؎

شہداء نے پکارا ہے تم کو فردوس کے بالا خانوں سے
ہم راہِ وفا میں کٹ آئے تمہیں پیارا ابھی تک جانوں سے

یہ نظم سننے کے بعد ہم سب ساتھیوں نے کمانڈر صاحب کو جزاك اللّٰہ کہا اور ان کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد ہم سب ساتھی پھر خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے، باتوں ہی باتوں میں کمانڈر صاحب ہر حالت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر کی اہمیت پر زور دے رہے تھے اور جنگ کے دوران پڑھی جانے والی قرآنی آیات کے بارے میں ہم سب ساتھیوں کو بتا رہے تھے اور جنگ میں پیش آنے والے مختلف حالات اور ان سے نمٹنے کے بارے میں بھی مختلف نصیحتوں سے ہمیں نواز رہے تھے۔ ابھی ہم لوگ انہیں باتوں میں مصروف تھے کہ ایک طالب مجاہد نے آ کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بڑے ہی ادب اور اپنے لہجے میں شیرنی گھولتے ہوئے پشتو زبان میں کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ طالبان بھائیو! کھانا تیار ہے آپ سب لوگ کھانے والے کمرے میں چلے جائیں۔ ہم سب لوگ اٹھ کر کمانڈر صاحب کی معیت

میں کھانے والے کمرے میں جو کبھی مسعودی فوج کا میس تھا کی طرف چل پڑے جب کھانے والے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ پورا ہال طالبان مجاہدین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جہاں پر اکثر طالبان اپنی اپنی کلاشنکوفیں، ایل۔ایم۔جی (L.M.G) گنیں اور اسی طرح کا دوسرا اسلحہ اپنے سامنے کھانے کی میز (جو کہ مسعودیوں کی باقیات میں سے تھیں وگرنہ طالبان مجاہدین زمین پر دسترخوان لگا کر کھانا کھانے کو ترجیح دیتے تھے) پر رکھے کھانا کھانے میں مصروف تھے اور کوئی جگہ بھی خالی نہ تھی کیونکہ فتح کابل کے بعد صوبہ پروان اور صوبہ کاپیسا پر حملے کا پروگرام تھا جس کی وجہ سے تمام طالبان مجاہدین اپنی اپنی تھکاوٹ اور ماندگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جوق در جوق ''قول اردو'' میں جمع ہو رہے تھے، بعض ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آئے جس سے میرا اور دوسرے ساتھیوں کا جذبہ جہاد مزید دو چند ہو گیا کہ فتح کابل میں زخمی ہونے والے طالبان بھی آئندہ حملہ میں شریک ہونے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہے تھے اور حق و باطل کے معرکہ میں شریک ہونے کے لیے بہت ہی بے تاب نظر آ رہے تھے۔ بہر حال ہم ہال کو طالبان مجاہدین سے کھچا کھچ بھرا دیکھ کر باہر نکل آئے تو باہر کھانا کھلانے پر مامور ذمہ دار نے ہمیں کہا کہ آپ تھوڑی دیر انتظار فرمائیں۔ دوسری شفٹ میں کھانا کھانے کے لیے تشریف لے آیئے گا۔ ہم سب ساتھی سامنے کی طرف بہنے والے نالے کی طرف چل پڑے جہاں پر شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ کچھ ساتھی ٹوٹی ہوئی بیرونی دیوار کے اس طرف کھیتوں میں نکل گئے، میں بھی دیوار کے اس پار جانے والے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل آیا یہاں پر کھیتوں میں مختلف قسم کی سبزیاں اگی ہوئی تھیں سبزیوں کے ہرے بھرے کھیت اردگرد لگے ہوئے سرسبز اور بلند و بالا درخت اور درختوں پر چہچہاتے پرندے بہت ہی حسین منظر پیش کر رہے تھے ہم جب اندر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آئے تو وہ سب ظہر کی نماز کے لیے وضو کر کے بیٹھے ہوئے تھے ہم سب نے بھی جلدی جلدی وضو کیا اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کھانے والے کمرے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں پر کافی جگہ خالی ہو جانے کے باوجود بھی کافی مجاہدین جو بعد میں آئے تھے بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف تھے ہم سب ساتھی بھی خالی جگہوں پر براجمان ہو گئے تو خدمت پر مامور لڑکوں نے چاولوں سے بھری ہوئی بڑی بڑی ڈشیں جس کو مقامی زبان میں

"دلگن" کہتے ہیں ہمارے سامنے لاکر رکھ دیں اور چاولوں کے ساتھ بڑی بڑی لمبائی میں بنی ہوئی روٹیاں بھی تھیں۔ ہم سب کھانے میں مصروف ہو گئے بعض ساتھی جو نئے تھے اور انہیں افغانی طالبان کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھانے کا پہلی بار اتفاق ہوا تھا۔ وہ چاول کھا کر روٹی بجائے بیٹھے تھے اور سالن کا انتظار کر رہے تھے، حالانکہ افغانستان میں اکثر جگہوں پر دوپہر کے وقت چاول کھائے جاتے ہیں اور اگر دوپہر کو روٹی کھائی جائے تو اکثر سالن کی بجائے پلاؤ کے ساتھ ہی کھائی جاتی ہے۔ جب ہم پرانے ساتھیوں کو معلوم ہوا تو ہمیں بہت ہنسی آئی اور جب ہم نے ان کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی ہنسے اور کہنے لگے کہ ہم تو ابھی تک روٹی کھانے کے لیے سالن کا انتظار کر رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب ساتھی واپس اپنی پرانی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے اور وہیں پر ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ نماز ادا کرنے کے بعد کمانڈر حذیفہ صاحب ایک بار پھر روانگی کے بارے میں معلومات کرنے کے لیے اسی عمارت کی طرف چلے گئے، ہم سب ساتھی روانگی کے لیے بہت ہی بے تاب بیٹھے ہوئے تھے اور انتظار کا ایک ایک لمحہ بہت بھاری معلوم ہو رہا تھا سب ساتھی دعائیں کر رہے تھے کہ اللہ کرے کمانڈر صاحب روانگی کی اجازت لے کر جلد از جلد واپس آ جائیں لیکن کمانڈر صاحب روانگی کی اجازت کی بجائے مزید انتظار کا حکم لے کر واپس آئے تو ہم سب ساتھی انتظار کی زحمت کو لیے ہوئے ہے ستانے کے لیے لیٹ گئے اور عصر تک وہیں لیٹے رہے۔ عصر کی اذان سننے پر ہم سب ساتھی وضو کے لیے چل پڑے۔ ضروریات اور وضو سے فارغ ہو کر ہم سب ساتھیوں نے بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز ادا کی، نماز کے بعد کمانڈر حذیفہ صاحب نے بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ دعا کروائی، دعا کرنے کے بعد ابھی ہم ادھر ادھر کی گپیں لگا رہے تھے کہ بھائی شاہد (شہید) اپنی تنظیمی گاڑی لے کر پہنچ گئے۔ اسی اثناء میں کمانڈر صاحب پھر معلومات حاصل کرنے کے لیے عمارت کی طرف چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر انہوں نے روانگی کی خوشخبری سنائی اور ہمیں قریب ہی پختہ سڑک جہاں پر بہت سی ہائی ایسی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، ان کی طرف چلنے کے لیے کہا جب ہم سب ساتھی گاڑیوں کے قریب پہنچ گئے تو طالبان کے ایک کمانڈر نے ہمیں ایک گاڑی

کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اس گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ہم تقریباً 17 یا اٹھارہ ساتھی اپنا اپنا اسلحہ سنبھالتے ہوئے اس گاڑی میں بیٹھ گئے اور باقی بچنے والے ساتھی فور بائی فور ڈالے میں جو شاہد بھائی لائے تھے میں بیٹھ گئے لیکن انتظار کی گھڑیاں ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھیں کیونکہ ہماری ہائی ایس گاڑی کا ڈرائیور لاپتہ تھا جبکہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے طالبان کی بہت سی گاڑیاں روانہ ہوچکی تھیں۔شاہد بھائی ابھی تک ہماری گاڑی کے انتظار میں کھڑے تھے کہ کب یہ روانہ ہو اور میں بھی ان کے ساتھ ہی حرکت کروں، ہمارے صبر کے پیمانے لبریز ہورہے تھے، میں گاڑی میں باہر کھلنے والے شیشے کے ساتھ والی سیٹ پر اپنی کلاشنکوف کو دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھے بیٹھا بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا اور گاڑی کے ڈرائیور کو کوسنے دے رہا تھا۔آخر کار کافی انتظار کے بعد ڈرائیور صاحب گاڑی کے قریب آ نازل ہوئے۔میرا دل کرر ہا تھا کہ کوئی چیز اٹھا کر ڈرائیور کے سر پر دے ماروں جس نے ہمیں اتنی دیر تک انتظار کی مشکل ترین زحمت میں مبتلا کئے رکھا۔لیکن پھر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکرادا کیا کہ دیر سے سہی آتو گیا ہے وگرنہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ مزید بہت دیر ہوجائے گی ''اور پھر طالبان کا کوئی کمانڈر یا بڑا ذمہ دار آئے گا اور کہے گا کہ آپ حضرات آج رات یہیں سامنے والی عمارت میں قیام کریں پھر صبح آپ حضرات کو روانہ کر دیا جائے گا، یہ سوچ کر ہی مجھے تکلیف ہورہی تھی، لیکن جب ڈرائیور آ گیا تو غصہ کے باوجود بھی سکھ کا سانس لیا کہ جو میں سوچ رہا تھا وہ نہیں ہوا۔ بہر حال ڈرائیور نے اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو اسٹارٹ کیا، اسی اثناء میں بھائی شاہد (شہید) نے جب دیکھا کہ ہماری گاڑی کا ڈرائیور اپنی سیٹ سنبھال چکا ہے تو وہ اپنی گاڑی لے کر چل پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ہمارے ڈرائیور نے بھی گاڑی اس کے پیچھے ڈال دی لیکن شاہد (شہید) بھائی کی گاڑی بہت دور نکل چکی تھی۔

گمنام راستوں پر سفر

ہماری گاڑی شہر کابل کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی جارہی تھی، ہمارے عقب میں مسلح طالبان مجاہدین کی کچھ اور ہائی ایس گاڑیاں اور ڈالے سپیڈ سے چلے آرہے تھے، میں گاڑی کا شیشہ کھولے کابل شہر کے دلکش اور حسین مناظر سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی گاڑی

شہر کے آبادی والے حصے کو خیر باد کہتی ہوئی چاریکار روڈ پر دوڑ رہی تھی۔

میں بہت ہی محبت بھری نگاہوں سے کابل کو اپنی نظروں سے دور ہوتا دیکھ رہا تھا کہ جس پر اسلامی پرچم لہرانے کے لیے بہت سی قیمتی جانوں کے نذرانے پیش کرنے پڑے۔ کابل میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے طالبان کے چیف کمانڈر ملا بور جان شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قیمتی جان کا نذرانہ بڑی ہنسی خوشی پیش کیا۔ اس کے علاوہ روسی دور میں ایک عرصہ تک روس کے ساتھ برسر پیکار رہنے والے مجاہد عظیم استاد المجاہدین سیّدی و استاذی قاری غلام رسول صاحب جو کہ ایک محبت کرنے والے اور شفیق انسان تھے اور اکثر پاکستانی مجاہدین کرام ان کے شاگردوں میں سے ہیں نے کابل میں اسلامی پرچم لہرانے اور نفاذِ شریعت کی جدوجہد کے لیے باطل قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہوئے کاری اور خطرناک زخم کھا کر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی اور خاص طور پر پاکستانی مجاہدین اور بالعموم پوری دنیا کے مجاہدین کے لیے ایک زندہ اور انمٹ مثال چھوڑ گئے اور اپنے معطر خون سے آنے والی نسلوں کے لیے شجاعت اور بہادری کی نئی داستان رقم کر گئے اور اس کے علاوہ وہ سلمان شہید جو سات سمندر پار سے عیش و عشرت کی زندگی کو خیر باد کہہ کر اور وہاں کی ایمان باختہ رنگینیوں سے منہ موڑ کر جذبۂ حب الاسلامی اپنے دل میں لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کے دین کی نصرت کرنے والے خاک نشین طالبان کے ساتھ آملا اور سنگلاخ چٹانوں کو اپنا نشیمن بنالیا اور شہادت کی تلاش میں ہر معرکہ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے اپنے نشان پا ہماری راہنمائی کے لیے چھوڑ گیا اور آخر کار فتح کابل کے لیے جنگ سروبی میں اپنی دیرینہ آرزو تک پہنچتے ہوئے جام شہادت نوش کر گیا۔

اِس وقت ہماری گاڑی کوتل خیر خانہ کے قریب پہنچ چکی تھی، پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی ہمارے قریب پہنچ چکی تھیں جبکہ آگے جانے والی گاڑیاں نظروں سے غائب ہو چکی تھیں۔ اب چند گاڑیوں پر مشتمل ایک کاروان بن چکا تھا جو اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ سورج مغرب کے غبار سے کائنات ارضی پر اپنی الوداعی نظریں ڈال رہا تھا اور شام کے سائے تیزی سے مشرق کی جانب بھاگ رہے تھے۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور بھیڑ بکریاں چرانے والے چرواہے (کوچی) دن بھر کی محنت اور مشقت کے بعد اپنے گھروں کو

واپس جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ طالبان کے ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور اینٹی ایر کرافٹ کی گاڑیاں بھی چاریکار کی طرف رواں دواں نظر آ رہی تھیں۔

دریں اثناء جب سورج اپنا سفر مکمل کر کے غروب ہوگیا تو ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے بائیں جانب پتھریلی زمین پر کھڑی کردی جہاں بھائی شاہد (شہید) اور دوسرے ساتھی اپنی گاڑی سے اتر کر نماز کی تیاری کرر ہے تھے ہم لوگ بھی ان کے ساتھ جا کر نماز میں شامل ہوگئے۔ نماز کے بعد پھر تمام گاڑیاں اپنے مسافروں کو لیے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئیں۔ اب چونکہ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوگیا تھا اس لیے تمام گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن ہوگئیں اور ساتھ ساتھ بیک سرخ لائٹیں بھی جل بجھ رہی تھیں جو اس بات کی علامت تھیں کہ پیچھے والی گاڑیاں اسی سمت چلتی رہیں اور کسی دوسری طرف نہ مڑیں۔ تمام گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔

ہم سب ساتھی اِس سفر سے بہت ہی لطف اندوز ہورہے تھے اور بہت خوش اور مطمئن تھے کہ جلد میدان کارزار میں پہنچنے والے ہیں، کچھ ساتھی اونگھ رہے تھے اور کچھ ساتھی باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ اچانک گاڑی کی بریک نے سب ساتھیوں کو بیدار کردیا۔ یہ ایک دوراہی تھی جہاں پر ایک بڑی سڑک سیدھی جارہی تھی اور ایک بڑی سڑک دائیں طرف جارہی تھی اب ہر طرف اندھیرے کا راج تھا، گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے آگے والی دو تین گاڑیاں جن میں بھائی شاہد (شہید) والی گاڑی بھی شامل تھی کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ ہماری گاڑی کا ڈرائیور گاڑی سے نیچے اتر چکا تھا۔ کمانڈر حذیفہ صاحب اور بھائی شاہد شہید بھی گاڑی سے نیچے اتر کر ہماری گاڑی کے قریب ہی کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ میں گاڑی میں بیٹھا شیشے سے سر باہر نکالے ان کے درمیان ہونے والی باتیں بڑے غور سے سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک ان کے درمیان ہونے والی باتیں سن کر گویا چند لمحوں کے لیے حیرت اور پریشانی کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑے کیونکہ کمانڈر حذیفہ (شہید رحمہ اللہ) بھائی شاہد شہید رحمہ اللہ اور کچھ دوسرے افغانی طالبان جو وہاں پر کھڑے تھے اور ہمارے چھوٹے سے قافلہ میں شامل تھے آپس میں راستہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے جس کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اور

جن کو راستے کے بارے میں معلومات تھیں وہ پہلے ہی ہم سے بہت دور نکل چکے تھے ہمارے ساتھی اس کشمکش میں تھے کہ دائیں طرف والی سڑک کو اختیار کیا جائے یا سیدھا چلا جائے اور وہ اس خدشہ کا بھی اظہار کر رہے تھے کہ یہ علاقہ دشمن نے بغیر کسی مزاحمت کے خالی کر کے پنجشیر میں ڈیرے ڈال دیے ہیں اور کہیں یہ دشمن کی کوئی چال نہ ہو یا راستہ کے بارے میں معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تمام ساتھی نادانستہ طور پر دشمن کے علاقہ میں پہنچ کر پھنس نہ جائیں، یہ سب باتیں سن کر وقتی طور پر میں اس لیے پریشان ہوا تھا کہ آمنے سامنے دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہونا تو کچھ مشکل نہیں لیکن نادانستگی میں بغیر لڑے دشمن کے بچھائے ہوئے جال میں آ جانا بہت ہی تکلیف دہ معلوم ہو رہا تھا، مجھے اور دیگر ساتھیوں کو اپنی جانوں کی تو کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ:

نہ از کشتن نہ از بستن نہ دارم ہیچ پروائی
من روزے کے اینجا پا نہادم ترک سر کردم

(نہ قتل ہونے سے نہ گرفتار ہونے سے مجھے کچھ بھی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ جس دن سے میں نے اس میدان میں پاؤں رکھا ہے اسی دن سے اپنے سر کو جسم سے جدا سمجھ لیا) لیکن اگر کچھ قلق تھا تو اس بات کا کہ اس طرح کے ہتھکنڈوں اور کارروائیوں سے تحریک طالبان کہ جس کا مورال ابھی تک بہت ہی بلند تھا کہیں گر نہ جائے وگرنہ تو ہم تمام ساتھیوں کا مقصد حیات اور مطلوب ہی شہادت تھا،

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

تمام ساتھی بھی راستے کے بارے میں معلومات نہ ہونے پر کچھ متفکر سے دکھائی دے رہے تھے۔

رات کی تاریکی کافی بڑھ چکی تھی، آسمان پر تارے چمک رہے تھے اور ہر طرف ہو کا عالم تھا کبھی کبھی گیدڑوں اور کتوں کی آوازیں ماحول پر چھائے ہوئے سکوت کو توڑ دیتیں۔ ہماری گاڑی کے اندر کا ماحول بھی باہر چھائے ہوئے ماحول سے کم نہ تھا کیونکہ ہر ساتھی گاڑی کے اندر دم بخود بیٹھا ہوا تھا اگرچہ باہر کے موسم کو شمال کی جانب سے آنے والی ٹھنڈی اور لطیف

ہوائیں کافی خوشگوار بنائے ہوئے تھیں لیکن اندر کا موسم ہنوز راستہ کے بارے میں شش و پنج میں مبتلا ہونے کی وجہ سے نقاہت آلود تھا۔

دائیں طرف والی اور سیدھی جانے والی سڑکیں بھی ویران پڑی ہوئی تھیں ان سڑکوں پر کوئی گاڑی تو درکنار دور دور تک کسی ذی روح کا بھی نام ونشان معلوم نہیں ہورہا تھا، گاڑیوں سے باہر کھڑے کمانڈر حضرات ابھی تک اسی انتظار میں تھے کہ شاید طالبان کی کوئی اور گاڑی کابل کی طرف سے آتی ہوئی دکھائی دے جس سے معلوم ہوسکے کہ 'چاریکار' کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے یہ ساری پریشانی یہاں کے نقشہ کے نہ ہونے کی وجہ سے پیش آرہی تھی اور کابل سے چلتے وقت نقشہ اس وجہ سے حاصل نہیں کیا گیا تھا کہ راستہ کے بارے میں معلومات رکھنے والے گاڑیوں کے اس کارواں میں موجود تھے لیکن بدقسمتی سے جنہیں راستہ کے بارے میں معلومات تھیں وہ ہمارے دوراہے پر پہنچنے سے پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہوچکے تھے۔ آخر کار سڑک کے کنارے کھڑے ذمہ داروں میں فیصلہ یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے دائیں طرف والی سڑک پر چلنا چاہیے چنانچہ تمام گاڑیاں تعین شدہ راستے پر چل پڑیں ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے بھی دوسری گاڑیوں کی تقلید میں دائیں طرف جانے والی سڑک پر گاڑی ڈال دی، اب ساری گاڑیاں انتہائی احتیاط کے ساتھ آپس میں مناسب فاصلہ رکھے درمیانی رفتار کے ساتھ دوڑی چلی جارہی تھیں اور تمام ساتھی انتہائی محتاط انداز سے اپنا اپنا اسلحہ ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے گاڑی کے اندر تیار بیٹھے محو سفر تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک دفعہ پھر تمام گاڑیاں سب سے آگے والی گاڑی کی تقلید میں ایک دوسرے کے پیچھے رک گئیں، یہ ایک بازار نما جگہ معلوم ہورہی تھی کیونکہ سڑک کی دونوں جانب ترتیب وار لکڑی کے دروازوں والی دکانیں اور کہیں کہیں دکانوں کے سامنے ٹھیلے نما چھپٹے پڑے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن یہ سب دکانیں اور ٹھیلے بند پڑے ہوئے تھے اور ایسے لگتا تھا کہ عرصہ دراز سے یہاں پر کسی انسان کا گزر نہیں ہوا وگرنہ آثار سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ امن کے دنوں میں یہ جگہ کافی بارونق رہی ہوگی بہرحال رکنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں پر بھی بائیں طرف ایک چھوٹی سی سڑک جارہی تھی۔ سب سے آگے والی گاڑی سے افغانی طالبان کا ایک

کمانڈر اور اس کے کچھ ساتھی گاڑی سے اتر کر بائیں طرف جانے والی چھوٹی ذیلی سڑک اور اردگرد کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے، تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد سب ٹھیک ہے کا سگنل اور سامنے سیدھا چلنے کا اشارہ دیتے ہوئے کمانڈر صاحب اور ان کے ساتھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو دوسری گاڑیاں بھی ان کے پیچھے محو سفر ہوگئیں۔ ابھی گاڑیوں نے بازار والی جگہ سے چند کلومیٹر کا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ آگے سڑک کے کنارے بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوا نظر آیا جب ہماری گاڑی سائن بورڈ کے قریب ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہم چاریکار کی بجائے بگرام کی طرف آ نکلے ہیں کیونکہ سائن بورڈ پر جلی حروف میں فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا ''میدان ہوائی بگرام'' اب سب ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہم غلط راستہ پر آ نکلے ہیں لیکن کوئی بھی گاڑی یہاں پر نہیں رکی شاید سب اسی فکر میں ہوں گے کہ شب بسری کے لیے کوئی مناسب ٹھکانہ تلاش کیا جائے اور کہیں سے کھانے پینے کا سامان کیا جائے اب تمام گاڑیوں کی رفتار نسبتاً کم تھی کیونکہ سڑک کے دونوں طرف عمارتوں کے کچھ آثار نمودار ہو رہے تھے چلتے چلتے آگے والی گاڑیاں سڑک کی دائیں جانب مڑ کر ایک بلند عمارت کے پاس جا کر رک گئیں ہماری گاڑی بھی دوسری گاڑیوں کے قریب جا کر رک گئی سب سے آگے والی گاڑی سے ایک افغانی طالبان کمانڈر اور ان کے ساتھی نیچے اترے اور محتاط انداز میں عمارت کی طرف بڑھنے لگے اسی اثناء میں کمانڈر حذیفہ رحمہ اللہ اور بھائی شاہد شہید رحمہ اللہ بھی اپنی اپنی گاڑی سے نیچے اتر کر عمارت کے قریب کھڑے افغانی طالبان اور ان کے کمانڈر کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے، عمارت کی بالائی منزل کی کھڑکیوں کے سوراخوں سے چھن چھن کر آنے والی ہلکی ہلکی روشنی اس بات کی غماز تھی کہ اس عمارت میں انسانوں کا وجود موجود ہے لیکن یہاں پر پہنچنے والے سب طالبان اور کمانڈر حذیفہ شہید رحمہ اللہ اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ آیا اس عمارت کے باسی طالبان کے ساتھی ہیں یا دشمن کے لوگ، ابھی بڑے حضرات عمارت سے کچھ دور اسی پریشانی میں کھڑے آپس میں مشورہ کرنے ہی والے تھے کہ عمارت کی بالائی منزل کی کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک آدمی نے جھانکتے ہوئے نیچے کھڑے ہوئے ساتھیوں سے پوچھا کہ آپ حضرات کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ طالبان کے کمانڈر نے نیچے سے جواب

دیتے ہوئے کہا کہ آپ نیچے آ کر ہماری بات سنیں، تھوڑی دیر بعد دو تین آدمی نیچے آئے تو طالبان کمانڈر کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ اس علاقہ سے مسعودی فوجیں پسپا ہو کر درہ پنجشیر میں محصور ہو چکی ہیں اور اب یہ سارا علاقہ طالبان کے قبضہ میں ہے اور اردگرد کے تمام پہاڑوں پر طالبان مورچہ زن ہیں اور بگرام ایئربیس اور اردگرد کے اکثر ملازم طالبان کے ساتھ مل چکے ہیں، اور ہم لوگ بھی انہی میں سے ہیں ان لوگوں کے درمیان ہونے والی باتیں جب ہمارے ساتھیوں کے پاس پہنچیں تو طالبان کی فتح کی خبر سن کر سب ساتھی انتہائی خوش اور اپنی جگہ مطمئن تھے، تھوڑی بہت گفتگو کے بعد کمانڈر صاحب نے ان افراد سے پوچھا کہ یہاں کہیں کھانے وغیرہ کا کوئی انتظام ہے، اس پر انہوں نے ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے راستہ سمجھا دیا اور بتایا کہ اسی عمارت میں کھانے کا باقاعدہ انتظام ہے تمام گاڑیاں ایک مرتبہ پھر پہلی والی سمت کی طرف محوسفر ہو گئیں چند کلومیٹر چلنے کے بعد سب سے آگے والی گاڑی سڑک کی بائیں جانب مڑ گئی، پیچھے آنے والی گاڑیاں بشمول ہماری گاڑی بھی آگے والی گاڑیوں کی تقلید میں مڑ گئیں، یہ ایک چھوٹی سی کچی سڑک تھی جس کا اختتام چند کلومیٹر چل کر ایک بہت بڑی عمارت پہ ہو رہا تھا تمام گاڑیاں عمارت کے بڑے گیٹ کے پاس جا کر رک گئیں۔ ہر طرف گھرا اندھیرا چھایا ہوا تھا، اردگرد کا سارا ماحول سکوت زدہ اور انتہائی بوجھل بوجھل سا محسوس ہو رہا تھا، اندھیرے میں یہ عمارت انسانوں کی آماجگاہ کی بجائے کوئی بھوت بنگلہ معلوم ہو رہی تھی چونکہ اتنی بڑی عمارت کے آس پاس نہ کوئی انسان نظر آ رہا تھا اور نہ عمارت کے اندر روشنی نام کی کوئی چیز دکھائی دے رہی تھی اس ساری صورتحال سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عمارت کے اندر کوئی موجود نہیں ہے ہم سب لوگ عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں، بہرحال طالبان کمانڈر اور بھائی حذیفہ شہید رحمہ اللہ اور دوسرے چند سرکردہ ساتھیوں نے یہی مشورہ دیا کہ دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے اور گاڑی کا ہارن بھی بجانا چاہیے آگے اللہ مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ایک ساتھی نے دو تین مرتبہ گاڑی کا ہارن بجایا اور ایک دوسرے ساتھی نے آگے بڑھ کر آہنی دروازہ کو کھٹکھٹانا شروع کیا تھوڑی سی جدوجہد کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں پر کچھ لوگ موجود ہیں ''لیکن دشمن ہیں یا دوست اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا'' کیونکہ گیٹ کے

سوراخوں سے حرکت کرتی ہوئی روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی جو آہستہ آہستہ اندر کی جانب سے گیٹ کی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور بھاری بھرکم قدموں کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ آنے والوں کی تعداد ایک یا دو سے کچھ زیادہ ہے ہمارے سب ساتھی گاڑی کے اندر اپنا اپنا اسلحہ مضبوطی سے پکڑے ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیاری پوزیشن میں بیٹھے ہوئے تھے، جوں جوں قدموں کی آواز گیٹ کے نزدیک ہوتی جارہی تھی اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں بھی تیز تر ہوتی جارہی تھیں کیونکہ اس پراسرار ماحول میں معلوم نہیں تھا کہ کس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا، بھاری قدموں کی آوازیں گیٹ پر آ کر رک گئیں اور گیٹ کھلنے سے پہلے ایک کرخت آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی ''کیستی'' یعنی کون ہے اس کا مطلب ہمارے اکثر ساتھی نہیں سمجھتے تھے اس لیے اس کرخت آواز کا مطلب سمجھنے کے لیے بے تاب تھے کہ اندر سے اتنی کرخت آواز میں کہا گیا ہے بہرحال طالبان کمانڈر نے جواب میں گیٹ پر آنے والوں سے کہا کہ دروازہ کھولو ہم لوگ طالبان ہیں یہ سنتے ہی ان لوگوں نے دروازہ کھول دیا اور گیٹ پر کھڑے ہوئے سب لوگوں کو خوش آمدید کہا اور پرتپاک طریقے سے ملے اور کہا کہ گاڑیوں کو اندر لے آئیں جب سب گاڑیاں عمارت کے اندر داخل ہو گئیں تو قوماندان صاحب نے عمارت کے اندر موجود لوگوں کو اپنا مدعا بیان کیا کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہاں پر کھانے کا کچھ انتظام ہے اس پر ان لوگوں نے جواب دیا کہ کھانے کا انتظام تو ہے لیکن کیونکہ کافی دیر ہو چکی ہے اس لیے کوئی خاطر خواہ اور معقول کھانے کی چیز بچی ہوئی نہیں ہے ہمارے کمانڈر صاحب نے جواب میں کہا کہ جو کچھ بھی بچا ہوا ہے ہمارے لیے تیار کردو تا کہ شدید بھوک کا کچھ سدباب ہو سکے چنانچہ وہاں موجود افراد نے کمانڈر صاحب سے کہا کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر میرے ساتھ آجائیں تا کہ سب کو کھانے والے کمرے میں پہنچا دوں کمانڈر صاحب نے سب ساتھیوں کو گاڑیوں سے نیچے اترنے کا حکم دیا ساتھی پہلے ہی گاڑیوں میں کافی دیر بیٹھنے کی وجہ سے تھک چکے تھے چنانچہ نیچے اترنے کا حکم سنتے ہی انتہائی سرعت کے ساتھ اپنا اپنا اسلحہ سنبھالتے ہوئے گاڑیوں سے نیچے اتر آئے اور کمانڈر صاحب اور وہاں کے مقامی آدمی کے پیچھے چل پڑے۔ جب اندرونی عمارت میں داخل ہونے کے بعد پہلے کمرے میں پہنچے تو

دیکھا کہ یہ کمرہ عام کمروں سے کافی بڑا تھا اور کمرے کی چھت بھی عام کمروں کی چھتوں کی نسبت کافی اونچی تھی کمرے کی بائیں دیوار کے ساتھ پانی کے ڈرم پڑے ہوئے تھے دیوار کے ساتھ ایک لالٹین لٹک رہی تھی جس کی ہیئت کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ لالٹین برسوں سے یونہی روشن ہے اور لوگوں کو روشنی پہنچاتے پہنچاتے اب ''خود تاریکیوں میں ڈوبتی جارہی تھی'' یہ کمرہ کم اور راہداری زیادہ معلوم ہورہا تھا کیونکہ ایک وہ دروازہ تھا جس کے ذریعے ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تھے اور ایک دروازہ اسی کمرے کے اندر بڑے ہال میں کھل رہا تھا گویا یہ ایک راہداری تھی جس سے گزر کر ہال میں جایا جاتا تھا بہرحال اس راہداری نما کمرے میں ہاتھ وغیرہ دھونے کے بعد جب ہال میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ہال میں بہت سارے بڑے بڑے ڈائننگ ٹیبل اور ٹیبلوں کے اردگرد بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں ہم سب ساتھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ ہال بھی اپنی پراسراریت میں باہر کے ماحول سے کم نہ تھا اتنے بڑے ہال میں صرف دو لالٹینیں تھیں جو تیل پر چلنے کی بجائے ''پانی'' سے چلتی بلکہ ٹمٹماتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اتنے بڑے ہال میں گویا یہ اندھیرے کے ساتھ کھلم کھلا مذاق کیا گیا تھا۔ اس ہال کی چھت بھی کافی اونچی تھی جس کی وجہ سے یہاں آواز کی بازگشت ہوتی تھی اور اگر کوئی ساتھی ایک جملہ بھی تھوڑی بلند آواز میں منہ سے نکالتا تو اس جملے کی بازگشت چند لمحے تک کمرے کے خلا میں گھومتی رہتی، آواز کی یہ بازگشت ماحول پر چھائی ہوئی پراسراریت مین مزید اضافہ کا باعث بنی ہوئی تھی۔ بہرحال ہمارے میزبانوں نے جو بھی بچا کھچا کھانا تھا ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا جس سے سب ساتھیوں نے بصد شوق شغل فرمایا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سب ساتھی دوبارہ اپنی اپنی گاڑیوں میں آکر بیٹھ گئے اور اب رات گزارنے کے لیے ہماری منزل ایئرٹرمینل تھا کیونکہ کھانا کھلانے والے میزبانوں نے ہمارے بڑوں کو بتایا تھا کہ شب بسری کے لیے ٹرمینل سے زیادہ محفوظ اور بہتر جگہ کوئی نہیں ہے چنانچہ تمام گاڑیاں بگرام ایئرٹرمینل کی طرف چل پڑیں تھوڑی دیر میں گاڑیوں کا یہ چھوٹا سا کارواں بگرام ایئربیس کے بڑے پھاٹک پر پہنچ گیا، یہاں پر چند لمحوں کے لیے گاڑیاں رک گئیں لیکن جلد ہی گاڑیاں یہاں سے بھی چل پڑیں تھوڑی دیر مزید سفر کرنے کے بعد گاڑیاں ایئرٹرمینل

کے مین گیٹ کے پاس پہنچ گئیں، دو ساتھیوں نے اتر کر گیٹ خود ہی کھولا کیونکہ عمارت کے اندر کوئی شخص موجود نہیں تھا تمام گاڑیاں گیٹ کے اندر داخل ہو کر رک گئیں، ٹرمینل کی یہ عمارت اپنے مکینوں سے بالکل خالی تھی گاڑیوں سے اتر کر ساتھیوں نے عمارت کے اندر اور ارد گرد چل پھر کر کوشش کی کہ شاید کوئی آدمی مل جائے لیکن کوئی آدمی بھی نہ ملا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نماز عشاء ادا کرنے کے لیے وضو وغیرہ کہاں سے کیا جائے کچھ ساتھی وضو کے لیے پانی کی تلاش میں ٹرمینل کی بائیں جانب سے ہوتے ہوئے عمارت کے بالکل پیچھے کی جانب پہنچ گئے جہاں پر انہوں نے دیکھا کہ جہاز کی ٹینکی جو لکڑی کے سٹینڈ پر رکھی ہوئی تھی میں پانی موجود ہے علاوہ ازیں جہاں پر ٹینکی پڑی ہوئی تھی اس کی دائیں جانب ایک میدان تھا جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کافی درخت لگے ہوئے تھے۔ ان ساتھیوں نے جلدی سے آ کر دوسرے ساتھیوں کو بتایا کہ انہوں نے حوائج ضروریہ کے لیے میدان اور وضو کے لیے پانی تلاش کر لیا ہے چنانچہ ہمارے سب ساتھی ان ساتھیوں کی معیت میں مطلوبہ جگہ پہنچ گئے اب سامنے درختوں والے میدان کی طرف جاتے ہوئے ہم سب ہی گھبرا رہے تھے اگرچہ اس وقت افق مشرق سے چاند نے طلوع ہو کر ماحول پر چھائی ہوئی اندھیرے کی دبیز چادر کو چاک کر کے ماحول کو روشن کیا ہوا تھا اور اس روشنی میں ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی لیکن پھر بھی سامنے والا میدان جو ایک چھوٹے سے جنگل کا نقشہ پیش کر رہا تھا میں داخل ہونے سے ہر ساتھی گھبرا رہا تھا کیونکہ یہاں پر دشمن کی طرف سے لگائے گئے مائن یعنی بارودی سرنگوں کے ہونے کا خدشہ موجود تھا لیکن جب چند ساتھی اللہ رب العزت پر توکل کرتے ہوئے جنگل نما میدان میں احتیاط کے ساتھ داخل ہو گئے تو ان کی دیکھا دیکھی دوسرے ساتھی بھی اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر آ گئے اور وضو وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ٹرمینل کی دوسری منزل کے کمروں میں جا کر گروپوں کی شکل میں نماز عشاء ادا کی، نماز ادا کرنے کے بعد کمانڈر حذیفہ شہید رحمہ اللہ نے ساتھیوں کے پاس چکر لگایا اور سب کو محتاط طریقے سے سونے کے بارے میں ہدایات دیں اور کہا کہ صبح تک کمروں سے باہر نہ نکلیں اور باہر کھلنے والی کھڑکیوں سے سر باہر نہ نکالیں اور اپنے اپنے اسلحہ کو تیاری پوزیشن میں رکھ کر سوئیں۔

بگرام سے واپسی

چنانچہ سب ساتھی جن جن کمروں میں تھے وہاں پر انتہائی محتاط انداز میں اپنے اپنے میگزین پورچوں کو اپنے جسموں سے جدا کئے بغیر اپنی اپنی گنوں کو سرہانے رکھ کر سونے کی تیاری کرنے لگے، میں جس کمرے میں تھا اس کمرے میں ایک جہازی سائز ٹیبل اور کچھ کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں، دیواروں پر پائلٹوں کے استعمال کے ہیلمٹ لٹک رہے تھے، میں نے اور دوسرے ساتھیوں نے جو میرے ساتھ اس کمرے میں تھے، نے مل کر کمرے میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی کرسیوں کو ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔

میں نے اپنی میگزین، پورچ اور گرنیڈ پورچ کو چیک کیا اور کلاشنکوف کو اپنے سرہانے اس طرح رکھا کہ بوقت ضرورت آسانی سے اسے استعمال کر سکوں اور سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا، لیکن نیند تھی کہ جیسے آج روٹھ گئی ہو، دور دور تک نیند کا نام ونشان بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا اور میں دائیں بائیں کروٹیں بدل رہا تھا، ذہن عجیب قسم کے خدشوں اور وسوسوں کا شکار تھا کبھی ذہن میں آتا کہ اتنی بڑی اور اہم عمارت میں کسی بھی آدمی کا موجود نہ ہونا کوئی سازش نہ ہو، میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ایک آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، پہلے تو میں نے سوچا کہ یہ میرا وہم ہے اور کوئی آواز وغیرہ نہیں ہے لیکن جب آواز کے تسلسل میں کوئی فرق نہ آیا تو میں نے اپنے قریب لیٹے ہوئے ساتھی کو بیدار کیا ''جو نہ جانے کب کا نیند کی وادیوں میں پہنچ چکا تھا'' وہ ساتھی بھی جلدی میں اٹھ بیٹھا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ ''حامد بھائی کیا بات ہے خیریت تو ہے آپ نے مجھے کیوں جگایا ہے؟'' اس پر میں نے چونکتے ہوئے کہا کہ آپ کو کچھ آوازیں سنائی نہیں دے رہیں اس ساتھی نے بھی پہلے یہ میرا وہم جانا لیکن جب ذرا غور سے سننے کی کوشش کی تو وہ بھی کچھ پریشان سا ہو گیا اور کہنے لگا کہ واقعی آوازیں تو آ رہی ہیں اور ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کچھ لوگ چل پھر رہے ہوں۔

اب کیا کرنا چاہیے......؟ ہم دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال

کر رہے تھے، ایک سنسنی سی ہمارے دل و دماغ میں چھاتی جا رہی تھی، ہم کچھ بھی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے اور...... آواز تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی...... اور ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ آواز آہستہ آہستہ کمروں کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

میں اپنے ذہن اور اپنے دل کی دھڑکنوں پر مسلسل کنٹرول کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا اور مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ ضرور کرنا چاہیے...... لیکن کیا......؟

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہ ساتھی جس کو میں نے بیدار کیا تھا گویا ہوا ''ہمیں سب ساتھیوں کو بیدار کرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ اچانک کوئی افتاد آن پڑے اس لیے تمام ساتھیوں کو خبردار کرنا ضروری ہے'' پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ فوراً سب ساتھیوں کو بیدار کرنا چاہیے لیکن اس خدشہ کے پیش نظر کہ یہ فقط ہمارا وہم نہ ہو اور ہماری اس بیوقوفی کی وجہ سے تھکے ماندے ساتھیوں کی نیندیں خراب نہ ہو جائیں میں اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہا اور اس ساتھی کو بھی منع کر دیا کہ ساتھیوں کو ابھی نہ اٹھائے۔ اس ساتھی نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو ''کہ خطرہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور تم......''؟

میں نے اس ساتھی کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے اسے اپنے قریب بلایا اور سرگوشی میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا ''دیکھو......! اس طرح ساتھیوں کو بے آرام کرنا مناسب نہیں، پہلے ہمیں خود حالات کا جائزہ لینا چاہیے، اگر خطرے کی کوئی بات ہوئی تو فوراً ساتھیوں کو جگا دیں گے۔'' اس ساتھی نے میرے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے کہا ''لیکن ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا ''خاموشی سے اپنا اسلحہ اٹھاؤ...... ہم نیچے جا کر صورت حال کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

جب ہم نیچے جانے کے لیے اٹھے تو میرے ساتھ والے ساتھی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''نیچے جانے سے پہلے ہمیں کھڑکی کے ذریعہ نیچے جھانک کر دیکھ لینا چاہیے'' اس ساتھی کے کہنے پر میں کھڑکی کی طرف بڑھ گیا اور کھڑکی کھول کر ڈرتے ڈرتے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا جبکہ میرا ساتھی جس کا نام غالباً احمد تھا دوسری کھڑکی سے نیچے جھانکنے کی کوشش کرنے لگا، ہم ہمت کر کے کھڑکی سے سر باہر نکالے جھانک تو رہے تھے لیکن ہر لمحہ یہ خوف

دامن گیر تھا ''ابھی کسی گمنام سمت سے کوئی گولی سنسناتی ہوئی آئے گی اور ہم دونوں میں سے کسی ایک یا دونوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر ڈالے گی'' بہرحال ہم دونوں تھوڑی دیر تک کھڑکیوں سے باہر جھانکتے ہوئے حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے رہے لیکن یہاں سے جب کسی بھی چیز کی نقل و حرکت کا پتا نہ چلا تو ہم نے نیچے جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ہم دونوں آہستہ آہستہ بغیر آواز پیدا کیے کمرے سے باہر گیلری میں آ گئے اور نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ گیلری میں کافی اندھیرا تھا جس کی وجہ سے راستے کا اندازہ مشکل ہو رہا تھا، میں نے اپنی پنسل ٹارچ روشن کی اور اس ٹارچ کی روشنی میں ہم سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئے جہاں پر ہم نے سیفٹی لاک کھول کر اپنی گنوں کو لوڈ کیا اور گنوں کو فائرنگ پوزیشن میں پکڑتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے، ہم انتہائی محتاط طریقے سے بالکل دیوار کے ساتھ چپک کر اور بغیر آواز پیدا کیے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ اب ہمیں راستہ دیکھنے کے لیے ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ تھوڑی دیر اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے ہماری آنکھیں کسی حد تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ ہم اس طرح احتیاط سے چلتے ہوئے نیچے پہنچ گئے اور نیچے پہنچتے ہی ٹریننگ کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی مخالف سمت کی دیواروں کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے، گنیں بدستور فائرنگ پوزیشن میں ہمارے ہاتھوں میں تھیں، تھوڑی دیر تک دیواروں کے ساتھ چپکے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد جب یقین ہو گیا کہ تا حال ہمیں کسی نے نہیں دیکھا تو ہم دوبارہ حرکت میں آ گئے اور انتہائی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگے، دروازے پر پہنچتے ہی ہم دونوں دروازے کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے اور باہر کا جائزہ لینے لگے، باہر ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، ہوا کی شائیں شائیں اور درختوں کے پتوں کی آوازوں کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور جن آوازوں کو سن کر ہم اوپر سے نیچے آئے تھے وہ آوازیں اب بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں علاوہ ازیں باہر کا منظر بالکل صاف تھا یعنی وہاں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہم دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشاروں کی زبان میں باہر چلنے کا فیصلہ کیا لیکن

باہر نکلنے میں ہزاروں خدشات ہمارے سامنے تھے، ایک تو یہ کہ ہمارے کمانڈر نے منع کیا تھا کہ صبح تک کوئی ساتھی کمرے سے باہر نہ نکلے اور ہم کمرے سے باہر تو کیا نیچے تک آ چکے تھے لیکن اس معاملہ میں مطمئن اس لیے تھے کہ ہم کوئی سیر کرنے یا ہوا خوری کے لیے تو نیچے آئے نہیں تھے بلکہ ساتھیوں کی حفاظت کے لیے آئے تھے اور دوسرا یہ کہ اگر عمارت سے باہر نکلتے ہیں تو باہر نجانے کس قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا ہے اسی وجہ سے ہمارا اضطراب اور انجانا سا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی دل کڑا کرتے ہوئے اللہ کا نام لے کر میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا...... اور پھرتی کے ساتھ باہر کی طرف لپکا...... اور دوسرے ہی لمحے میں باہر موجود تھا...... باہر بھی دیوار میری جائے پناہ تھی یعنی باہر نکلتے ہی میں دیوار کے بالکل ساتھ جا کھڑا ہوا اور اپنی منتشر سانسوں اور دل کی بے ربط دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے آس پاس نظر دوڑانے لگا، اس دوران میں نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا کہ رات کے اس پہر کسی انجانی گولی نے میرا استقبال نہیں کیا، تھوڑی دیر بعد میں نے مخصوص اور دھیمے انداز میں سیٹی کی آواز نکالی جسے سن کر میرا دوسرا ساتھی احمد بھی انتہائی سرعت کے ساتھ باہر نکل آیا اور میرے سے کچھ فاصلہ پر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور چند لمحوں بعد وہ ساتھی میرے قریب آ گیا اور انتہائی آہستہ آواز میں کہنے لگا: ''ابھی کس طرف چلیں'' میں نے جواب دیا کہ پہلے گیٹ کی طرف چلنا چاہیے تا کہ بیرونی سمت اور عمارت کی دائیں بائیں سمت کو چیک کیا جا سکے چنانچہ ہم نارمل انداز میں ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر دھڑکتے دلوں کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھنے لگے اور تھوڑی دیر میں ہم گیٹ کے پاس پہنچ گئے اور گیٹ پر رک کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگے لیکن تا حال ہمیں گیٹ کے باہر اور ارد گرد کوئی آدمی حرکت کرتا دکھائی نہیں دیا چنانچہ ہم اوپر سنی گئی آوازوں کو اپنا وہم خیال کرتے ہوئے عمارت کی پچھلی جانب بھی چیک کرنے کا ارادہ لے کر واپس مڑے اور ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک کرخت اور تیز آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی...... دریش (ہالٹ)...... یہ آواز سن کر گویا ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں ہم جہاں تھے وہیں رک گئے میں ذرا آگے تھا اور میرا دوسرا ساتھی میرے سے کچھ فاصلے پر میرے پیچھے کھڑا تھا، میں نے مڑ کر پیچھے اپنے ساتھی کی طرف

دیکھنا چاہا...... لیکن پھر وہی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ''حرکت ماکوا'' یعنی حرکت نہ کرو...... میں نے آواز کی سمت کا اندازہ کرنا چاہا کہ آواز کس طرف سے آ رہی ہے لیکن واضح طور پر کچھ اندازہ نہ کر پایا اور آرام سے بغیر حرکت کیے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

ہمیں روکنے والے جو ہنوز ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے کے بارے میں ان کی آواز سن کر مجھے یہ شک تو ہو رہا تھا کہ یہ ضرور طالبان ساتھی ہیں چونکہ انہوں نے پشتو میں ہمیں للکارا تھا، جبکہ میری معلومات کے مطابق یہ سارا علاقہ فارسی بانوں کا تھا اور پشتو اس علاقہ میں نہیں بولی جاتی تھی اسی لیے مجھے شک گزرا کہ یہ طالبان ہی ہوں گے لیکن فقط شک...... ابھی میں اسی سوچ و بچار میں گم تھا کہ ہمیں للکارنے والوں کی طرف سے ایک اور حکم پشتو زبان میں صادر ہوا (افغان طالبان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے پشتو زبان کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی) کہ ''اپنا اسلحہ نیچے رکھ کر ہاتھ اوپر اٹھالو'' اب اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اسلحہ نیچے رکھ کر ہاتھ اوپر اٹھا لیے جائیں کیونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ للکارنے والے کتنے ہیں اور کس کس سمت میں ہیں لیکن پھر بھی میں نے ہمت کر کے ٹوٹی پھوٹی پشتو زبان میں کہا کہ ''بھائی آپ لوگ کون ہیں؟ آپ ہمارے سامنے تو آئیں'' لیکن وہی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی کہ پہلے جو کہا گیا ہے وہ کرو بعد میں پتہ چل جائے گا کہ ہم کون ہیں، میں نے مجبوراً اپنا اسلحہ زمین پر رکھ دیا اور ہاتھ اوپر اٹھا لئے دوسرے ساتھی نے بھی اسلحہ زمین پر رکھ کر ہاتھ اوپر اٹھا لئے ابھی ہم نے ہاتھ اوپر اٹھائے ہی تھے کہ ایک اور حکم آیا...... اسی طرح ہاتھ اٹھائے اسلحہ سے پانچ میٹر دور ہو کر کھڑے ہو جاؤ اور کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ بھون دیے جاؤ گے مجبوراً ہم الٹے قدموں اپنے اسلحہ سے کچھ دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے تو تین آدمی مختلف سمتوں سے اسلحہ اٹھائے انتہائی محتاط طریقے سے ہماری طرف بڑھنے لگے، میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو سی ہوتی جا رہی تھیں اور میرا ذہن اس بات پر اٹکا ہوا تھا کہ معلوم نہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور اب یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے، اگر یہ دشمن کے لوگ ہوئے تو ہمارے اوپر والے ساتھیوں کا کیا بنے گا لیکن مختلف سمتوں سے ہماری طرف بڑھنے والے لوگوں کی شکلیں اور حلیہ جب واضح طور پر نظر آ گیا تو میرے خدشات کافی حد تک رفع ہو گئے کیونکہ آنے والوں کی سیاہ رنگ کی پگڑیاں اور پہنے

ہوئے کھلے کھلے کپڑے اور سنت سے مزین چہرے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ آنے والے طالبان ہی ہیں چنانچہ میرے اعصاب جو کچھ دیر پہلے انتہائی کھچاؤ کا شکار تھے اب کافی حد تک پرسکون ہو چکے تھے اور ہماری طرف بڑھنے والے بھی ہماری شکلیں دیکھنے کے بعد کچھ مطمئن دکھائی دے رہے تھے، وہ لوگ جب ہمارے بالکل قریب پہنچ گئے تو ہم سے بڑے نرم لہجے میں گویا ہوئے کہ آپ کون لوگ ہیں اور اس وقت آپ یہاں کیوں پھر رہے ہیں؟ میں نے جواب دینے کی بجائے آنے والوں سے پوچھا کہ پہلے آپ بتائیں کہ آپ لوگ کون ہیں؟ کیا آپ کل ہمارے ساتھ آنے والے ساتھیوں میں سے ہیں؟ اس پر ان میں سے ایک جوان کے گروپ کا سربراہ معلوم ہو رہا تھا نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ہاں! ہم لوگ طالبان ہیں اور رات ہی یہاں پہنچے ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ آپ لوگ بھی ہمارے قافلے میں شامل تھے یا نہیں'' اتنے میں میرا دوسرا ساتھی جو میرے سے کچھ فاصلہ پر کھڑا تھا میرے قریب آ گیا جس پر ان لوگوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ہم اپنے اٹھائے ہوئے ہاتھ بھی نیچے گرا چکے تھے۔

میں نے آنے والوں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ پاکستانی ہیں اور ملا عبدالجبار کے ساتھی ہیں اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ کوئی پہرہ پر موجود ہے یا نہیں اور ہم نے کچھ آوازیں سنی تھیں جو غالباً آپ لوگوں کے چلنے کی ہوں گی بے خبری کی وجہ سے ہمیں فکر ہوئی کہ کوئی دشمن نہ ہو جو طالبان مجاہدین کو بے خبری میں نقصان پہنچائیں چنانچہ ہم حالات کا جائزہ لینے کے لیے نیچے آئے تھے اور اب آپ حضرات کے سامنے کھڑے ہیں۔ میری باتیں سن کر وہ لوگ مسکرائے اور مطمئن ہو گئے اور ہمارا اسلحہ اٹھا کر ہمارے حوالے کرتے ہوئے ہم دونوں سے کہنے لگے کہ ابتدائی رات سے ہم یہاں پہرے کے لیے موجود تھے اور طالبان مجاہدین کی حفاظت کا مکمل بندوبست کیا ہوا تھا بعد ازاں انہوں نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے آپ لوگوں کو تنگ کیا اور آپ کی دل آزاری کی جس کے لیے ہم بہت شرمندہ ہیں لیکن مجاہدین کی حفاظت کی خاطر یہ سب کچھ کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

کچھ مزید گپ شپ کے بعد ہم نے ان سے اجازت لی اور واپس کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کرنے لگے، اب چونکہ میرا دل اور میرا ذہن کافی مطمئن ہو چکا تھا کہ اللہ کے سپاہی

طالبان بیدار ہیں اور انہوں نے اپنی عارضی قیام گاہ میں بھی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کر دیا تھا جس کی زندہ مثال میں اپنی آنکھوں سے تھوڑی دیر قبل چاک و چوبند پہریداروں کی صورت میں دیکھ چکا تھا اس لیے جلد ہی نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا اور ایسی گہری نیند سویا کہ صبح نماز کے وقت ساتھیوں نے مجھے بیدار کیا چنانچہ میں بھی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ نیچے آیا اور ضروریات اور وضو وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہم سب ساتھی اوپر آ گئے جہاں پر نماز فجر باجماعت ادا کی گئی نماز ادا کرنے کے بعد سب ساتھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہوگئے تلاوت وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ سفر کی تیاری شروع ہوگئی اور تھوڑی ہی دیر بعد کمانڈر حذیفہ (شہید رحمہ اللہ) جو کہ نیچے گئے ہوئے تھے اوپر ساتھیوں کے پاس آئے اور سب ساتھیوں کو روانگی کے لیے آمادہ پاکر نیچے گاڑیوں کے پاس چلنے کا حکم دیتے ہوئے کہا کہ سب ساتھی جتنی جلدی ممکن ہو سکے نیچے پہنچ جائیں چنانچہ تمام ساتھی جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ کر نیچے کھڑی گاڑیوں کے پاس پہنچ گئے۔

تھوڑی دیر میں تمام ساتھی جمع ہوگئے اور کمانڈر حذیفہ (شہید رحمہ اللہ) اور شاہد بھائی (شہید رحمہ اللہ) بھی آ گئے علاوہ ازیں افغانی طالبان بھی اپنی اپنی گاڑیوں کے پاس آ گئے تو میں نے کمانڈر صاحب سے کہا کہ میں خلوت میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں کمانڈر صاحب میرے ساتھ ایک طرف چل پڑے اور ایک جگہ پر رک گئے جہاں پر کوئی بھی قریب نہ تھا تو میں نے رات والا سارا واقعہ ان کو سنا دیا تو اس پر کمانڈر صاحب مسکرا دیے اور مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر تمہیں اس قسم کا کوئی شک گزرا تھا تو مجھے خبردار کیا ہوتا اور اگر آپ لوگ مجھے خبردار کرتے تو آپ لوگوں کو اتنی زحمت نہ اٹھانا پڑتی کیونکہ رات افغانی طالبان کی طرف سے لگائی گئی پہرے کی ترتیب سے میں آگاہ تھا اور آپ تمام ساتھیوں کو اس لیے نہیں بتایا تھا کہ رات کے چند گھنٹے ہی تو یہاں پر گزارنے تھے بہر حال میں دوبارہ کمانڈر حذیفہ کے ساتھ چلتا ہوا گاڑیوں کے قریب آ گیا جہاں پر تمام ساتھی گاڑیوں میں سوار ہو چکے تھے چنانچہ کمانڈر صاحب بھائی شاہد کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے اور میں حسب سابق ہائی ایس گاڑی میں سوار ہوگیا جب سب ساتھی گاڑیوں میں سوار ہو چکے تو گاڑیاں پھر اسی سڑک پر واپس دوڑنے لگیں

جس پر ہم کل آئے تھے لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ کل رات کے اندھیرے میں اردگرد کے مناظرے سے لطف اندوز نہ ہوسکے تھے لیکن اب صبح کی روشنی میں اردگرد کے تمام مناظر صاف نظر آرہے تھے جن کو دیکھ کر تمام ساتھی محظوظ ہورہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد آگے والی گاڑیاں جنگی ایئر پورٹ کے مین گیٹ پر جاکر رک گئیں، ہماری گاڑی بھی دوسری گاڑیوں کے پیچھے قطار میں کھڑی ہوگئی، گیٹ سے اندر کھڑے جنگی ہیلی کاپٹر صاف دکھائی دے رہے تھے ہیلی کاپٹروں سے تھوڑے فاصلہ پر کھڑا جنگی جیٹ بھی نظر آرہا تھا کچھ ساتھی جو ڈالے میں تھے اتر کر ایئر پورٹ کے مین گیٹ پر جاکر کھڑے ہوئے تاکہ جنگی جہازوں کو قریب سے دیکھ سکیں، بہرحال یہاں زیادہ دیر نہیں روکا گیا بلکہ جلد ہی اترے ہوئے تمام ساتھی کمانڈر صاحب کے حکم پر دوبارہ گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور گاڑیاں اپنے مسافروں کو لے کر دوبارہ محوسفر ہوگئیں اور ایک دوسرے کے پیچھے سڑک پر بھاگنے لگیں اور تقریباً ایک گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ہماری گاڑیاں چاریکار شہر میں پہنچ گئیں، شہر میں پہنچتے ہی افغانی طالبان ادھر ادھر چلے گئے جبکہ ہمارے پاس تو کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا اس لیے ہماری دونوں گاڑیاں ہمیں لئے تھوڑی دیر تک ادھر ادھر پھرتی رہیں آخر کار تھوڑی ہی دیر بعد ہماری گاڑیاں ایک بہت بڑی عمارت میں داخل ہوگئیں، عمارت کے گیٹ پر موجود محافظ طالبان نے تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد گاڑیوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی چنانچہ گاڑیاں اندر جاکر ایک طرف رک گئیں اور سب ساتھی گاڑیوں سے نیچے اتر کر ایک طرف بنے چبوترے پر جاکر بیٹھ گئے۔ بھوک نے تقریباً سب ساتھیوں کو تنگ کیا ہوا تھا کیونکہ رات کو بھی بہت کم کھانا کھایا تھا اس لیے سب ساتھیوں کو شدت کے ساتھ بھوک کا احساس ہورہا تھا جب کہ اس عمارت میں جہاں بہت سارے طالبان موجود تھے اور خوب گہما گہمی تھی اور مسلسل طالبان کی گاڑیاں آجارہی تھیں، ناشتہ وغیرہ کا کوئی بندوبست معلوم نہیں ہورہا تھا اس لیے کمانڈر صاحب ہمیں اس بڑی عمارت جس کے بارے میں ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک چھوٹی فوجی چھاؤنی ہے کے قریب ہی ایک ہوٹل میں لے گئے جہاں پر قہوہ کے ساتھ روٹی کھائی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

چاریکار چھاؤنی میں چند روز

ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد ہم دوبارہ اسی فوجی (قوماندانی) چھاؤنی میں آ کر بیٹھ گئے اب کمانڈر حذیفہ اس سوچ وفکر میں تھے کہ کہاں جا کر بسیرا کیا جائے کیونکہ کوئی متعین جگہ تو تھی نہیں جہاں جا کر ڈیرے ڈالے جاتے، بہر حال کمانڈر صاحب نے سب ساتھیوں کو گاڑیوں میں سوار ہونے کے لیے کہا جب ساتھی گاڑیوں میں سوار ہو گئے تو گاڑیاں حرکت میں آ گئیں اور عمارت سے نکل کر بائیں طرف جانے والی سڑک پر محو سفر ہو گئیں اور چوک سے گاڑیاں دائیں جانب کابل روڈ پر مڑ گئیں اور پھر تھوڑا سا چلنے کے بعد دائیں طرف ایک کشادہ گلی میں مڑ گئیں اور تھوڑا سا آگے جا کر بائیں طرف ایک عمارت میں داخل ہو گئیں عمارت کے باہر ایک بڑا سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس کو بہت کوشش کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی نہ پڑھ سکا کیونکہ بورڈ حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر اپنی اصلی شکل نہ جانے کب کی گم کر چکا تھا، عمارت میں داخل ہو کر سب ساتھی گاڑیوں سے نیچے اتر گئے اس عمارت کے اندر کوئی بھی انسان موجود نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ عمارت کی اندرونی حالت باہر لگے سائن بورڈ سے بھی بدر جہا ابتر تھی یعنی ساری عمارت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی عمارت کے بہت سارے کمروں میں سے کسی بھی کمرے کی چھت موجود نہ تھی عمارت میں ہر طرف کباڑ اور گندگی کے ڈھیر جا بجا پڑے نظر آ رہے تھے کچھ دیر یہاں اس عمارت میں رک کر اس عمارت کا جائزہ لیا گیا کہ یہ عمارت رہائش کے قابل ہو سکتی ہے یا نہیں لیکن جب عمارت کے ہر طرف سے خستہ وشکستہ حالت کو دیکھ کر مایوسی ہوئی تو کمانڈر صاحب نے دوبارہ حرکت کرنے کا حکم دے دیا چنانچہ گاڑیاں دوبارہ حرکت میں آ گئیں اب ہماری اگلی منزل چاریکار کا ''قول اردو'' تھا چنانچہ ہماری گاڑیاں تھوڑی دیر بعد کابل روڈ پر واقع ''قول اردو'' (چھاؤنی) میں داخل ہو رہی تھیں۔ گاڑیاں مین گیٹ میں داخل ہو کر گیٹ کے بالکل سامنے تھوڑے فاصلہ پر موجود عمارت کے پاس جا کر رک گئیں جہاں پہلے بھی کچھ گاڑیاں دو تین ٹینک اور کچھ اینٹی ایئر کرافٹ والی گاڑیاں کھڑی تھیں بہر حال ہم سب ساتھی گاڑیوں سے نیچے اتر گئے اور کمانڈر حذیفہ اور ایک افغانی طالب جو طالبان کمانڈر ملا محب اللہ اخوند کا ساتھی تھا کی معیت میں عمارت کے اندر داخل ہو گئے اور راہداری میں بائیں طرف

کے آخری کمروں کے پاس جا کر رک گئے، افغانی طالب نے کمانڈر حذیفہ کو دو تین کمروں کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ یہ کمرے آپ سب پاکستانی ساتھیوں کے لیے مخصوص ہیں لہٰذا ان کمروں کی صفائی وغیرہ کر کے اپنے آرام و قیام کا بندوبست کرلیں چنانچہ سب ساتھیوں نے مل کر تمام کمروں کی صفائی ستھرائی کی اور فرش پر چٹائیاں وغیرہ بچھادیں کام وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ساتھی ستانے کے لیے لیٹ گئے، تحفظ کے احساس نے سفر سے تھکے ماندے ساتھیوں کو جلد ہی نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا، گھنٹہ ڈیڑھ نیند کرنے کے بعد تمام ساتھی بیدار ہوگئے اور باہر کی طرف چل پڑے، میں بھی دوسرے تمام ساتھیوں کے ہمراہ اس عمارت سے باہر آ گیا باہر ہر طرف طالبان مجاہدین رونق افروز تھے اور آ جا رہے تھے، میں عمارت کے داخلی دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا اور بڑے شوق کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لینے لگا جہاں میں کھڑا تھا وہاں میرے بالکل سامنے تارکول کی پختہ سڑک تھی جو عمارت کے مین گیٹ تک جا کر باہر کابل روڈ سے جا ملتی تھی اس داخلی سڑک کی دونوں جانب سرسبز گراسی پلاٹ تھے، میرے دائیں جانب عمارت کے ایک حصہ سے گزر کر ایک وسیع میدان تھا جو بیرونی دیوار کے پاس جا کر ختم ہوتا تھا اور میرے بائیں جانب صاف شفاف پانی کا پختہ نالہ تھا اس نالے سے آگے پھر عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو کافی دور تک چلا جاتا تھا اسی طرف ایک مسجد بھی تھی اور اس مسجد کے مخالف سمت یعنی مسجد سے مغرب کی جانب بہت بڑے بڑے مطبخ (باورچی خانے) اور تنور لگے ہوئے تھے جہاں پر عمارت میں مقیم لوگوں کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا اور اس مطبخ کے باہر بہت ساری کھانا پکانے والی موبائل گاڑیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں جن کو فوجی گاڑیوں کے پیچھے باندھ کر لے جایا جاتا ہے اور ہماری اس عمارت کی بیک سائیڈ پر جہاں پر میں کھڑا ہوا تھا بہت بڑے سرسبز میدان سے گزر کر ذرا اونچائی پر بہت سارے بیت الخلاء بنے ہوئے تھے اور ان بیت الخلاؤں سے بھی آگے جا کر کھیتوں سے گزرتے ہوئے ایک نہر تھی جسے نہر چاریکار کہتے ہیں اور یہ نہر تقریباً ایک طرف شمال اور دوسری طرف جنوب کے رخ پر تھی اور نہر کے اس پار آبادیاں وغیرہ تھیں دریں اثناء کھانے کا وقت ہوگیا بھائی عبدالحمید جو کہ کمانڈر ملا محب اللہ اخوندزادہ کا ساتھی تھا مجھے اور ایک دو دوسرے ساتھیوں کو لے کر مطبخ کی طرف روانہ

ہوگیا جہاں پر جا کر ہم نے اپنے ساتھیوں کے لیے کھانا وغیرہ لیا اور واپس اپنی جگہ پر آ گئے جہاں پر پہلے ہی ساتھی دستر خوان لگا چکے تھے چنانچہ سب ساتھیوں نے مل کر کھانا کھایا، کھانے کے بعد افغانی سیاہ وسبز قہوے کا دور چلا بعد ازیں سب ساتھی نماز ظہر کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہوگئے اور نماز ادا کرنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر آ گئے اور ستانے کے لیے لیٹ گئے کیونکہ تا حال آرام کرنے کے علاوہ اور کوئی کام وغیرہ تو تھا نہیں اس لیے سب ساتھی آ کر لیٹ گئے کچھ سونے کی کوشش کرنے لگے اور کچھ آپس میں خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے تھوڑی دیر بعد ایک ساتھی انگوروں کی پیٹی اٹھائے داخل ہوا اور سب ساتھیوں کو اٹھا دیا سب ساتھیوں نے مل کر انگور کھائے، انگور افغانستان کے علاقہ شمالی کا خاص الخاص تحفہ ہے اور دنیا میں تقریباً سب سے زیادہ اور بہترین انگور افغانستان کے علاقے شمال میں ہوتے ہیں اور اس فراوانی کی وجہ سے انگور یہاں پر بہت سستے تھے۔

اب سب ساتھی اس انتظار میں تھے کہ کب آگے محاذ پر تشکیل ہوتی ہے، یہاں ''قول اردو'' سے طالبان کے دستے محاذوں پر مسلسل آ جا رہے تھے جنہیں دیکھ کر ہم سب ساتھیوں کا شوق بھی دو چند ہوتا جا رہا تھا اور بے چینی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی، ہر ساتھی اللہ کے دین کی سربلندی اور نفاذ شریعت کی خاطر دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے بے چین تھا اور شوق شہادت کے جذبات ہر ساتھی میں موجزن نظر آ رہے تھے، آج کا پورا دن اسی انتظار میں گزرا اور رات سر پر آن پہنچی رات کو کمانڈر صاحب نے ساتھیوں کے پہرے وغیرہ کی ترتیب لگائی چنانچہ جن جن ساتھیوں کی پہرے پر ڈیوٹی تھی انہوں نے اپنی اپنی باری پر تندہی سے اپنا فرض پورا کیا اور بقایا ساتھیوں نے سو کر رات گزاری، اگلے دن پھر منتظر ہو کر بیٹھ گئے کہ کب محاذ جنگ پر روانہ ہوتے ہیں، میں بھی دوسرے ساتھیوں کی طرح بے چینی سے آگے جانے کا منتظر تھا اسی اثناء میں میں نے سوچا کہ کیوں نہ شہر کا چکر لگایا جائے چنانچہ میں اور ایک ساتھی باجوہ کمانڈر صاحب سے اجازت لے کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے، بازار میں خوب چکر لگایا جہاں جاتے جس دکان پر جاتے لوگ بڑے پرتپاک طریقے سے ملا صاحب ملا صاحب کہتے ہوئے ملتے، بہر حال ہم نے بازار سے کرنسی تبدیل کرائی اور کچھ ادویات وغیرہ

باجوہ صاحب کے لیے خریدیں کیونکہ باجوہ صاحب چاریکار پہنچنے پر علیل سے ہوگئے تھے، اپنی مطلوبہ چیزیں خریدنے کے بعد میں اور باجوہ صاحب واپس ''قول اردو'' آ گئے اسی دوران مولانا عبدالجبار صاحب بھی تشریف لا چکے تھے اور ساتھیوں کی تشکیلیں محاذ کے لیے کر رہے تھے چنانچہ ہم بھی جا کر ساتھیوں میں شامل ہوگئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے سپریم کمانڈر مولانا عبدالجبار صاحب نے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ میری تشکیل بھی محاذ پر کر دی جبکہ باجوہ صاحب جو میرے ساتھ بازار گئے تھے کی تشکیل باعث علالت واپس کابل کر دی گئی۔ اب محاذ پر جانے کے لیے تشکیلیں تو ہوچکیں لیکن وقت کا تعین نہیں تھا کہ کب روانہ ہوا جائے گا بلکہ ہم سب ساتھیوں کو یہ کہا گیا تھا کہ جب بھی کمانڈر ملا محب اللہ اخوندزادہ آپ حضرات کو روانگی کا حکم دے آپ حضرات جن کی تشکیل ہوچکی ہے ان کے ساتھ محاذ پر چلے جائیں چنانچہ تمام ساتھی چشم براہ ہوکر بیٹھ گئے، کچھ ساتھی نہر پر کپڑے وغیرہ دھونے چلے گئے اور کچھ ساتھی باہر بہتے ہوئے نالے کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور خوش گپیوں میں مشغول ہوگئے ہمارے ساتھ ایک ساتھی حق نواز بھی تھا جو بہت ہی خوش مزاج ساتھی تھا اور اکثر ساتھیوں کو مزاحیہ نظمیں سنایا کرتا تھا اس وقت بھی یہی ساتھی حق نواز ساتھیوں کو مزاحیہ نظمیں سنا رہا تھا جس سے سب ساتھی انتہائی محظوظ ہو رہے تھے۔

آج ''قول اردو'' میں طالبان مجاہدین کی آمدورفت معمول سے کچھ زیادہ تھی اور ہیوی اینٹی ایئر کرافٹ کی گاڑیوں اور ٹینکوں کی گھن گرج بھی معمول سے کچھ زیادہ تھی اور ''قول اردو'' کے اندر بھی کافی ٹینک اور گاڑیاں جمع ہوچکی تھیں جن کی نقل وحرکت سے زمین تھرا رہی تھی اور ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے زلزلے کے شدید جھٹکے لگ رہے ہوں۔ آج طالبان کی چہل پہل، ہیوی گاڑیوں اور ٹینکوں کی آمدورفت کو دیکھ کر یقین ہوگیا تھا کہ آج کسی بھی وقت محاذ پر ضرور روانگی ہوگی لیکن کتنی دیر بعد اس کے بارے میں ہم میں سے کسی کو بھی علم نہ تھا۔ بہرحال عصر تک ہم انتظار کی چادر اوڑھے اپنے معمولات میں مشغول رہے، سب ساتھیوں نے اپنی گنوں وغیرہ کو صاف کیا وافر مقدار میں ایمونیشن مہیا کیا گیا اور جن ساتھیوں کے پاس گنیں نہیں تھیں انہیں گنیں دی گئیں اور تقریباً عصر کے قریب معرکہ کے کمانڈر ملا محب اللہ اخوندزادہ کی طرف سے

حکم آیا کہ تمام ساتھی جن کی تشکیل ہوئی ہے فوراً الرٹ ہو جائیں چنانچہ تمام ساتھی جو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے فوراً اپنا اپنا اسلحہ زیب تن کر کے اور ضروری سامان اٹھا کر گاڑیوں کے پاس آ گئے اس سفر میں بھی ہمارے گروپ کمانڈر حذیفہ بھائی تھے اور دوسرے افغانی طالبان جو ہمارے معرکہ کے کمانڈر محب اللہ اخوندزادہ کے ساتھ تھے وہ بھی اپنی اپنی گاڑیوں کے پاس بالکل تیار کھڑے تھے، تھوڑی دیر بعد حرکت کرنے کا حکم ہوا تو تمام ساتھی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے ہم پاکستانی ساتھی بھی بھائی شاہد کی گاڑی میں سوار ہو گئے جب سب ساتھی سوار ہو چکے تو سب گاڑیاں حرکت میں آ گئیں اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئیں۔

پنجشیر پر پہلا حملہ

جبل السراج روڈ پر گاڑیاں فراٹے بھرتی دوڑی چلی جا رہی تھیں کہ چاریکار چوک کراس کرنے کے بعد ہماری گاڑی دوکانوں کے قریب رک گئی یہ ایک طویل و عریض بازار تھا اور بازار کی رونق دیدنی تھی، بڑی بڑی دوکانوں اور دوکانوں کے باہر لگے ہوئے ٹھیلے اور ٹھیلوں اور دکانوں پر لوگوں کا بے پناہ ہجوم اور لوگوں کی آمد و رفت اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ طالبان نے اس علاقہ کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد یہاں کے امن و امان کو مکمل طور پر بحال رکھا ہوا ہے اور یہاں کے لوگ بھی امن و امان کی صورتحال سے مطمئن نظر آ رہے تھے بہر حال کمانڈر حذیفہ صاحب اور ایک دو دوسرے ساتھی گاڑی سے نیچے اتر گئے اور دوکانوں سے کچھ ضرورت کی اشیاء خرید کر واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے اور جلد ہی دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔

سڑک پر اور بھی بہت ساری گاڑیاں، ٹینک اور اینٹی ایئر کرافٹ کی ہیوی گاڑیاں محاذ جنگ کی طرف رواں دواں نظر آ رہی تھیں۔ سورج بھی اپنا دن بھر کا سفر طے کرنے کے بعد افق مغرب میں غروب ہو چکا تھا اس لیے تمام گاڑیاں جہاں جہاں تھیں وہیں پر رک گئیں اور نماز مغرب ادا کی گئی، نماز کی ادائیگی کے بعد تمام گاڑیاں پھر محو سفر ہو گئیں۔

چاریکار سے لے کر جبل السراج اور کاپیسا تک تا حد نظر انگور کے باغات تھے، سڑک کے ساتھ ساتھ وسیع و عریض سرسبز باغات کا سلسلہ اور فصلیں بہت ہی دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔

جب ہم جبل السراج کے قریب پہنچ گئے تو بھاری اسلحہ کے چلنے کی آوازیں صاف سنائی دینے

لگیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ محاذ جنگ اب بہت ہی قریب ہے، سب ساتھی گاڑیوں میں بیٹھے اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے چلنے والے بھاری اسلحہ کی آوازوں پر غور کر رہے تھے کہ اچانک گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور سالنگ روڈ سے گل بہار روڈ پر مڑ گئی یہ جبل السراج کا بازار تھا اور بازار سے گزرتے ہوئے گاڑیاں پھر کھلے علاقے میں پکی سڑک پر دوڑنے لگیں کچا روڈ ہونے کی وجہ سے اب گاڑیوں کی رفتار قدرے کم تھی ابھی اس کچے روڈ پر گاڑیوں نے کچھ فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اس اچانک دھماکے پر سب ساتھی لرز کر رہ گئے اور پھر تو گویا دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

وقفے وقفے سے دھماکے ہو رہے تھے مگر گاڑیاں تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھیں، تھوڑی دیر مزید سفر کرنے پر ان دھماکوں کا راز فاش ہو گیا اور تمام گاڑیوں کے اطمینان سے چلنے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی کیونکہ یہ دھماکے سڑک کے دائیں جانب کھڑے طالبان کے ڈیفنس لائین کے ہیوی آرٹلری (توپ خانے) سے ہو رہے تھے اور یہاں سے وادی پنجشیر پر گولے داغ کر زمینی حملہ کرنے والے طالبان مجاہدین کو کور دیا جا رہا تھا۔ یہ ایک جنگی اصول ہے کہ جہاں سے زمینی حملہ کیا جا رہا ہو آرٹلری (توپ خانہ) وہاں موجود نہیں ہوتا بلکہ زمینی حملہ کی جگہ سے بہت دور ہوتا ہے اور دور رہ کر آرٹلری گروپ زمینی حملہ کرنے والوں کو دفاع مہیا کرتا ہے، یہی وجہ تھی کہ یہ توپ خانہ جہاں سے دھماکوں کی آوازیں سن کر ہم تھوڑی دیر کے لیے لرز کر رہ گئے تھے زمینی حملہ والی جگہ سے بہت دور حملہ کرنے والے طالبان کو دفاع مہیا کرنے میں مصروف تھا۔

رات کا اندھیرا کافی بڑھتا جا رہا تھا، ٹینکوں کی چنگھاڑ، گولوں کی گھن گرج، چھوٹے اسلحہ کی گولیوں کی چھنچھناہٹ ہر لمحہ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی کہ اچانک ہماری گاڑی آگے جانے والی کمانڈر محب اللہ اخوندزادہ کی گاڑیوں کی تقلید میں سڑک کے بائیں جانب موجود ایک بہت بڑی اور زمین سے کچھ اونچائی پر بنی ہوئی عمارت کے پاس جا کر رک گئی اور سب ساتھیوں کو نیچے اترنے کا حکم ملا کیونکہ افغانی طالبان بھی گاڑیوں سے نیچے اتر چکے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ بھی اپنی گاڑی سے نیچے اتر کر ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں تا حال بالکل معلوم نہیں تھا

کہ یہاں پر کیوں روکا گیا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا اور گمان کر رہا تھا کہ شاید یہیں کہیں سے ہمیں دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہے کیونکہ فضا میں ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی اور چھوٹے بڑے اسلحہ کے چلنے کی آوازیں بھی بہت قریب سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ یہاں پر سب ساتھیوں کو قطاروں میں بٹھا کر کھانا تقسیم کیا گیا۔ یعنی ایک ایک بڑی قندھاری روٹی لپٹی ہوئی اور روٹی کے اندر رکھا ہوا خشک گوشت اور ایک ایک ٹکڑا دنبے کی چربی کا۔

سب ساتھیوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا، کھانے کے بعد نماز عشاء ادا کی گئی بعد ازیں پھر دوبارہ گل بہار کی طرف سفر شروع ہو گیا اور چند کلو میٹر چلنے کے بعد گاڑیاں پھر بائیں جانب مڑ گئیں اور بستیوں سے گزرتی ہوئیں پہاڑ کے دامن کے قریب رک گئیں۔ یہاں پر پہلے سے بھی بہت ساری گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور بہت سارے دو میلے (اینٹی ایئر کرافٹ) مختلف پوزیشنوں میں مستعد کھڑے ہوئے تھے اور بہت سارے طالبان مجاہدین اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم سب ساتھیوں کو بھی گاڑی سے نیچے اترنے کا حکم ملا۔ اردگرد کے ماحول کو دیکھنے کے بعد تمام ساتھی اندازہ لگا چکے تھے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے حملے کی ابتداء ہوگی، یہ اندازے اس وقت درست ثابت ہوئے جب کمانڈر حذیفہ شہید نے حملے کے لیے ساتھیوں کی ترتیب لگانی شروع کی اور یہ بتایا کہ یہاں سے کچھ آگے جا کر پہاڑوں پر چڑھنا ہوگا اور پہاڑ کی چوٹی پر پنجشیر کے دفاعی مورچوں پر حملہ کرنا ہے۔ اس پورے محاذ کے کمانڈر ملا محب اللہ اخوند زادہ بھی یہیں پر موجود تھے اور اس حملہ کی ساری تفصیلات انہوں نے ہی کمانڈر حذیفہ شہید کو بتائی تھیں اور پھر کمانڈر حذیفہ شہید نے یہ تفصیلات جو اوپر گزر چکی ہیں ہمارے گوش گزار کیں۔ بعد ازیں کمانڈر حذیفہ شہید نے آگے بڑھتے ہوئے ساتھیوں کو مختلف پوزیشنوں پر رہنے کی تلقین کی جبکہ میری ڈیوٹی مخابرے (وائرلیس) پر بھائی شاہد کے ساتھ لگائی گئی۔ چنانچہ میں نے اور بھائی شاہد نے تمام ساتھیوں کو الوداع کہا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ اسی دوران ہمارے ساتھیوں کے علاوہ افغانی طالبان بھی اپنی اپنی پوزیشنوں پر رہتے ہوئے حملے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

میں اپنا مخابرہ (وائرلیس) آن کئے گاڑی میں بیٹھا بغور اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ دفعتہً میرا مخابرہ (ریڈیو) جاگ اٹھا اور اس میں سے، اسلام، اسلام، اسلام کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ لفظ اسلام ہمارا رابطے کے لیے کوڈ ورڈ تھا۔ جس کا جوابی کوڈ ورڈ تھا ''زندہ باد'' چنانچہ میں نے یہ آوازیں سن کر مخابرے کا بٹن دبا کر کہا، زندہ باد، زندہ باد، میں اپنے نمبر پر ہوں اوور، کمانڈر حذیفہ شہید رابطے پر تھے اور کہہ رہے تھے، ہم سب خیریت سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں آپ سنائیں کیا پوزیشن ہے اور پھر میں نے جواب میں کہا کہ ہم خیریت سے ہیں اور اردگرد نظر رکھے ہوئے ہیں اوور...... اپنا مخابرہ (ریڈیو) آن رکھنا اور انتہائی محتاط رہنا، اللہ حافظ کمانڈر حذیفہ نے کہا، میں نے بھی جواب میں اللہ حافظ کہا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

ساری رات میں اپنا مخابرہ (وائرلیس سیٹ) آن کئے بیٹھا رہا لیکن آخری رابطہ جوان ساتھیوں کی روانگی کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہوا تھا کے بعد ابھی تک کمانڈر صاحب نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ آخرکار میں نے خود رابطہ کی کوشش شروع کی اور مخابرے (وائرلیس سیٹ) پر کمانڈر صاحب کی فریکونسی سیٹ کر کے اسلام، اسلام، اسلام پکارنا شروع کیا لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہورہا تھا جس کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ تشویش لاحق ہوئی، چنانچہ میں نے بھائی شاہد سے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ ساری رات گزرگئی ہے اور تقریباً صبح کے آثار نمودار ہونے والے ہیں لیکن ابھی تک کمانڈر صاحب نے کوئی رابطہ نہیں کیا اور میں بھی کافی دیر سے کوشش کررہا ہوں لیکن ابھی تک کوئی جواب نہیں آرہا۔ بھائی شاہد جو ڈرائیونگ سیٹ کو سیدھا کئے بہت دیر سے سورہے تھے میرے بیدار کرنے اور پھر میری باتیں سننے کے بعد پریشان سے ہوگئے اور کہنے لگے کہ ''گاڑی سے نیچے اتر کر رابطے کی کوشش کرو'' چنانچہ میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ نیچے اترتے ہی سخت قسم کی سرد ہوا نے میرا استقبال کیا جس سے میں ٹھٹھر کر رہ گیا۔ بہرحال تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں ہلا کر خود کو گرم کیا اور پھر رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اب بھی مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ بالکل رابطہ نہیں ہورہا تھا میں نے دوسرے افغان کمانڈروں کی جن کی فریکونسی مجھے معلوم تھی ان سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہاں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

ہر طرف اندھیرے کی دبیز چادر چھائی ہوئی تھی ہمارے اردگرد کھڑے تمام دو میلے (اینٹی ایئر کرافٹ گنیں) بالکل خاموش کھڑی تھیں، ہیوی اسلحہ کے چلنے کی جو آوازیں رات کو کان پھاڑ رہی تھیں وہ آوازیں بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھیں بس ہلکی پھلکی فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن وہ بھی بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور رات کے اس گھپ اندھیرے میں ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید یہاں پر کبھی کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں اور نہ ہی یہاں پر کبھی کوئی توپ چلی ہے حالانکہ یہ علاقہ میدان جنگ تھا، یہ خاموشی اور سکوت دراصل طالبان مجاہدین کی ایک خطرناک جنگی چال تھی، پہلا حملہ طالبان نے رات کے پہلے حصہ میں کیا تھا اور اس حملہ میں طالبان کے توپخانہ کا اہم کردار تھا کیونکہ شمالی اتحاد کے مورچوں کی طرف زمینی حملہ کرنے والے طالبان مجاہدین کو یہ توپخانہ دفاع مہیا کرتا رہا یعنی اس توپخانہ کے ذریعے طالبان مجاہدین پہاڑوں کی چوٹیوں پر موجود شمالی اتحاد کے مورچوں کو نشانہ بنا رہے تھے اور مورچوں میں موجود شمالی اتحاد کے افراد شدید گولہ باری کی وجہ سے مورچوں سے سر تک نہیں اٹھا سکتے تھے اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زمینی اٹیک کرنے والے طالبان مجاہدین انتہائی تیزی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے اور اچانک راستہ تبدیل کر کے ایک تعین شدہ ٹریک پر جا کر رک جاتے ہیں اور ٹریسر فائر کے ذریعہ آرٹلری (توپ خانہ) کو سگنل دیتے ہیں، سگنل وصول ہوتے ہی آرٹلری خاموش ہو جاتا ہے اور اوپر دفاع پر موجود دشمن یہ خیال کرتا ہے کہ حملہ ملتوی کر دیا گیا اس لیے وہ اس طرف سے بے غم ہو جاتے یا ان کی توجہ زیادہ تر صرف اسی طرف ہوتی جس طرف سے رات کو حملہ کیا گیا ہو۔

دوسرا حملہ صبح کاذب کے وقت کیا جاتا تھا اور طلوع صبح تک جاری رہتا تھا یہ حملہ بہت ہی بھرپور اور خطرناک انداز سے کیا جاتا ہے اس وقت حملہ سے اکثر خاطر خواہ فوائد حاصل ہوتے تھے کیونکہ یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جس میں دشمن بہت زیادہ غافل ہوتا تھا جبکہ طالبان مجاہدین رات کا یہ حصہ اللہ رب العزت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے عبادت میں گزارتے تھے۔

اب جنگ کا دوسرا اور خطرناک ترین مرحلہ شروع ہونے والا تھا اور میں مخابرہ (وائرلیس) ہاتھ میں لئے اسلام، اسلام، اسلام کی صدا لگائے ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور مسلسل رابطہ کرنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ یخ بستہ ہوا چل رہی تھی جو جسم چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی میں ہوا سے بچنے کے لیے قریب کھڑے دو میلے کے نیچے جا کر بیٹھ گیا دو میلہ چلانے والے طالبان ساتھی لمبی تان کر دو میلے کی گاڑی کے اوپر ہی سوئے ہوئے تھے دو میلے کے نیچے بیٹھ کر بھی میں مسلسل وائرلیس پر رابطہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن کہیں بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا، مجھے بہت زیادہ پریشانی لاحق ہو رہی تھی اور عجیب عجیب خدشے میرے ذہن میں کروٹیں لے رہے تھے، میں اسی سوچ و فکر میں غرق دو میلے کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک دو میلہ (اینٹی ایئر کرافٹ گن) کے چلنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں انتہائی پریشانی کے عالم میں تیزی سے دو میلے کے نیچے سے نکل آیا اور دیکھا کہ دو میلے کا آپریٹر انتہائی مہارت اور چابکدستی سے پنجشیر کی طرف فائرنگ کر رہا تھا، تقریباً ہر طرف سے دو میلوں، دوشکوں اور زیکویک گنوں کی کان پھاڑ دینے والی آوازیں آنا شروع ہو گئیں تھیں، علاوہ ازیں طالبان کے ٹینکوں اور چہل میلوں کے دھانے بھی کھل چکے تھے جو وادی پنجشیر کے پہاڑوں پر آگ برسا رہے تھے، اب جنگ اپنے پورے جوبن پر تھی دشمن کے ٹینک اور مارٹر توپیں بھی حرکت میں آ چکی تھیں جو مسلسل طالبان کی پوزیشنوں پر گولہ باری کر رہی تھیں، جنگ اپنی تمام تر ہولناکیوں اور شدت کے ساتھ جاری تھی اور کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، فضاء میں پھیلی ہوئی بارود کی بو ماحول کو گھٹن آلود بنا رہی تھی، اسی اثناء میں میں جلدی جلدی اپنی گاڑی کے پاس چلا گیا جہاں پر شاہد بھائی بھی گاڑی سے باہر کھڑے ہوئے حالات کا جائزہ لے رہے تھے جب میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے فوراً مجھ سے پوچھا کہ، حامد بھائی رابطہ ہوا یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میرے مسلسل آن لائن رہنے کے باوجود ابھی تک کوئی رابطہ نہیں ہو سکا اللہ خیر کرے نجانے کیا وجہ ہے کہ رابطہ نہیں ہو رہا، شاہد بھائی بھی کافی پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ آؤ افغانی طالبان ساتھیوں سے معلومات کرتے ہیں، چنانچہ ہم دونوں تھوڑے فاصلہ پر کھڑے ملا محب اللہ اخوندزادہ کے ساتھیوں کے پاس چلے گئے اور ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہماری طرح ان کا بھی کوئی رابطہ نہیں ہو رہا۔

اب دشمن کی طرف سے فائر کیے گئے مارٹر کے گولے ہمارے اردگرد گرنا شروع ہو چکے

تھے جس کی وجہ سے ہمارے سمیت تمام افغانی طالبان نے اپنی اپنی گاڑیوں کو تیزی سے لے جا کر وہاں پر موجود بڑی بڑی عمارتوں کی اوٹ میں کھڑا کر دیا۔ شاہد بھائی نے بھی دوسری گاڑیوں سے کچھ فاصلہ پر اپنی گاڑی محفوظ جگہ پر کھڑی کر دی، ابھی ہم گاڑی کھڑی کر کے نیچے اترے ہی تھے کہ ہم نے دیکھا کہ دشمن کی طرف سے داغے ہوئے دو تین مارٹر گولے یکے بعد دیگرے عین اس جگہ پر آ کر لگے جہاں پر ہم کچھ دیر پہلے، ملا محب اللہ اخوند زادہ کے ساتھیوں کے ساتھ اپنی اپنی گاڑیوں کے ساتھ کھڑے تھے، پورا علاقہ گرد وغبار سے بھر گیا اور اس گرد وغبار میں کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی، ہم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں محفوظ رکھا۔

ہر دو طرف سے شدید گولہ باری جاری تھی جبکہ حملہ پر گئے ہوئے ساتھیوں کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات نہیں تھیں، ہم دل ہی دل میں ان کی کامیابی اور خیر خیریت سے واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے اور ہماری نظریں مسلسل سامنے والے پہاڑ پر جمی ہوئی تھیں اسی اثناء میں شاہد بھائی کو پہاڑ سے کچھ آدمی اترتے ہوئے دکھائی دیے شاہد بھائی نے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حامد بھائی وہ سامنے پہاڑ پر دیکھو کچھ آدمی نیچے اتر رہے ہیں ہوسکتا ہے یہ ہمارے ساتھی ہوں۔ اس لیے ہمیں ادھر چلنا چاہیے مبادا کوئی زخمی وغیرہ نہ ہو، میں بالکل آمادہ ہوگیا چنانچہ ہم دونوں تمام خطرات کو بالائے طاق رکھ کر گاڑی میں سوار ہو کر مطلوبہ مقام کی طرف حرکت کرنے لگے لیکن قریب کھڑے ملا محب اللہ اخوند زادہ کے ساتھی بھائی ملا عبد الحمید نے ہمیں روک کر پوچھا کہ کدھر جا رہے ہو؟ شاہد بھائی نے سامنے پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا کہ ”وہ دیکھو سامنے پہاڑ سے کچھ لوگ نیچے اتر رہے ہیں ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے ساتھی ہوں اس لیے ہم ادھر جا کر معلومات کرتے ہیں۔“ عبد الحمید بھائی نے ہمیں منع کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ گاڑی کے ساتھ ادھر نہ جائیں کیونکہ سخت گولہ باری ہو رہی ہے اور حرکت کرتی ہوئی گاڑی عام طور پر جلدی ٹارگٹ پر آ جاتی ہے میں نے جواب میں کہا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مہربانی فرمائیں گے ہم ان شاء اللہ ضرور اس طرف جائیں گے چاہے جتنا بھی خطرہ ہو، ہم آنے والے لوگوں کو گاڑی میں بٹھا کر محفوظ جگہ پر لے کر آئیں گے

کیونکہ آڑ تک پیدل پہنچتے پہنچتے ان کو کافی دیر ہو جانی تھی جو ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی، چنانچہ شاہد بھائی نے مطلوبہ سمت کی طرف گاڑی فل سپیڈ سے بھگانا شروع کر دی اور خیر خیریت کے ساتھ سامنے کی طرف سے آنے والے ساتھیوں کے قریب پہنچ گئے اور ان کو جلدی جلدی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا وہ ساتھی فوراً ڈالے میں سوار ہو گئے اور شاہد بھائی نے گاڑی کو موڑ کر پہلے والی محفوظ جگہ کی طرف دوڑانا شروع کر دیا واپسی پر دو تین گولے ہمارے قریب قریب گرے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اور پھر شاہد بھائی کی بہترین ڈرائیونگ کی وجہ سے ہم سابقہ محفوظ مقام پر خیر و عافیت سے پہنچ گئے۔ تمام افغانی طالبان ہمارے اس کام اور پھرتی پر بہت خوش ہوئے۔ وہ ساتھی جن کو ہم لے کر آئے تھے ان سے دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے رہنے والے تھے اور افغانی کمانڈر ملا نسیم کے ساتھی تھے، رات کے حملہ آور گروپ میں شامل تھے لیکن راستہ بھول کر دوسرے ساتھیوں سے بچھڑ گئے تھے اس لیے رات کو کسی پہاڑی غار میں چھپے رہے اور صبح کے آثار معلوم ہونے پر اس طرف آئے تھے۔

صبح کا اجالا ہونا شروع ہو گیا تھا چنانچہ ہم نے قریب موجود پانی کے چشمے سے وضو کیا اور نماز ادا کی، بعد ازیں ہم دوبارہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے، میں نے پھر مخابرہ (وائرلیس سیٹ) پر رابطے کی کوشش شروع کر دی لیکن تا حال کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ بہر حال دو تین گھنٹے ہم نے اس تگ و دو میں گزارے اور جب سورج طلوع ہو کر کافی اوپر آ گیا تو ہم نے اور کمانڈر محب اللہ کے ساتھیوں نے باہم مشورہ کیا اور گل بہار والے ٹریک کی طرف جو پنجشیر سے بالکل متصل تھا حرکت شروع کر دی اور جب ہم گل بہار بازار میں پہنچے تو ہمارے ساتھی جو رات اٹیک (حملے) کے لیے گئے تھے ہمیں مل گئے اور فوراً گاڑی میں سوار ہو گئے اور کمانڈر محب اللہ کے ساتھی بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے اور گاڑیوں نے واپس چاریکار کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا۔

میرے پوچھنے پر واپس آنے والے ساتھیوں میں سے ایک نے بتایا کہ ہم نے رات شمالی اتحاد کے ایک مورچے پر زبردست اور کامیاب شب خون مارا جس میں ہمیں ایک کلاشنکوف اور

بہت ساری کلاشنکوف کی گولیاں حاصل ہوئیں۔ علاوہ ازیں پکا پکایا گرما گرم کھانا اور بہت سارے انگور وہاں سے ہاتھ آئے جن کو دشمن چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا چنانچہ ہم نے کھانا تو نہیں کھایا لیکن انگوروں کو بالکل نہیں چھوڑا بلکہ چند ہی لمحوں میں سب انگوروں کا ہم سب ساتھیوں نے صفایا کر دیا بعد ازیں اس مورچہ کو خالی چھوڑ کر ہم احتیاط کے پیش نظر واپس آ گئے کیونکہ مفتوحہ مورچے کے تین اطراف پر پہاڑوں کی بلندیوں پر دشمن مورچہ زن تھا جو وہاں پر ہمیں بآسانی نشانہ بنا کر ختم کر سکتا تھا۔

الحمد للہ! ہم بغیر کسی نقصان کے بڑوں کے حکم پر واپس آئے ہیں۔ میں نے مزید سوال کرتے ہوئے اس ساتھی سے پوچھا: ''اس حملہ سے کیا صرف ہمارے ساتھی واپس آئے ہیں یا دوسرے طالبان بھی واپس آ گئے ہیں......؟ اس پر اس ساتھی نے جواب دیا کہ پہلے دوسرے کمانڈروں کے گروپ اپنے اپنے ٹریک چھوڑ کر مصلحت کے پیش نظر اور بڑوں کے حکم سے واپس آئے اس کے بعد ہمیں بھی واپس آنے کا حکم ملا جس کی تعمیل کرتے ہوئے ہم مفتوحہ مورچہ چھوڑتے ہوئے واپس آ گئے۔

بہر حال ہم واپس ''قول اردو'' (چھاؤنی) چاریکار میں تقریباً ظہر کے وقت پہنچ گئے اور جیسے ہی ہم ''قول اردو'' میں پہنچے تو ہماری جگہ محاذ جنگ پر جانے کے لیے ہمارے ساتھیوں کے دوسرے گروپ بالکل تیار بیٹھے تھے جو ہمارے پہنچتے ہی ہم سے مل کر محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو گئے جب کہ ہم نماز ظہر ادا کرنے اور کھانا کھانے کے بعد ستانے کے لیے لیٹ گئے، تقریباً دو دن تک ہم ''قول اردو'' چاریکار میں رہے اور خوب آرام کیا پھر تیسرے دن تقریباً بعد نماز عصر ہمارا قافلہ ایک بار پھر محاذ جنگ کی طرف گامزن ہو گیا۔ خوش قسمتی سے پہلے محاذوں کی طرح اس مرتبہ بھی ہماری کمان ہمارے سپریم کمانڈر اور مجاہدین کے ہر دلعزیز رہنما حضرت مولانا عبد الجبار صاحب دامت برکاتہم بنفس نفیس فرما رہے تھے اور اس وقت وہ ہمارے قافلے میں شامل تھے۔

درہ پنجشیر پر گھمسان کی جنگ

یہاں سے روانگی کے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا میں اپنی داستان میں ذکر کرنا

ضروری سمجھتا ہوں اور اس واقعہ کو ذکر کیے بغیر اپنی داستان کو نامکمل تصور کرتا ہوں کیونکہ اس واقعہ سے اطاعت امیر اور خاص طور پر دوران جنگ اطاعت امیر کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، دیکھنے کو تو یہ ایک عام سا واقعہ معلوم ہوگا لیکن سمجھنے والوں کے لیے جائے عبرت ہے۔

ہوا یہ کہ آج جب محاذ کے لیے کمانڈر حسان حبیب شہید رحمہ اللہ (جن کا ذکر ان شاء اللہ تفصیل کے ساتھ آگے آرہا ہے) تشکیل کر رہے تھے تو ایک ساتھی عتیق الرحمٰن (جو کہ گردیز افغانستان کے رہنے والے تھے اور تقریباً شروع ہی سے ہم پاکستانیوں کے مجموعے کے ساتھ چل رہے تھے) کی تشکیل کسی وجہ سے آگے محاذ پر نہ ہوئی جب کہ بھائی عتیق الرحمٰن بضد تھے کہ اس کی تشکیل محاذ پر کی جائے، کمانڈر حسان حبیب شہید رحمہ اللہ نے اس کو بہت سمجھایا کہ بھائی پیچھے "قول اردو" میں ساتھی کم ہیں اور یہاں پر بھی ساتھیوں کی ضرورت ہے اور اس کے علاوہ آپ کل ہی تو محاذ سے واپس آئے ہیں اس لیے کچھ آرام کرلیں لیکن بھائی عتیق الرحمٰن نہ مانے اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے اور افغانی طالبان ساتھیوں کے ساتھ ایک ٹینک پر بیٹھ کر محاذ جنگ کی طرف روانہ ہوگئے چنانچہ ہم بھی اس کے روانہ ہونے کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد محاذ کی جانب چل پڑے، ابھی ہم نے جبل السراج کی طرف نصف فاصلہ طے کیا تھا کہ ہم نے دور سے دیکھا کہ سڑک کے دائیں جانب ایک ٹینک الٹا ہوا پڑا تھا اور کچھ طالبان ساتھی اس ٹینک کے قریب کھڑے ہوئے تھے، ہماری گاڑی جب اس الٹے ہوئے ٹینک کے قریب پہنچی تو ڈرائیور نے وہاں پر گاڑی روک دی تو میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گاڑی سے نیچے اترا اور اس جگہ کا جائزہ لینے لگا جس جگہ پر ٹینک الٹا تھا، میں نے دیکھا کہ ٹینک ایسی جگہ سے الٹ کر گرا تھا جہاں سے عام گاڑی کے الٹنے کا اندیشہ بھی نہ تھا جب میں واپس گاڑی کی طرف جانے لگا تو اچانک میری نظر بھائی عتیق الرحمٰن پر پڑی جو دوسرے افغانی طالبان کے درمیان خود کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا چنانچہ میں فوراً اس کے پاس جا پہنچا اور اس سے پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ میرے سوال کرنے پر بھائی عتیق الرحمٰن کچھ جذباتی سے ہوگئے اور کہنے لگے کہ میں بھی اسی ٹینک پر سوار تھا جو الٹا پڑا ہے۔ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بھائی عتیق الرحمٰن نے مزید کہا کہ یہ ٹینک جو الٹا ہے اور جو یہ حادثہ پیش آیا ہے یہ

فقط میری نحوست کی وجہ سے پیش آیا ہے کیونکہ میں اطاعت امیر کو پس پشت ڈال کر ان کے منع کرنے کے باوجود اپنی مرضی کرتے ہوئے ان ساتھیوں کے ساتھ مل کر محاذ جنگ کی طرف جا رہا تھا اور اطاعت امیر نہ کرنے ہی کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا ہے وگرنہ جہاں سے ٹینک گرا ہے وہاں سے عام چھوٹی گاڑی کے گرنے کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے دوبارہ اس سے پوچھا کہ اس حادثہ میں کوئی ساتھی شہید یا زخمی تو نہیں ہوا؟ اس پر اس نے جواب دیا کہ کوئی ساتھی شہید تو نہیں ہوا البتہ کچھ ساتھیوں کو معمولی زخم آئے ہیں جو زیادہ خطرناک نہیں ہیں جبکہ اکثر ساتھی جب ٹینک الٹنے لگا تو سپیڈ کم ہونے کی وجہ سے چھلانگیں لگا کر ٹینک سے اتر گئے تھے۔

عتیق الرحمٰن پشیمان ہوتا ہوا اور اپنے آپ کو کوستا ہوا یہیں سے واپس چاریکار کی طرف روانہ ہوگیا جبکہ میں اور دوسرے ساتھی اپنی اپنی گاڑیوں پر بیٹھ کر اپنی مطلوبہ منزل کی طرف گامزن ہوگئے اور گلبہار جا کر ایک مسجد میں نماز عشاء ادا کی۔ ہمیں رات اسی مسجد میں قیام کرنے کا حکم ملا جبکہ کمانڈر ملا محب اللہ اخوند زادہ اور ان کے ساتھی آگے محاذ جنگ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہمارے ساتھیوں کا ایک گروپ پہلے ہی محاذ جنگ پر پہنچ چکا تھا، جس مسجد میں ہم نے رات گزارنے کے لیے قیام کیا تھا وہ بالکل دریا کے کنارے ایک اونچی جگہ پر بنی ہوئی تھی اور یہ دریا مسجد کے قبلہ رخ کی طرف سے یعنی مسجد کے محراب کی طرف سے شور کرتا ہوا گزر رہا تھا جبکہ مسجد کے باہر دائیں جانب ایک راستہ کاپیسا کے شہر کی طرف جا رہا تھا اور بائیں جانب جانے والی کچی سڑک آگے جا کر دو راستوں میں تقسیم ہو رہی تھی ایک راستہ جبل السراج کی طرف جا رہا تھا جبکہ دوسرا راستہ گلبہار کے بازار سے ہوتا ہوا وادی پنجشیر کی طرف جاتا تھا، مسجد کے صحن کے سامنے مشرق کی جانب پنجشیر کے پہاڑوں سے ہوتے ہوئے ٹریسر فائر صاف دکھائی دے رہے تھے اس کے علاوہ وقفہ وقفہ سے ہونے والے ٹینکوں، مارٹر توپوں اور چہل میلوں کے گولوں کے دھماکوں سے مسجد و اردگرد کی عمارتیں لرز رہی تھیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگ میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی رات ہم نے توپوں کی گھن گرج میں باری باری پہرہ دیتے اور سوتے ہوئے گزاری جبکہ صبح ہوتے ہی نماز پڑھنے اور پھر بعد میں ناشتہ سے

فارغ ہونے کے بعد ہم نے میدان جنگ کا رخ کیا اور ایک جگہ درختوں کے قریب جا کر گاڑیوں سے اتر گئے اور گاڑیوں کو محفوظ اوٹ میں کھڑا کر دیا گیا، سب ساتھی کمانڈر صاحب کے حکم پر اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے منتشر ہو کر ایک دوسرے سے دور دور کھڑے ہو گئے اور حکم ثانی کا انتظار کرنے لگے۔ جنگ چونکہ جاری تھی اور دفاع پر موجود آرٹلری (توپ خانہ) دونوں طرف سے آگ برسا رہا تھا اور سارا علاقہ توپوں کے مہیب دھماکوں سے گونج رہا تھا اس لیے یہاں پر موجود ہر آدمی اس کھلے میدان کو چھوڑ کر کسی محفوظ جائے پناہ کی تلاش میں تھا چنانچہ ہم سب ساتھیوں کو بھی قریب موجود ایک کارخانے کے تہہ خانے میں جانے کا حکم ملا، حکم ملتے ہی ہم تمام ساتھی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ تہہ خانے میں پہنچ گئے جہاں پر پہلے سے بہت سارے طالبان ساتھی موجود تھے۔

مغرب تک ہم سب ساتھی اسی تہہ خانے میں رہے یہ تہہ خانہ کوئی جنگی بنکر وغیرہ نہیں تھا بلکہ کوئی کارخانہ یا شہر میں پانی کی سپلائی کا مرکز تھا کیونکہ تہہ خانے کے اندر بہت بڑے بڑے پائپ نصب تھے۔ مغرب کے قریب ہم سب ساتھی کمانڈر صاحب کے حکم پر دوبارہ پہلی والی جگہ پر آ گئے اور ایک احاطہ کی چار دیواری کے قریب ایک دوسرے میں فاصلہ رکھ کر بیٹھ گئے اور وہیں پر نماز مغرب ادا کی، تھوڑی دیر بعد ایک بائی فور ڈالا انتہائی تیز رفتاری سے آ کر ہمارے قریب رکا، گاڑی کے رکتے ہی ملا مرجان جو کہ کمانڈر ملا محب اللہ اخوندزادہ کا نائب تھا گاڑی سے نکلا اور ساتھیوں کو آوازیں دینے لگا، ملا مرجان کے جلدی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت دشمن کی طرف سے مسلسل اور خطرناک حد تک تیز گولہ باری ہو رہی تھی اور گاڑی کا میدانی علاقہ کو عبور کر کے یہاں تک پہنچنا بھی کسی معجزہ سے کم نہ تھا چنانچہ کچھ ساتھی دوڑ کر گاڑی کی طرف گئے جہاں پر کمانڈر ملا مرجان چادر میں لپٹی ہوئی روٹیاں لئے کھڑا تھا اس نے ساتھیوں کی تعداد کے مطابق روٹیاں گن کر ساتھیوں کے حوالے کر دیں اور دوسری چادر میں لپٹے ہوئے خشک گوشت کی طرف متوجہ ہوا، ابھی اس نے گوشت والی چادر اٹھائی ہی تھی کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا، دھماکے کی آواز پر جنگی اصولوں کے مطابق سب ساتھی جہاں تھے وہیں پر لیٹ گئے۔ پورا علاقہ گرد و غبار سے بھر گیا فضا جو پہلے ہی بارود کی بو سے اٹی ہوئی تھی اب مزید دو چند ہو گئی

میں ایک طرف لیٹا چند لمحہ پیشتر ہونے والے دھماکے سے ہونے والے نقصانات کے متعلق سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں ساتھیوں کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے اس دھماکے کے نتیجہ میں کوئی ساتھی زخمی یا شہید نہ ہوا ہو۔

جب گرد و غبار کے بادل چھٹ گئے تو میں کپڑے جھاڑتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا دوسرے ساتھی بھی اپنی اپنی جگہوں پر احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے کھڑے ہو چکے تھے، ساتھیوں کی خیر خیریت دریافت کرنے کے بارے میں میں بہت بے چین تھا، چنانچہ میں دوسرے ساتھیوں کے پاس گیا جو دھماکہ ہونے والی جگہ کے زیادہ قریب تھے میں نے ان کے پاس پہنچتے ہی سوال کیا کہ کوئی ساتھی شہید یا زخمی تو نہیں ہوا؟ ان ساتھیوں میں سے ایک نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاکستانی ساتھیوں میں سے کوئی شہید یا زخمی نہیں ہے البتہ ایک افغانی طالب گرنے والے مارٹر کے گولے کے چھروں کی زد میں آ کر شدید زخمی ہو گیا ہے اسے دوسرے طالبان ساتھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ملا کمانڈر مرجان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ساتھی جو تھوڑی دیر قبل زخمی ہوا تھا وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا ہے۔

یہ رات ہم نے یہیں پر گزاری اور اگلے دن ظہر کے بعد اسی جگہ سے پنجشیر پر حملہ شروع ہوا جس میں ملا محب اللہ اخوندزادہ اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ ہم سب ساتھی بھی مجاہدین کے ہردلعزیز کمانڈر حضرت مولانا عبدالجبار صاحب دامت برکاتہم کی کمان میں شامل تھے، اس طرف کے محاذ کی مرکزی کمان کمانڈر ملا محب اللہ کے ہاتھ میں تھی، تمام ساتھی اپنے اپنے گروپ میں کمانڈروں کی کمان میں رہتے ہوئے اور اپنی اپنی پوزیشنوں کو برقرار رکھتے ہوئے انتہائی محتاط انداز میں پہاڑ پر چڑھ رہے تھے اور شاہینوں کی طرح اس شعر کا مصداق:

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

ہم دشمن پر جھپٹنے کے لیے پر تولتے ہوئے راستے کی ہر مشکل کو عبور کرتے ہوئے انتہائی خاموشی کے ساتھ آگے بڑھے چلے جا رہے تھے، ہر ساتھی شوق شہادت کے جذبہ سے سرشار اور

استقامت کا کوہ گراں معلوم ہو رہا تھا۔ اگرچہ راستہ انتہائی دشوار گزار تھا کیونکہ جس پہاڑ پر ہم حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے یہ نرم بجری والا پہاڑ تھا ایک قدم اوپر چڑھتے تھے تو دو قدم پیچھے سلپ ہو کر آنا پڑتا تھا مگر تمام ساتھی راستے کی ہر مشکل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گویا زبان حال سے یہ کہتے ہوئے:

وہ سنگ گراں جو حائل ہے رستے سے ہٹا کر دم لیں گے
ہم راہ وفا کے رہرو ہیں منزل ہی پہ جا کر دم لیں گے

آگے ہی آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ آج کا یہ حملہ معمول کے حملوں سے قدرے مختلف تھا کیونکہ اس حملہ میں تا حال آرٹلری سے مدد نہیں لی جا رہی تھی اور آرٹلری کے تمام گروپ بالکل خاموش تھے، اصل میں اس حملہ میں پلان یہ طے ہوا تھا کہ بے خبری میں دشمن پر دھاوا بول کر درہ پنجشیر میں داخلے کے راستے کو ہموار کیا جائے اس لیے ہم سب ساتھیوں کو بھی مرکزی کمانڈر ملا محبّ اللہ اخوندزادہ کی طرف سے یہ ہدایات ملی تھیں کہ اس حملہ میں بالکل خاموشی اختیار کی جائے تاکہ اس سے خاطر خواہ نتائج حاصل ہو سکیں اس لیے تمام ساتھی انتہائی خاموشی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارا گروپ کمانڈر حذیفہ کی کمان میں دائیں جانب سے تقریباً سب سے آگے تھا۔

حملہ کی ابتداء میں ہمیں اس بات سے بھی آگاہ کیا گیا تھا کہ یہ سارا پہاڑ اور ارد گرد کے تمام پہاڑ مائینوں (بارودی سرنگوں) سے بھرے ہوئے ہیں اس لیے ساتھی پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے، سب سے آگے والا ساتھی جس جگہ پر قدم رکھتا تھا تو پیچھے آنے والے تمام ساتھی عین اسی جگہ پر قدم رکھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔

ہم دشمن کے بالکل سر پر پہنچ چکے تھے اور اب دشمن ہم سے تقریباً ۷۰۔۸۰ میٹر کے فاصلہ پر رہ گیا تھا اور اب تک دشمن ہم سے بالکل بے خبر تھا جبکہ ہم وہاں ابھری ہوئی بڑی بڑی چٹانوں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر مزید ہدایات کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک ہماری دائیں طرف جہاں سے ملا محبّ اللہ اخوندزادہ کا ایک گروپ انتہائی محتاط انداز میں دشمن کی جانب بڑھتا جا رہا تھا وہاں مائن پھٹنے کا ایک زوردار دھماکہ ہوا، دفعتاً سب ساتھی جہاں جہاں تھے وہیں پر

لیٹ گئے میں بھی اپنی جگہ لیٹا دھماکے والی جگہ کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہمارا ایک ساتھی جو کہ مائن پھٹنے والی جگہ کے قریب تھا نے اپنی دانست میں ہمدردی کرتے ہوئے شور مچانا شروع کر دیا، کمانڈر صاحب ایک ساتھی مائن پر آ گیا ہے...... ایک ساتھی زخمی ہو گیا ہے...... اس کو پکڑو...... اس کو اٹھاؤ......

ہم تو پہلے ہی اس ساتھی کی طرف متوجہ تھے لیکن اس ساتھی کے شور شرابے نے قریب ہی چند میٹر کی اونچائی پر موجود مورچہ زن دشمن کو بھی ہماری طرف متوجہ اور انتہائی چوکنا کر دیا۔ وہ ساتھی جو مائن پر آیا تھا اسے کچھ ساتھی اٹھا کر انتہائی تیز رفتاری سے نیچے کی طرف روانہ ہو گئے لیکن مائن پر آنے والا ساتھی راستہ ہی میں شہید ہو کر اپنی دیرینہ آرزو تک پہنچ گیا اور جنت الفردوس کا راہی ہو گیا، شہید ہونے والے افغانی طالب کا اصل نام تو مجھے معلوم نہ ہو سکا، لیکن وہ خونخوار کے نام سے سب ساتھیوں میں مشہور تھا اس لیے اسی نام سے اس کا تذکرہ کرتا ہوں، بھائی عبدالحمید جو کہ ملا محب اللہ کا ساتھی تھا نے خونخوار کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے بتایا تھا کہ خونخوار پرانے طالبان ساتھیوں میں سے تھا اور انتہائی شریف النفس اور بہت ہی سادہ طبیعت کا مالک تھا اور بہت ہی کم گو تھا اور اکثر محاذوں پر ہی رہتا تھا شہادت کا بہت ہی زیادہ متمنی تھا اکثر شہادت کے لیے دعائیں کیا کرتا تھا۔ قصہ چل رہا تھا، دھماکے اور شور شرابے سے دشمن کے متوجہ ہونے کا، تو جیسے ہی دشمن جو کچھ دیر پہلے تک بالکل بے خبر تھا نے دھماکے اور شور کی آوازیں سنیں تو اس نے گنوں کے دھانے ہماری طرف کھول دیے اور ہم پر آگ برسانا شروع کر دی اب اوپر دشمن کے جتنے بھی مورچے تھے سب کی گنوں کا رخ ہماری طرف تھا اور ہم چٹانوں کی اوٹ میں انتہائی مشکل حالات میں اپنے دفاع کی کوشش کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ جوابی فائرنگ بھی کر رہے تھے لیکن اب آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا ہوتے جا رہے تھے کہ جن حالات میں ظاہری طور پر ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ اس محاذ پر موجود کوئی آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا لیکن پھر بھی سب ساتھی ہمت اور استقامت کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے اور کمانڈر صاحب کی ہدایت پر سنگل سنگل فائر کر رہے تھے اور خود کو اس مشکل سے نکالنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن تا حال یہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ دشمن کی طرف سے

فائرنگ کا سلسلہ ہر لمحے تیز تر ہوتا جا رہا تھا اور اس قدر شدید فائرنگ ہو رہی تھی کہ ہم میں سے کسی بھی ساتھی کو سر اٹھانے تک کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

ابھی ہم سب ساتھی اپنے اپنے طور پر اس مشکل سے خود کو نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے کہ ایک نئی افتاد ہمارے اوپر آن پڑی جس نے پہلے سے موجود مشکل ترین حالات کو مزید دو چند کر دیا۔ ہوا یہ کہ پہلے تو صرف دشمن ہی کی طرف سے ہمیں گولیوں کا سامنا تھا لیکن اب نیچے ہمارے اپنے ساتھی طالبان نے بھی غلط فہمی سے ہمارے اوپر فائر کھول دیے جس کی وجہ سے ہم سب ساتھی خود کو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا ہوا محسوس کر رہے تھے جبکہ اس محاذ کے کمانڈر ملا محب اللہ اخوند جو اوپر ہمارے ساتھ ہی موجود تھے مخابرے (وائرلیس) پر چیخ چیخ کر نیچے موجود طالبان کو بتا رہے تھے کہ یہ ہم لوگ ہیں...... فائر بند کرو...... لیکن نیچے موجود طالبان میں سے کوئی بھی ساتھی کال وصول نہیں کر رہا تھا جب کہ حالات لمحہ بہ لمحہ مخدوش ہوتے جا رہے تھے اور ساتھیوں کے پاس ایمونیشن بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا جبکہ اوپر دشمن کی طرف سے اور نیچے اپنے ساتھیوں کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری تھا۔

کافی دیر بعد نیچے دفاع والے ساتھیوں کو حقیقت حال معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنے اسلحہ کا رخ اوپر دشمن کی طرف پھیر دیا تو ہمیں کچھ سکون حاصل ہوا تاہم اوپر دشمن کی طرف سے تاحال ہمارے اوپر گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی جس کی وجہ سے اوپر کی طرف چڑھنا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ دشمن اوپر اونچائی پر چھپ کر بیٹھا ہماری ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا اس لیے مجبوراً ہمیں یہاں سے پسپائی اختیار کرنا پڑی جس کا حکم ہمیں کمانڈر ملا محب اللہ کی طرف سے مل چکا تھا چنانچہ ہم محتاط طریقہ سے پسپا ہوتے ہوئے پہاڑ سے نیچے اتر آئے اور اپنے ٹریک پر پہنچ گئے جہاں پر پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارا ایک ساتھی ذوالفقار جس کا تعلق برطانیہ سے تھا موجود نہیں ہے معلومات کرنے پر معلوم ہوا کہ ذوالفقار کافی دیر پہلے سے غائب ہے بعد ازاں اس گم شدہ ساتھی کو بہت تلاش کیا گیا لیکن وہ نہ ملا اور آج تک مجھے اس ساتھی کے بارہ میں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ زندہ ہے یا شہید ہو چکا ہے بہر حال ہم اپنے اس جنگی ٹریک سے واپس چاریکار کی طرف چل پڑے۔

چاریکار، کاپیسا، جبل السراج اور سالنگ کے علاقوں میں حالات دن بدن مخدوش تر ہوتے جا رہے تھے، ایک دن چاریکار چوک میں دن دیہاڑے اور بھرے بازار میں کسی نامعلوم شخص نے ایک طالب کو گولی مار کر شہید کر دیا حالانکہ طالبان ان علاقوں میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے لیکن طالبان نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی اور مقامی باشندوں کے ساتھ انتہائی اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا، ان کی ہر بداخلاقی کا جواب طالبان ہمیشہ اخلاق کے ساتھ دیتے رہے جن کی کئی مثالیں روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہیں۔ ایک معمولی سا واقعہ جو ہمارے ساتھ ''قول اردو'' چاریکار میں پیش آیا تحریر کر رہا ہوں اس سے طالبان کے اعلیٰ اخلاق، بردباری اور دشمن کے ساتھ عفو ودرگزر کے معاملے کا پتہ چلتا ہے۔

ہوا یہ کہ ہم چند ساتھی عمارت کے سامنے گراسی پلاٹ میں چہل قدمی کرتے پھر رہے تھے کہ ایک ساتھی کی نظر دو آدمیوں پر پڑی، اس ساتھی نے دوسرے ساتھیوں کو بھی ان مشکوک آدمیوں کی طرف متوجہ کیا جو شکل وصورت سے اسی علاقہ کے باسی معلوم ہو رہے تھے ہم سب ساتھیوں کو تشویش لاحق ہوئی کہ یہ دو آدمی دشمن کی طرف سے آئے ہوئے نہ ہوں اور مبادا طالبان کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اس خطرہ کے پیش نظر ہم انتہائی سرعت کے ساتھ ان مشکوک افراد کی طرف بڑھے اور پلک جھپکنے میں وہ دونوں مشکوک آدمی ہمارے نرغے میں تھے، ہم نے ان سے اخلاق کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ دونوں لیت ولعل سے کام لینے لگے اور کچھ نخرے دکھانے لگے، بار بار استفسار پر بھی جب ان کی طرف سے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تو ہم نے ان کی پٹائی شروع کر دی اور چند ہی لمحوں میں ان کو ادھ موا کر دیا۔

شور شرابا سن کر عام طالبان کے ساتھ کچھ اور طالبان کمانڈر بھی وہاں پر آ موجود ہوئے اور ہم سے شور شرابے اور جھگڑے کی وجہ دریافت کرنے لگے، جواب میں ہم نے ساری صورتحال سے ان کو آگاہ کر دیا جس پر طالبان کے ایک بڑے کمانڈر سیف الرحمٰن منصور نے ہمیں خوب ڈانٹا اور کہا کہ کسی بھی شخص کے ساتھ محض شک کی بنیاد پر ایسا سلوک کرنا بالکل جائز نہیں ہے حالات جیسے بھی ہوں ہمیں صبر اور حوصلہ سے کام لینا ہوگا، انہوں نے مزید کہا کہ ہم

ظلم وستم کے اندھیروں کو ختم کرنے کے لیے نکلے ہیں نہ کہ ظالموں کی پیروی کرنے کے لیے، میں آپ لوگوں کو تنبیہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس قسم کے حالات پیدا نہیں ہونے چاہئیں اگر آپ کو کوئی مشکوک آدمی نظر آتا ہے تو آپ ہمیں اطلاع دیں۔

اس معمولی سے واقعہ سے طالبان کی بلند حوصلگی، صلہ رحمی، درگزر اور بلند پایہ اخلاق کا پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف طالبان کے خلاف سازشوں کے جال بنے جارہے تھے اور چاریکار کے اطراف میں کئی جگہوں پر تلاشی پر مامور طالبان کو نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی گئی جبکہ دوسری طرف طالبان ہر حالت میں عفوودرگزر کی تلقین کرتے نظر آتے تھے۔

ان علاقوں کے حالات دن بدن عجیب اور خطرناک صورت حال اختیار کرتے جارہے تھے، آئے دن کبھی کسی علاقے میں تہہ خانوں میں چھپے ہوئے دشمن کے مسلح لوگ تہہ خانوں سے نکل کر حالات کو خراب کرنے کی کوشش کرتے کبھی کسی علاقے میں......! طالبان احسن طریقے سے حالات کو قابو میں رکھنے اور امن وامان کو بحال رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

ایک دن میں ایک ساتھی (جسے ساتھی چنگیز خان کہہ کر پکارتے تھے) کے ساتھ چھاؤنی سے گورنر ہاؤس گیا، چنگیز خان اور کچھ دوسرے ساتھی صوبہ پروان کے گورنر ملا قاری جلال زئی کے گروپ میں شامل تھے چنانچہ گورنر ہاؤس میں میری ملاقات ملا قاری جلال زئی سے ہوئی جو بہت تپاک سے مجھے ملے اور بہت خوش ہوئے اور مجھے چنگیز خان اور دوسرے ساتھیوں کی طرح اپنے گروپ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس دن جب میں گورنر ہاؤس کی عمارت میں تھا، سالنگ کے ایک گاؤں میں ایک المناک اور دلخراش واقعہ پیش آیا جس نے سب طالبان کو ہلا کر رکھ دیا۔

جبل السراج میں بغاوت

واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ جس دن میں چنگیز خان کے ساتھ گورنر ہاؤس آیا تھا عین اسی دن صبح فجر کے وقت سالنگ کے ایک گاؤں میں طالبان مجاہدین کا ایک دستہ نماز فجر میں مشغول تھا کہ اسی علاقے میں چھپے ہوئے دشمن کے لوگوں نے فائرنگ کرکے نماز پڑھتے ہوئے سب طالبان کو زخمی کردیا بعدازاں تمام زخمی طالبان کو پکڑ پکڑ کر ذبح کرکے شہید کردیا۔ رات گئے

تک طالبان شہداء کی لاشیں گورنر ہاؤس چاریکار میں لائی جاتی رہیں اور شناخت کے بعد ان شہیدوں کی نعشوں کو گاڑیوں میں ڈال کر ان کے علاقوں کی طرف روانہ کیا جاتا رہا شہداء کی ساری لاشوں کو میں نے خود دوسرے طالبان مجاہدوں کے ساتھ مل کر گاڑیوں میں منتقل کیا شہداء کے اجساد سے ایسی خوشبو آتی تھی کہ ایسی خوشبو میں نے شہداء کے اجساد کے علاوہ کہیں اور محسوس نہیں کی اور کئی دن تک وہ خوشبو مسلسل میرے ہاتھوں سے آتی رہی۔

اگلے دن چاریکار شہر میں طالبان نے ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں مقامی علماء کرام کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں عوام نے شرکت کی، قاری جلال زئی جو پروان میں طالبان کی طرف سے گورنر تھے نے جلسہ سے خطاب کیا، خطاب کے بعد علماء کرام اور عوام نے قاری جلال زئی کے ہاتھ پر امیر المومنین کی اطاعت میں رہتے ہوئے اسلامی نظام کو اپنانے کی بیعت کی، جلسہ کے بعد قاری جلال زئی صاحب نے واپس گورنر ہاؤس آ کر چنگیز خان اور دوسرے ساتھیوں کی بگرام کی طرف محاذ پر تشکیل کر دی، قاری جلال زئی صاحب مجھے بھی اپنے گروپ میں شامل کر کے ان ساتھیوں کے ساتھ بگرام بھیجنا چاہتے تھے لیکن میں نے معذرت کے ساتھ ان کو بتایا کہ فی الحال میں کمانڈر مولانا عبد الجبار صاحب دامت برکاتہم کی تشکیل میں چل رہا ہوں اس پر انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور کہنے لگے کہ جب بھی آپ کو وقت ملا کرے میرے پاس آ جایا کرو، میں نے ان سے وعدہ کیا کہ مجھے جب بھی وقت ملا کرے گا میں ضرور حاضر ہوا کروں گا بعد ازاں میں نے ان سے اجازت لی اور بگرام کی طرف جانے والے ساتھیوں کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور گاڑی جب چھاؤنی کی عمارت کے پاس پہنچی تو میں چنگیز خان اور دوسرے ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی سے اتر گیا اور عمارت میں موجود اپنے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا۔

اب صوبہ پروان اور کاپیسا کے حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ بظاہر ان علاقوں پر کنٹرول رکھنا بہت ہی دشوار نظر آ رہا تھا کیونکہ آئے روز مختلف علاقوں سے شورش برپا ہونے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں لیکن پھر بھی طالبان بہترین حکمت عملی سے ہر اٹھنے والی بغاوت اور شورش کو کچل رہے تھے اور حالات پر امن رکھنے کی مکمل کوشش کر رہے تھے اور یہی وہ حالات

ہیں جو آگے چل کر ہماری گرفتاری کا سبب بنے، ہم عصر کی نماز سے فارغ ہو کر کمرے میں بیٹھے باہم گفتگو میں مصروف تھے کہ اچانک ایک ساتھی غالباً ناصر جھنگوی شہید رحمہ اللہ کمرے میں داخل ہوا جو کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا، استفسار کرنے پر بھائی ناصر جھنگوی شہید رحمہ اللہ نے بتایا کہ جبل السراج میں چاریکار روڈ پر دشمن نے قبضہ کرلیا ہے اور طالبان کی بہت سی گاڑیاں سڑک پر ہی نذر آتش کردی ہیں یہ خبر سب ساتھیوں پر بجلی بن کر گری کیونکہ خط سالنگ اور گل بہار کی طرف تھا اور سب طالبان ساتھیوں کے شہید یا گرفتار ہونے کا خدشہ تھا چنانچہ طالبان کے محفوظ دستے فوراً حرکت میں آگئے جنہوں نے فوراً جبل السراج کی طرف پیش قدمی شروع کردی اور دشمن کو پل مٹک سے بھی پرے تک دھکیل دیا یہ ساری جنگ سڑک اور ارد گرد کی فصلوں میں لڑی جارہی تھی، نماز مغرب کے بعد کمانڈر ملا محب اللہ اخوندزادہ ہمارے اوطاق میں آئے اور کہا کہ مجھے چند ساتھی گزمے (پٹرولنگ) کے لیے چاہئیں چنانچہ انہوں نے خود ہی تقریباً آٹھ دس ساتھیوں کا انتخاب کیا، جن میں راقم، بھائی چترالی، بھائی سیف اللہ خالد، بھائی فیصل خلجی، بھائی قاسم (شہید) اور کچھ دیگر ساتھی بھی شامل تھے، ہم کمانڈر صاحب کی معیت میں عمارت سے باہر آئے جہاں پر کمانڈر صاحب کے اپنے ساتھی بالکل تیاری پوزیشن میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ ہم بھی وہاں پر پہلے سے موجود کمانڈر صاحب کی گاڑی میں سوار ہوگئے، ہمارے سوار ہوتے ہی گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے حرکت میں آگئیں اور چند لمحوں میں گاڑیاں جبل السراج روڈ پر جبل السراج کی طرف دوڑ رہی تھیں، شہر سے باہر نکلتے ہی یکے بعد دیگرے دونوں گاڑیاں رک گئیں اور فرنٹ سائڈ سے کمانڈر صاحب برآمد ہوئے اور سب ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

”سب ساتھی اپنی اپنی گنوں کو لوڈ کرلیں اور سیفٹی لاک ہٹا کر پوزیشنوں میں ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ یہ سارا علاقہ تقریباً عصر تک دشمن کے قبضہ میں تھا اگرچہ یہ علاقہ دشمن سے خالی کرالیا گیا ہے لیکن پھر بھی احتیاط بہت ضروری ہے مبادا کوئی ادھر ادھر چھپا ہوا دشمن ہمیں غافل پا کر نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔“

یہ ہدایات دینے کے بعد کمانڈر صاحب گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑیاں پھر محو سفر ہوگئیں،

شہر سے باہر نکلنے کے بعد جبل السراج روڈ پر کافی سفر طے کرنے کے بعد گاڑیاں ایک پل پر جا کر رک گئیں، آگے والی گاڑی سے کمانڈر محب اللہ اخوندزادہ صاحب باہر نکلے اور ہمیں گاڑی سے نیچے اترنے کا حکم دیا چنانچہ ہم سب ساتھی گاڑی سے نیچے اتر آئے تو کمانڈر صاحب نے ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ آپ سب ساتھی اس پل کے نیچے پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ جائیں اور اگر آپ دیکھیں کہ طالبان کی گاڑیاں جبل السراج کی طرف سے واپس چاریکار کی طرف آرہی ہیں تو آپ حضرات کسی بھی گاڑی کو ہاتھ دے کر روکیں اور اس میں بیٹھ کر چاریکار کی طرف روانہ ہو جائیں اور ان شاء اللہ ہم لوگ راستے میں ہی آپ لوگوں سے آن ملیں گے، یہ ہدایات دینے کے بعد کمانڈر صاحب دونوں گاڑیوں سمیت اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جبل السراج کی طرف محوِ سفر ہو گئے جبکہ ہم سب ساتھی کمانڈر صاحب کی ہدایات کے مطابق پل کے نیچے جا کر تیاری پوزیشن میں بیٹھ گئے۔ اندھیرے کی دبیز چادر نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا اور ہر طرف ہو کا عالم تھا، ہم سب ساتھی پل کے قریب قدرے نشیب والی جگہ پر پوزیشنیں سنبھالے بیٹھے تھے اور اردگرد پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے، ہمارے قریب قریب کسی انسان کا وجود بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن پھر بھی تھوڑے سے کھٹکے پر سب چوکنے ہو جاتے، ہم سب ساتھی بالکل خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے اور اگر کوئی بات کرنا ہوتی تو فقط اشاروں میں کرتے تھے یہ سب احتیاطی تدابیر اس لیے ہو رہی تھیں کہ کچھ دیر پہلے تک یہ پورا علاقہ دشمن کے فوجیوں سے بھرا ہوا تھا اب اگرچہ یہ سارا علاقہ دشمن سے خالی کرالیا گیا تھا لیکن پھر بھی بہر حال یہ خطرہ بعید از قیاس نہیں تھا کہ دشمن کے کچھ لوگ یہاں چھپے ہوئے ہوں۔

ہمارے گروپ کا امیر چترال کا رہنے والا تھا جس کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن وہ چترالی بھائی کے نام سے ساتھیوں میں مشہور تھا اور اس وقت سب سے زیادہ متفکر وہی نظر آ رہا تھا کیونکہ تھوڑا سا کہیں کھٹکا ہوتا تو تمام ساتھی چترالی بھائی کی طرف دیکھتے اور اشاروں میں پوچھتے کہ یہ آواز جو سنی گئی ہے یہ کیا ہے؟ کوئی دشمن تو ہماری طرف نہیں آ رہا وغیرہ، اکثر ساتھی محض وقت گزاری کے لیے مذاق میں اسی طرح کے اشارے کر رہے تھے لیکن چترالی بھائی سچ مچ متفکر ہو جاتے اور رکوع کی حالت میں چل پھر کر ادھر ادھر کا جائزہ لے کر سب ٹھیک ہے کا اشارہ کر کے پھر اپنی

جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے ہمیں اس جگہ بیٹھے کافی دیر گزر چکی تھی اور ہم سب کی نظریں سامنے جبل السراج کی طرف سے آنے والے راستے پر لگی ہوئی تھیں، لیکن ہنوز سڑک پر دور دور تک کسی گاڑی کا نام ونشان بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا اچانک ایک ساتھی نے بہت دور سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا وہ سامنے کچھ لائٹیں حرکت کر رہی ہیں، سب ساتھی اس طرف دیکھنے لگے واقعتاً دور سے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹیں چراغوں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ سب ساتھی اپنی اپنی جگہ پر الرٹ ہو گئے گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے ہماری طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں، جب گاڑیاں واضح نظر آنے لگ گئیں تو ساتھیوں نے اٹھ کر سڑک کی طرف جانا چاہا لیکن ایک ساتھی سیف اللہ شہید نے سب ساتھیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ابھی سڑک کی طرف نہیں جانا چاہیے کیونکہ کیا خبر یہ آنے والی گاڑیاں طالبان کی ہیں یا دشمن بڑھا چلا آ رہا ہے، سیف اللہ کی یہ باتیں سن کر تمام ساتھی پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور گاڑیوں کی طرف دیکھنے لگے گاڑیاں اب بہت ہی قریب آ چکی تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے دو تین گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے ہمارے سامنے سے گزر گئیں تو ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ گزرنے والی گاڑیاں طالبان ہی کی تھیں چنانچہ سب ساتھیوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ سڑک پر چلنا چاہیے کیونکہ گاڑیاں جس رفتار سے آ رہی تھیں تو ہمیں یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں دشمن پیچھے نہ آ رہا ہو چنانچہ تمام ساتھی انتہائی تیزی مگر احتیاط کے ساتھ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے سڑک کی طرف بڑھنے لگے ہمارے سڑک تک پہنچتے پہنچتے ایک دو گاڑیاں مزید انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گزر گئیں۔ گاڑیوں کی یہ تیز رفتاری ہمیں کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ معلوم ہو رہی تھی اسی خطرہ کے پیش نظر سب ساتھی انتہائی سرعت کے ساتھ سڑک پر پہنچ گئے ابھی ہم سڑک کے کنارے آ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ ایک اور گاڑی شاں کر کے ہمارے ہاتھ دینے کے باوجود فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئی اور پھر چند لمحوں کے بعد مزید ایک گاڑی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی گزر گئی۔ اب ہماری تشویش مزید دو چند ہو گئی کہ گاڑیاں رک کیوں نہیں رہیں، اسی طرح دو تین اور گاڑیاں برق رفتاری کے ساتھ ہمارے قریب سے گزر گئیں اور ہم ہونقوں کی طرح ہاتھ اٹھائے انتہائی پریشانی کے عالم میں اور بے بسی کے ساتھ گاڑیوں کو گزرتا

ہوا دیکھتے رہ گئے۔

چاریکار میں بغاوت

آخر کار کافی گاڑیاں گزرنے کے بعد ایک گاڑی ہمارے قریب آ کر رکی اور گاڑی میں موجود طالبان نے ہمیں جلدی جلدی گاڑی میں سوار ہونے کیلئے کہا ہمارے سوار ہوتے ہی گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا سے باتیں کرنے لگی اور چند ہی لمحوں میں چاریکار گیٹ پر پہنچ کر رک گئی کیونکہ وہاں پر پہلے سے بھی کچھ گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈر ملا محب اللہ اخوندزادہ کی گاڑی بھی ہمارے قریب آ کر رک گئی' گاڑی کے رکتے ہی کمانڈر صاحب گاڑی سے نیچے اترے اور ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ سب اپنی گاڑی میں آ جائیں چنانچہ ہم سب ساتھی فوراً اپنی گاڑی میں سوار ہو گئے' ہمارے سوار ہوتے ہی ہماری دونوں گاڑیاں واپس مڑ کر پھر جبل سراج کی طرف محوسفر ہو گئیں' ہم سب ساتھی بہت حیران ہو رہے تھے کہ سب گاڑیاں تو چاریکار کی طرف جا رہی ہیں لیکن فقط ہماری دو گاڑیاں کیوں جبل سراج کی طرف محوسفر ہیں' ہمارے اس سوال کا جواب جلد ہی ہمیں مل گیا کیونکہ ایک جگہ جب گاڑیاں رکیں تو کمانڈر صاحب نے ہمیں بتایا کہ آج اس گڑ بڑ میں دو پاکستانی ساتھی لاپتہ ہو گئے ہیں' جہاں جہاں جنگ ہوئی ہے وہاں ہم ان ساتھیوں کو تلاش کرنے جا رہے ہیں' اس لئے سب ساتھی چوکنا ہو کر اور اپنے اسلحہ کو تیاری پوزیشن میں رکھ کر بیٹھیں' یہ سب کچھ بتانے کے بعد کمانڈر صاحب گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑیاں پھر محوسفر ہو گئیں۔

رات گئے تک ہم کمانڈر ملا محب اللہ اخوندزادہ کی معیت میں گمشدہ ساتھیوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے لیکن وہ ساتھی نہ ملے آخر کار تھک ہار کر رات کے تقریباً دو بجے ہم سب ساتھی واپس ''قول اردو'' چاریکار پہنچے اور لمبی تان کر سو گئے۔

اگلے دن گمشدہ ساتھی خود بخود آ گئے، ان میں سے ایک ساتھی زخمی تھا' جب ان سے پوچھا گیا کہ سڑک پہ جنگ ختم ہونے سے لیکر اب تک تم لوگ کہاں تھے؟ اس پر ان میں سے ایک ساتھی جو زخمی نہیں تھا' نے بتایا: ''کہ میں لڑائی کے دوران فصلوں سے ہوتا ہوا کافی آگے نکل گیا تھا جبکہ میرے دوسرے ساتھی مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے جب مجھے اس بات کا

حساس ہوا کہ میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ چکا ہوں اور دشمن بھی کہیں اردگرد موجود ہے تو میں نے خود کو فصلوں میں چھپا لیا اور صبح تک وہیں چھپا رہا' صبح ہوتے ہی جب میں نے دیکھا کہ اردگرد دشمن موجود نہیں ہے تو میں وہاں سے نکل آیا اور اب آپ حضرات کے سامنے موجود ہوں۔''

زخمی ساتھی نے اپنی داستان سناتے ہوئے کہا کہ ''میں بھی اس ساتھی کی طرح اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر دور نکل گیا تھا اور تقریباً وہاں پر موجود دشمن کے درمیان میں پہنچ گیا تھا' دشمن کے قریب ہونے کا احساس ہوتے ہی میں نے خود کو چھپانے کی کوشش کی اور فصلوں میں جا کر بیٹھ گیا لیکن بدقسمتی سے دشمن کے ایک آدمی کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس نے فوراً ایک اوٹ میں ہو کر گرج کر دریش (ہالٹ) کہا تو دشمن کے کچھ اور آدمی بھی جو یہیں اردگرد موجود تھے میری طرف متوجہ ہو گئے اور انہوں نے بھی اسلحہ میری طرف تان لیا اور پھر مجھے ہاتھ اوپر اٹھانے کیلئے کہا گیا اب میرے پاس ہاتھ اٹھا کر سرنڈر ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا' چنانچہ میں نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور اپنی جگہ کھڑا ہو گیا' بعد ازاں مجھے آگے کی طرف چلنے کا حکم ملا تو میں آگے چل پڑا'' اس ساتھی نے مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ: ''دو مسلح آدمی مجھے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے مختلف راستوں سے گزارتے ہوئے آگے لے جا رہے تھے جبکہ میرا ذہن وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا تھا اور میں موقع کی تلاش میں تھا۔

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور میں دشمنوں کے نرغے میں ایک نا معلوم منزل کی طرف دھکیلا جا رہا تھا' جبکہ میرا ذہن مسلسل پلاننگ بنانے میں مصروف تھا کہ اچانک جب میں نے دیکھا کہ مجھے گرفتار کر کے لے جانے والے افراد کچھ غافل ہیں تو میں نے اللہ کا نام لیکر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا' دونوں پہرے دار میرے اس طرح بھاگ نکلنے پر ششدر رہ گئے اور جب تک انہوں نے اپنی حیرت پر قابو پایا تو میں ان سے کافی دور نکل چکا تھا' اب میں زگ زیگ پوزیشن میں بھاگ رہا تھا، پہرے داروں نے پیچھے سے مجھ پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں ایک گولی میری کہنی کو چھیدتی ہوئی گزر گئی' اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے اتنی شدید فائرنگ میں کوئی اور گولی مجھے نہیں لگی اور میں ان لوگوں سے دور

سے دور ہوتا چلا گیا ان لوگوں نے بھی میرا زیادہ تعاقب نہ کیا' کافی دور تک میں اپنی کہنی کو دوسرے ہاتھ سے پکڑے خون بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دوڑتا رہا اور پھر جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ لوگ بہت پیچھے ہی کہیں رک گئے ہیں تو میں نے سکھ کا سانس لیا اور خود کو فصلوں میں چھپا لیا اور صبح کی روشنی پھیلنے تک وہیں چھپا رہا اور صبح ہوتے ہی میں نے ''قول اردو'' کی طرف حرکت کرنا شروع کر دی''۔ یہ واقعہ سن کر سب ساتھی بہت متاثر ہوئے اور اللہ رب العزت کی غیبی مدد سے ایک ساتھی کے بچ جانے پر اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا۔

آج کچھ تازہ دم ساتھی مزید کابل سے آئے ہوئے تھے اس لئے کچھ نئی تشکیلیں ہو رہی تھیں' کچھ دیگر ساتھیوں کے ساتھ میری تشکیل بھی کمانڈر حسان حبیب شہید نے واپسی کابل کیلئے کر دی جبکہ میں اس تشکیل کیلئے راضی نہیں تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ میری تشکیل محاذ پر ہی رہے' چنانچہ میں نے اس تشکیل پر چلنے سے انکار کر دیا اور فوراً دوسرے کمرے میں موجود سپریم کمانڈر مولانا عبدالجبار صاحب کے پاس جا پہنچا اور ان سے کہا کہ میں محاذ پر ہی رہنا چاہتا ہوں جبکہ استاد حسان حبیب میری تشکیل کابل کر رہے ہیں، اس پر مولانا عبدالجبار صاحب نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہاری تشکیل محاذ پر ہی رہے گی، میں استاد صاحب کو بتا دوں گا چنانچہ میں مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ بعد ازاں مولانا عبدالجبار صاحب کے کہنے پر کابل جانے والے ساتھیوں کی لسٹ سے میرا نام نکال دیا گیا اور جب کابل جانے والے ساتھی روانہ ہو گئے تو پھر مجھے تسلی ہوئی کہ میں محاذِ جنگ سے دور نہیں جا رہا ہوں۔

اگلے دن چونکہ شہر والی قرار گاہ پر ساتھیوں کی ضرورت تھی اس لئے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کمانڈر حسان حبیب صاحب نے مجھے بھی شہر والی قرار گاہ کی طرف روانہ کر دیا' چنانچہ میں نے اپنا اسلحہ اٹھایا اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شہر والی قرار گاہ کی طرف چل پڑا' جب شہر والی قرار گاہ پر پہنچے تو وہاں پر پہلے سے موجود ساتھیوں نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں خوش آمدید کہا' خوش آمدید کہنے والے سب ساتھی نوجوان تھے جبکہ ان کے درمیان ایک چہرہ ایسا بھی تھا جو سفید ڈاڑھی سے مزین تھا اور جو بڑھاپے کی طرف گامزن ہونے کے باوجود جوان حوصلہ

تھا' میری مراد رحیم یار خان کے رہنے والے عظیم مجاہد ماسٹر عبدالعزیز شہید ہیں جن کی شجاعت اور بہادری کے سامنے بڑے بڑے نوجوان بھی پستہ قد معلوم ہوتے تھے' ماسٹر عبدالعزیز شہید وہ شخصیت تھے جو ہر مشکل سے مشکل لمحے میں بھی دامن صبر کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے ۔اور ہر معرکہ میں صف اول میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے نظر آتے تھے اور ہمیشہ ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے میں پیش پیش نظر آتے تھے، اس کے علاوہ ماسٹر صاحب نہایت ہی متقی اور پرہیز گار تھے، راتوں کو جاگ کر مصلے پر کھڑے ہو کر اپنے رب کو منانے والے تھے' نہایت کم گو تھے اور اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے' غرض جو خوبیاں ایک کامل مجاہد میں ہونی چاہئیں وہ تمام کی تمام ماسٹر صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھیں ۔

میں ساتھیوں سے ملنے کے بعد بالائی منزل کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا اور وہاں موجود ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گیا' یہاں پر پہلے سے موجود ساتھیوں نے بتایا کہ یہ عمارت جہاں پر ہم موجود ہیں' تھانے کی عمارت ہے' طالبان کے آنے سے پہلے یہاں پر جرائم پیشہ لوگوں کو قید رکھا جاتا تھا' جس عمارت میں ہم موجود تھے اس کے دائیں جانب چند کچی بیرکیں تھیں جہاں پر قیدیوں کو رکھا جاتا تھا' یہ بیرکیں کم مرغیوں کے ڈربے زیادہ معلوم ہوتے تھے' بیرکوں سے باہر چھت پر جانے کیلئے سیڑھیاں موجود تھیں' چھت پر پچھلی دیوار کے اوپر لکڑی کا ایک چھوٹا سا کمرہ نما ڈبہ سا رکھا ہوا تھا جو پہرے داری کیلئے استعمال ہوتا تھا' رہائشی عمارت کے بالکل سامنے مین گیٹ تھا' مین گیٹ کے ساتھ اندر کی طرف دائیں جانب ایک بڑا سا کچا کمرہ تھا جو معلوم نہیں کس مقصد کیلئے استعمال ہوتا تھا' گیٹ سے باہر ایک نہر گزر رہی تھی ۔

دوپہر کے وقت ایک مقامی آدمی جو سابقہ حکومتی ملازم تھا' ایک بالٹی میں سالن اور روٹیاں لیکر آ گیا' گوشت کا سالن تھا لیکن بالٹی میں شوربے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا' ساتھیوں نے بتایا کہ یہ آدمی مسعودی حکومت میں یہاں پر ملازم تھا بقول اس کے وہ اپنی ملازمت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا اس لئے مرکز سے کھانا وغیرہ لانے کی خدمت انجام دیتا ہے' میں نے دوسرے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ پانی نما شوربہ اور روٹیاں مرکز سے آتی ہیں؟ ساتھیوں نے اثبات میں جواب دیا تو مجھے کچھ تشویش لاحق ہوئی جس کا ساتھیوں سے ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ

مسعودی ملازم مجھے تو جاسوس معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کھانا لانے میں بھی خیانت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے' کیونکہ طالبان کی طرف سے جو کھانا ملتا ہے وہ اس طرح کا نہیں ہوتا، اس پر ساتھیوں نے کہا کہ بغیر کسی واضح ثبوت کے ہم کیا کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ کچھ دنوں سے یہ اسی طرح کا کھانا لا رہا ہے اور اکثر روٹیاں بھی کم ہوتی ہیں' چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ کل جب یہ دوپہر کا کھانا لینے کیلئے جائے تو اس کا تعاقب کیا جائے۔

اگلے دن دوپہر کے کھانے کے وقت میں خود بروقت اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں سے کھانا تقسیم ہوتا تھا اور ایک جگہ چھپ کر کھڑا ہو گیا، تھوڑی دیر بعد جب کھانا تقسیم ہونا شروع ہوا تو صاحب موصوف بھی ایک پرچی جس پر پاکستانی اوطاق کا نام اور ساتھیوں کی تعداد نوشتہ تھی اور ایک بالٹی ہاتھ میں لئے ہوئے لائن میں تیسرے چوتھے نمبر پر کھڑا نظر آیا اور اپنی باری پر کھانا لے کر عمارت سے باہر آ گیا، میں نے دیکھا کہ بالٹی گوشت سے بھری ہوئی تھی جو واضح نظر آ رہی تھی' بہرحال میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا ویسے بھی مجھے دیکھ لئے جانے کی کوئی پریشانی نہ تھی کیونکہ وہ آدمی مجھے بالکل نہیں جانتا تھا' چلتے چلتے وہ اچانک ایک گلی میں مڑ گیا اور گلی کے اندر تھوڑا دور تک جا کے وہ ایک گھر میں داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد برآمد ہوا اور ہمارے اوطاق کی طرف چل پڑا، میں نے دیکھا کہ جو بالٹی تھوڑی دیر پہلے تک گوشت سے پُر نظر آ رہی تھی اب اس میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی روٹیوں کی تعداد بھی کم ہو چکی تھی' اسی اثناء میں وہ اوطاق میں پہنچ گیا۔ روٹیاں اور سالن کی بالٹی ساتھیوں کے حوالے کر کے ایک طرف بیٹھ گیا' میں بھی تھوڑی دیر کے بعد پہنچ گیا اور جب سالن والی بالٹی کو قریب سے جا کر دیکھا تو اس میں حسب سابق فقط پانی نما شوربہ ہی تھا اور روٹیاں بھی کم تھیں' میں نے ساتھیوں کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا تو ساتھیوں کو بہت غصہ آیا' بعض ساتھی تو اس کی پٹائی کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے سمجھا بجھا کر ساتھیوں کو روکا' اس آدمی سے پوچھا گیا تو وہ صاف مکر گیا اور کہنے لگا کہ مرکز سے یہی کچھ ملتا ہے جو میں لے کر آتا ہوں وہ یہ ماننے کیلئے بالکل تیار نہ تھا کہ وہ خیانت کرتا ہے' بہرحال اس آدمی کو یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ جب طالبان کو دفتری کاموں کیلئے ملازم کی ضرورت

پڑی تو آپ کو ضرور بلائیں گے جب تک آپ اپنے گھر میں ہی رہیں اور آئندہ ہم اپنا کھانا خود لے کر آیا کریں گے۔

کھانا کھا کر ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف ہو گئے اور عشاء کی نماز کے بعد پہرے کی لسٹ ترتیب دی گئی جس ساتھی کا پہلا پہرہ تھا وہ گیٹ پر چلا گیا جبکہ باقی ساتھی آرام سے سونے کیلئے لیٹ گئے' رات کے دو بجے پہرے کیلئے میرا نمبر تھا' چنانچہ دو بجے سے چند منٹ پہلے پہرے والے ساتھی نے مجھے آکر بیدار کیا اور بتایا کہ آپ کا پہرہ شروع ہو گیا ہے' چنانچہ میں نے اپنی کلاشنکوف اور میگزین پورچ اٹھایا اور گیٹ کی طرف چل پڑا اور گیٹ سے باہر نکل کر نہر کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں ایک چکر لگا کر واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا' ہر طرف ہو کا عالم تھا ایسے لگتا تھا کہ کائنات کی ہر چیز پر سکوت طاری ہے' میں گیٹ کے ساتھ دیوار کی آڑ میں انتہائی محتاط طریقہ سے اردگرد پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا کہ اچانک دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں چوکنا ہو گیا اور آواز کی سمت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرنے لگا' دفعتاً سڑک سے ایک گاڑی نہر کے کنارے ہمارے اوطاق کی طرف آنے والی سڑک پر مڑی تو مجھے بہت زیادہ تشویش لاحق ہوئی کیونکہ رات کے اس پہر کسی گاڑی کا اس طرف آنا خطرے سے خالی معلوم نہیں ہوتا تھا اس لئے میں نے جلدی سے اپنی گن کو لوڈ کیا اور سیفٹی لاک ہٹا کر محتاط طریقہ سے ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کیلئے تیاری پوزیشن میں بیٹھ گیا' گاڑی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھی چلی آ رہی تھی جوں جوں گاڑی قریب آ رہی تھی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی' جبل السراج اور چاریکار کے حالات چونکہ بہت زیادہ مخدوش ہو چکے تھے اس لئے کچھ بھی ہونا بعید از قیاس نہ تھا' گاڑی جیسے ہی میرے قریب آئی میں نے کلاشنکوف کا رخ گاڑی کی طرف کرتے ہوئے پورے زور کے ساتھ اور کڑک دار آواز میں ''دریش ......(ہالٹ)'' کہا بریکوں کی چرچراہٹ گونجی اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی' میری انگلی مسلسل ٹرائیگر پر تھی اور نظریں گاڑی پر جمی ہوئی تھیں' گاڑی رکتے ہی ایک آدمی گاڑی کا گیٹ کھول کر باہر آیا اور زوردار آواز میں گویا ہوا ''او دریش کہنے والے باہر نکلو'' پہلے تو میں گھبرا گیا کہ نہ جانے کون ہے لیکن جب وہ آدمی ذرا سامنے روشنی کی طرف آیا تو میں نے سکون کا سانس

لیا اور میرے تنے ہوئے اعصاب اپنے معمول پر آ گئے کیونکہ میں اس آدمی کو پہچان چکا تھا آنے والا ملا محب اللہ اخوندزادہ کا معاون ملا مرجان تھا' چنانچہ میں اپنی اوٹ سے باہر نکلا اور ملا مرجان سے پوچھا کہ خیریت ہے رات کے اس وقت اور اتنی عجلت میں آپ آئے ہیں؟ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ملا مرجان نے الٹا ایک سوال داغ دیا "کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں......؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے ملا مرجان سے پوچھا "کس چیز کے بارہ میں......؟

اس پر اس نے بتایا کہ سالنگ اور کاپیسا کی طرف حالات بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں او ریہاں پر بھی اردگرد کے علاقوں سے حوصلہ شکن خبریں آ رہی ہیں' بعدازیں ملا مرجان نے کہا کہ فوراً اپنے تمام ساتھیوں کو بیدار کرو اور ان کو لے کر کماندانی میں چلے جاؤ' میں کماندانی والوں کو اطلاع دے جاتا ہوں' یہ ہدایات دے کر ملا مرجان گاڑی پر بیٹھ کر جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا' جبکہ میں دوڑ کر عمارت کے اندر گیا اور ساتھیوں کو بیدار کرنا شروع کر دیا' سب ساتھی انتہائی تیزی کے ساتھ اپنا اپنا اسلحہ سنبھالتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ آپ نے کیوں اتنی افراتفری اور عجلت میں سب ساتھیوں کو جگایا ہے کیا کہیں دشمن نے حملہ کر دیا ہے......؟ میں نے ملا مرجان سے ہونے والی تمام گفتگو کے بارے میں ان کو آگاہ کیا اور کہا کہ جلدی جلدی تمام ساتھی اپنا اپنا سامان اٹھا لیں کیونکہ کماندانی چلنا ہے' تمام ساتھیوں نے انتہائی سرعت کے ساتھ اپنا اپنا سامان سنبھالا اور محوحرکت ہو گئے' سیڑھیاں اتر کر بالائی منزل سے جب ساتھی نیچے اترے تو عمارت کے صحن میں آ کر رک گئے اور اوپر بقایا رہ جانے والے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگے' جب سب ساتھی آ چکے تو باہر کی طرف چلنے لگے' ہر ساتھی میری طرف متوجہ تھا اور ہر ساتھی کی زبان پر ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ رات کے اس پہر ہمیں کیوں حرکت کرنے اور کماندانی جانے کا حکم ہوا ہے......؟

اس سوال کا میرے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا' بہرحال ہم کچھ دیر بعد کماندانی میں پہنچ گئے اور مین گیٹ کے بائیں طرف بالائی کمرے میں جا کر بیٹھ گئے' سب ساتھی بالکل خاموش تھے، میرا ذہن ملا مرجان اخوند کی رات والی اس بات میں اٹکا ہوا تھا کہ "تمہیں کچھ نہیں پتہ" اگرچہ موجودہ صورتحال کا مجھے کچھ اندازہ ہو چکا تھا لیکن ملا مرجان اخوند کا یہ سوال مجھے کافی

پریشان کر رہا تھا اور پھر رات کے دو بجے اپنی جگہ چھوڑ کر کمانڈانی جانے کا حکم عجیب سا محسوس ہو رہا تھا اور ایسے لگتا تھا کہ جیسے کوئی بڑا سانحہ رونما ہونے والا ہے۔

کافی دیر یونہی ایک دوسرے کے چہرے تکتے پریشانی کے عالم میں بیٹھے رہے اور آخر کار صبح کاذب کے وقت ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے؟ طے یہ پایا کہ دو ساتھیوں کو "قول اردو" بھیجتے ہیں تاکہ وہ وہاں سے معلومات حاصل کر کے آئیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے' چنانچہ دو ساتھیوں قاری ابراہیم اور ایک دوسرے ساتھی کو "قول اردو" بھیج دیا گیا جو نماز فجر کے قریب واپس آگئے اور کہنے لگے کہ "قول اردو" سے ہدایات ملی ہیں کہ واپس اپنے سابقہ ٹھکانے پر چلے جائیں" یہ ہدایات سنتے ہی سب ساتھی حرکت میں آگئے اور سابقہ جگہ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں پہنچ کر نماز فجر ادا کی، بعد ازیں سب ساتھی موجودہ صورتحال پر اپنے اپنے تبصرے کرنے لگے' تبصرے جب کچھ ٹھنڈے ہوئے تو سب ساتھیوں کو ناشتہ کی فکر ہوئی' سب ساتھیوں کو بھوک لگی ہوئی تھی کیونکہ رات کو بھی کھانا کم ہونے کی وجہ سے ساتھی بھوکے رہ گئے تھے لیکن اس وقت ہمارے پاس کھانے کیلئے تھوڑے سے کچے لوبیے اور چند ٹکیاں کنور چکن کیوب جو ہمیں کمانڈانی سے ملی تھیں' کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا' چنانچہ ایک ساتھی شاہد اقبال نے کیتلی میں پانی ڈال کر الیکٹرک راڈ (ہیٹر) سے اسے گرم کرنا شروع کیا لیکن پانی بھی آج ابلنے کا نام نہیں لے رہا تھا' جس کی وجہ یہ تھی کہ رات سے بجلی بہت کم تھی بہرحال کافی دیر کے بعد کیتلی میں موجود پانی میں ابلنے اور جوش کھانے کے کچھ آثار نمودار ہوئے تو فوراً اس میں بھائی شاہد اقبال نے کنور چکن کیوب کی ٹکیاں ڈال دیں اور ایک ایک پیالہ سب ساتھیوں کو پلایا اور اس کے بعد کیتلی میں پانی بھر کر لوبیے کو ابالنے کیلئے الیکٹرک راڈ اس میں ڈال کر رکھ دیا گیا۔ تمام ساتھی لوبیے کے پک جانے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک اردگرد سے فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں، تمام ساتھیوں نے اپنا اپنا اسلحہ سنبھالا اور بالائی منزل سے اتر کر نیچے صحن میں آگئے' میں ایک دو ساتھیوں کو لے کر مین گیٹ سے باہر نہر کے کنارے آگیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا اور یہ اندازہ کرنے لگے کہ فائرنگ کس سمت سے ہو رہی ہے لیکن کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کیونکہ تقریباً ہر طرف سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں' جو ہر لمحہ شدت اختیار کرتی جا

رہی تھیں، ساتھیوں نے ہمیں عمارت کے اندر آنے اور احتیاط کرنے کو کہا کیونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ دشمن کہاں ہے؟ اور ارد گرد کے گھروں میں بھی دشمن کے مسلح افراد چھپے ہوئے ہو سکتے تھے، اور کسی وقت بھی ہمیں غافل پا کر نقصان پہنچا سکتے تھے، چنانچہ ہم فوراً واپس عمارت میں پلٹ آئے۔

ہم تمام ساتھیوں کو موجودہ درپیش صورتحال سے بہت تشویش لاحق ہو رہی تھی اور ہم کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ موجودہ صورتحال سے کیسے نمٹا جائے اور کیا کیا جائے کیونکہ دشمن کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے اور کس پوزیشن میں ہے؟ آمنے سامنے دشمن سے نبرد آزما ہونا مشکل نہیں ہوتا کیونکہ دشمن کی حالت اور پوزیشن معلوم ہوتی ہے لیکن موجودہ درپیش حالات میں کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں کیونکہ دشمن کے لوگ نامعلوم مقام سے فائرنگ کر رہے تھے، بہر حال آپس میں صلاح مشورے کے بعد ہم کچھ ساتھی اوپر چھت پر چلے گئے اور کچھ ساتھی نیچے رہ گئے، میں نے اور میرے ساتھ اوپر چھت پر آنے والے ساتھیوں نے دیواروں کے پیچھے پوزیشنیں سنبھال لیں، میں جو دیوار سڑک کی جانب تھی اس کے پیچھے پوزیشن سنبھالے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فائرنگ کس سمت سے ہو رہی ہے اور جس طرف سے فائرنگ کا شک پڑتا اس طرف سنگل سنگل فائر بھی کر رہا تھا، ارد گرد پوزیشنیں سنبھالے ہوئے دوسرے ساتھی بھی اسی طرح وقفے وقفے سے فائر کر رہے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دشمن کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا اور اب چھوٹی گنوں کے علاوہ دشمن ہیوی اسلحہ بھی استعمال کر رہا تھا، پوری فضا خفیف و ثقیل (ہلکے اور بھاری) اسلحے کی آوازوں سے گونج رہی تھی اور کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی، ایسے میں ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ خود کو اس جگہ سے نکالنا چاہیے کیونکہ یہ ایک بند سی جگہ تھی اور دشمن کی طرف سے چھاپے کی صورت میں اس جگہ سے بچ نکلنا اگر ناممکن نہیں تو سخت مشکل تھا اور شدید نقصان کا احتمال بہت زیادہ تھا، اکثریت کی یہی رائے تھی کہ نہر کے ساتھ ساتھ ''قول اردو'' (چھاؤنی) کی طرف نکلنا چاہیے اور (چھاؤنی) ''قول اردو'' والے ساتھیوں سے جا ملنا چاہیے، چنانچہ سب ساتھی نہر کے ساتھ ساتھ ایک قطار کی صورت میں ایک دوسرے

سے فاصلہ رکھتے ہوئے انتہائی احتیاط کے ساتھ ''قول اردو'' (چھاؤنی) کی طرف محوسفر ہو گئے ،ابھی ہم نے تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ قومانڈانی کے برج پر موجود طالبان جو غالباً اسی علاقہ کے رہنے والے تھے' نے ہیوی مشین گن (دشکہ) کا رخ ہماری طرف کرتے ہوئے ہمیں رک جانے کو کہا جب ہم رک گئے تو اوپر موجود ایک آدمی نے حکمیہ انداز میں ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے ہوئے ہم سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو......؟ سب ساتھیوں کو اسلحہ کا ان پر سیدھا کرنا اور اس آدمی کا اندازِ تخاطب بہت برا لگا، کچھ ساتھیوں نے جواب میں اپنا اسلحہ ان پر تاننے کی کوشش کی لیکن ماسٹر عبدالعزیز (شہید) نے ساتھیوں کو سمجھا بجھا کر اس کام سے باز رکھا اور میں نے اس آدمی کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم ''قول اردو'' میں اپنے ساتھیوں کے پاس جا رہے ہیں' اس پر وہی آدمی تحکمانہ انداز میں بولا کہ اپنی جگہ پر واپس جاؤ......ہم ساتھیوں نے کچھ پس و پیش سے کام لینا چاہا تو اس آدمی نے ہمیں وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم واپس نہ ہوئے تو مجبوراً میں تم لوگوں پر فائر کھول دوں گا' اس وارننگ پر سب ساتھی مشتعل ہو گئے اور لڑنے پر تل گئے لیکن پھر ماسٹر عبدالعزیز (شہید) نے ساتھیوں کو سمجھایا کہ اس نازک وقت میں آپس میں (اگرچہ ہمیں حکم دینے والا آدمی دشمن کے ساتھ مل چکا تھا جس کا ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ لڑنا جھگڑنا ٹھیک نہیں اس سے ہمارا نقصان جبکہ دشمن اس سے فائدہ اٹھائے گا' سب ساتھی ماسٹر صاحب کے اعلیٰ اخلاق' شفقت اور ان کے سفید ریش ہونے کی وجہ سے ان کی بہت عزت کرتے تھے اس لئے اس دفعہ بھی ان کے سمجھانے سے غصے کے باوجود ہم سب ساتھی واپس اپنی سابقہ جگہ پر جا پہنچے، جہاں پر کچھ ساتھی اوپر چھت پر جا کر حسب سابق پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ گئے جن میں میں بھی شامل تھا' جبکہ کچھ ساتھی نیچے رہ کر حویلی کے صحن میں دفاعی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر گئے۔

آخری معرکہ

ہر لمحے بڑھتی ہوئی فائرنگ اور کبھی کبھی سنائی دینے والے شور شرابے سے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ دشمن ہر لمحے محاصرہ تنگ کرتا جا رہا ہے اور ہمارے اردگرد قریب ہوتا جا رہا ہے' میں چھت پر نہر کی طرف والی دیوار کے پیچھے مورچہ سنبھالے دور اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ رہا تھا

جہاں کچھ دیر پہلے ایک زوردار دھماکہ ہوا تھا' دفعتاً میری نظر دھوئیں والی جگہ سے بائیں طرف پڑی جہاں سے ایک راکٹ فائر ہوا جو قومانڈانی کے قریب نہر کے کنارے آکر گرا اور ایک زوردار دھماکہ ہوا' صبح سے اب تک یہ پہلا موقع تھا کہ دشمن کے کسی ٹھکانے کے بارے میں معلوم ہوا چنانچہ میں نے بھی چھت کے ایک کونے میں جاکر جہاں سے راکٹ فائر ہوا تھا اس طرف نشانہ باندھ کر (R.P.G 7) آرپی جی سیون کا ایک راکٹ فائر کر دیا جو تقریباً اسی جگہ پر جا کر گرا جہاں سے کچھ دیر پہلے قومانڈانی میں موجود طالبان ساتھیوں کو راکٹ سے نشانہ بنایا گیا تھا' میرے چلائے ہوئے اس گولے سے دشمن کا کوئی نقصان ہوا یا نہیں لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس طرف سے جو مسلسل فائر آرہے تھے وہ کچھ دیر کیلئے بند ہو گئے اور ہمیں سڑک کے کنارے اردگرد کا جائزہ لینے کا موقعہ مل گیا' چنانچہ ایک ساتھی انتہائی محتاط طریقہ سے نیچے مین گیٹ سے تھوڑا سا باہر نکلا اور دائیں بائیں نظر دوڑا کر جلدی سے واپس اندر آ گیا کیونکہ نہر کے کناروں پر نامعلوم مقامات سے وقفے وقفے سے فائرنگ کی جارہی' اس ساتھی نے اندر آکر بتایا کہ بائیں طرف والے پل کے نیچے جو ہماری عمارت سے پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر تھا ایک طالب ساتھی شدید زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے' یہ سن کر تمام ساتھیوں کو بہت زیادہ تشویش لاحق ہوئی کیونکہ اس طالب ساتھی کا اس طرح زخمی حالت میں وہاں بے یارومددگار پڑے رہنا اس کیلئے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتا تھا' کیونکہ وہ کسی بھی لمحے دشمن کے ہتھے چڑھ سکتا تھا یا دشمن کی طرف سے فائر کی ہوئی مزید فائرنگ سے موت سے ہمکنار ہوسکتا تھا' چنانچہ دو ساتھیوں نے ہمت کی اور جان ہتھیلی پر رکھ کر پل کی طرف دیوانہ وار دوڑ پڑے اور زخمی طالب کو اٹھا کر انتہائی تیزی اور احتیاط کے ساتھ عمارت کے اندر لے آئے' اس زخمی ساتھی کی حالت کافی تشویش ناک معلوم ہو رہی تھی کیونکہ اس کے جسم پر کافی گولیاں لگی ہوئی تھیں اور خون بھی کافی بہہ چکا تھا جس کی وجہ سے وہ کافی نقاہت محسوس کررہا تھا اور درد کی شدت سے مسلسل کراہ رہا تھا، دریں اثناء میرے ساتھ اوپر چھت پر موجود ایک ساتھی بھائی محمد یوسف جو میرے بائیں طرف دیوار کے پیچھے مورچہ سنبھالے ہوئے تھا اس نے جونہی فائر کرنے کیلئے اپنا سر دیوار سے اوپر اٹھایا ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کے گال کو چیرتی ہوئی نکل گئی' میں نے اور دوسرے

ساتھیوں نے جلدی جلدی اس ساتھی کو سنبھالا اور اس کے زخمی گال سے فوارے کی طرح بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔

دو ساتھیوں کا زخمی ہونا ہم سب ساتھیوں کیلئے بہت زیادہ پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا کیونکہ ہمارے پاس اس وقت نہ تو کوئی فرسٹ ایڈ کا سامان تھا کہ زخمی ساتھیوں کی کوئی مرہم پٹی وغیرہ کر سکیں اور نہ ہی کوئی گاڑی تھی جس میں ڈال کر ان کو کسی ہسپتال میں پہنچا سکیں۔ ہم سب ساتھی چھت سے اتر کر نیچے جمع ہو چکے تھے اوپر کھڑے رہنا اب انتہائی خطرناک ہو چکا تھا کیونکہ چھت پر فرنٹ سائیڈ والی وہ دیوار جس کے پیچھے کچھ دیر پہلے میں مورچہ سنبھالے ہوئے تھا اور سیڑھیوں کی چھت راکٹ کے گولے لگنے سے تباہ ہو چکی تھیں' فی الحال زخمیوں کا مسئلہ زیادہ پریشان کن تھا اور سب ساتھی اسی سوچ و بچار میں تھے کہ آخر کیا کیا جائے' چونکہ اس جگہ پر اب مزید ٹھہرنا کافی خطرناک ہو چکا تھا' اور کسی لمحے بھی ہم بغیر کچھ کئے دشمن کی گرفت میں آسکتے تھے لیکن یہاں سے نکل اس لئے نہیں سکتے تھے کہ دو زخمی ہمارے ساتھ تھے اور ان کو اٹھا کر کسی طرف نکلنا بہت محال تھا' اگر دشمن کے بارے میں صحیح معلوم ہوتا کہ وہ کس کس طرف ہے اور ہمارے طالبان ساتھی کس طرف ہیں تو پھر کسی نہ کسی طرح زخمی ساتھیوں کو اٹھا کر نکلنا ممکن تھا' لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ دشمن ہم سے اوجھل تھا اور موجودہ صورتحال سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارے بالکل سامنے والی عمارتوں میں بھی دشمن موجود ہے جو کسی بھی لمحے موقع ملتے ہی ہمیں قابو کر سکتا ہے' ابھی ہم اسی سوچ و بچار میں تھے کہ ایک بائی فور ڈالہ انتہائی تیز رفتاری سے عمارت کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوا اور ایک تیز چرچراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہی رک گیا' سب ساتھی سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ آنے والے ہمارے طالبان ساتھی ہی ہیں' چنانچہ سب ساتھی گاڑی کے پاس جمع ہو گئے' گاڑی کا ڈالہ زخمیوں سے اٹا پڑا تھا' ایک طالب ساتھی جو غالباً طالبان کا کوئی کمانڈر تھا گاڑی سے نیچے اترا اور ہم سے مخاطب ہو کر خیریت دریافت کرنے اور حوصلہ بڑھانے اور تسلی وغیرہ دینے کے بعد کہا کہ جو ساتھی زخمی ہیں ان کو احتیاط کے ساتھ جلدی گاڑی میں ڈال دیں' اس وقت ہمارے ساتھ مولانا مسعود اظہر صاحب (جو اس وقت ہندوستان کی قید میں تھے) کے بھائی

مولانا عبدالرؤف اور بہنوئی بھائی رشید احمد بھی تھے' تمام ساتھیوں نے جن میں کمزور ساتھی بھی تھے اور ایک سفید ریش بزرگ ساتھی ماسٹر عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی تھے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے بعد شہادت یا گرفتاری دونوں میں سے کسی ایک چیز کے امکانات بچ نکلنے کے امکانات سے بہت زیادہ ہیں پھر بھی تمام ساتھیوں نے قربانی دیتے ہوئے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مولانا مسعود اظہر صاحب کے بھائی مولانا عبدالرؤف اور بہنوئی بھائی رشید احمد کو کسی نہ کسی طرح زخمیوں کے ساتھ بھیج دینا چاہیے کیونکہ سب ساتھیوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ ان کے ایک بھائی یعنی مولانا مسعود اظہر صاحب ہندوستان میں قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں اور کہیں یہ نہ ہو کہ یہ دونوں مولانا عبدالرؤف اور بھائی رشید احمد بھی یہاں پھنس جائیں۔ چنانچہ زخمیوں کو گاڑی میں ڈال دیا اور ان دونوں حضرات کو بھی زخمیوں کے ساتھ ہی گاڑی میں ایڈجسٹ کر دیا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اور دھول اڑاتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ لمحات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہیں اور وہ جذباتی مناظر جو ان ساتھیوں کو رخصت کرنے کے بعد دیکھنے میں آئے آج بھی جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ سارے مناظر ایک فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں کہ سب ساتھی دیدہ گریاں ہو کر اپنی مشکلات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رخصت ہونے والے ساتھیوں خاص طور پر مولانا عبدالرؤف اور بھائی رشید احمد کی سلامتی کی دعا مانگ رہے تھے اپنی موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی دوسروں کیلئے قربانی دینے کا یہ جذبہ ایک انمول جذبہ ہے جو مسلمان قوم کے علاوہ دنیا کے کسی اور مذہب اور قوم میں نہیں ملتا۔

ان ساتھیوں کو رخصت کرنے کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب چھت پر چڑھ کر ہم نے اردگرد کا جائزہ لیا تو ہمیں اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ قومانداانی پر جہاں پر کچھ دیر پہلے تک طالبان موجود تھے دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا اور قریب قریب تقریباً تمام جگہوں پر دشمن قابض ہو چکا تھا اور ہر طرف دشمن کے لوگوں نے ہلڑ بازی مچا رکھی تھی' ہم سب ساتھی چھت سے عمارت کی عقب والی گلی میں کود گئے اور مختلف گلیوں سے ہوتے

ہوئے ولایت (گورنر ہاؤس) پہنچ گئے' جہاں پر ابھی تک طالبان موجود تھے لیکن نہایت افراتفری کی حالت میں، ہم جیسے ہی گورنر ہاؤس کی عمارت میں پہنچے وہاں پر موجود طالبان نے کہا کہ قوماندانی جہاں پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے پر اٹیک کرنا ہے اور کامیاب اٹیک کے بعد ہی یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل ہوسکتی ہے لیکن حملہ میں پہل کرنے کی کوئی بھی ہمت نہیں کر رہا تھا کیونکہ دشمن قوماندانی کے بالائی مورچوں میں بیٹھا ہماری ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہا تھا اور حملہ کرنے کیلئے فقط مین روڈ ہی تھا جہاں سے قوماندانی کی طرف قدم بڑھانا بھی موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا' لیکن پھر بھی قربان جاؤں ماسٹر عبدالعزیز (شہید) کی شجاعت' بہادری اور دیدہ دلیری پر کہ انہوں نے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''ساتھیو! اگر ہماری تھوڑی سی ہمت اور قربانی سے سینکڑوں طالبان مجاہدین کے لئے نکلنے کا کوئی راستہ بن سکتا ہے تو ہمیں اس کارِ عظیم سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔'' اتنا کہتے ہی ماسٹر صاحب نے پرجوش انداز میں نعرہ تکبیر بلند کیا اور ساتھیوں کا ردعمل دیکھے اور سنے بغیر کلاشنکوف کو سیدھا کئے مستانہ وار قوماندانی کی طرف دوڑ پڑے ان کو دیکھتے ہی ہم سب ساتھی بھی ان کی تقلید میں اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے قوماندانی کی طرف دوڑ پڑے دیکھتے ہی دیکھتے افغانی طالبان بھی ہمارے ساتھ ہو لئے لیکن کچھ ہی دور جانے کے بعد سب ساتھی رک گئے اور ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے کیونکہ قوماندانی کے بالائی مورچہ میں موجود دشمن فوجیوں نے ہم پر فائر کھول دیا تھا جس کی وجہ سے ہم سب ساتھی سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر جائے پناہ تلاش کرنے لگے لیکن سڑک پر ایسی کوئی جائے پناہ نہ تھی جسے ہم مورچہ کے طور پر استعمال کر کے دشمن سے مقابلہ کرتے۔

اس وقت اکثر ساتھیوں کے ذہن میں یہی تھا کہ اس صورت حال میں جب کوئی جائے پناہ بھی میسر نہیں ہے اور چند میٹر کے فاصلے پر دشمن بھی براہ راست ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہمیں بھی دشمن کی نقل و حرکت واضح نظر آ رہی ہے موت یقینی ہے لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ بالکل قریب سے بارش کی طرح آنے والی گولیوں کے باوجود ابھی تک کوئی ساتھی شہید یا زخمی نہیں ہوا تھا' حالانکہ شمالی والوں کے نشانے اکثر بے خطا ہوتے تھے لیکن کچھ دیر بعد ہی جب ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ دشمن سیدھا ہمیں نشانہ بنانے کی بجائے ہم سے چند قدم آگے سڑک پر

گولیاں برسا رہا ہے جس سے ان کا مقصد ہمیں زندہ گرفتار کرنا تھا' بہرحال ہم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ واپس گورنر ہاؤس (ولایت) میں پہنچیں' چنانچہ سب ساتھی جس تیزی کے ساتھ قوماندانی کی طرف بڑھے تھے اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ واپس ولایت (گورنر ہاؤس) پہنچ گئے اب کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔

افغانی طالبان کا ایک گروپ (ولایت) گورنر ہاؤس کی عمارت کے سامنے والی گلی میں تیزی سے داخل ہو رہا تھا' ہم سب ساتھیوں نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی ان ساتھیوں کے پیچھے جانا چاہیے اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ''قول اردو'' (چھاؤنی) پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ ''قول اردو'' میں ہمارے ساتھی اور گاڑیاں وغیرہ موجود ہوں' یہ فیصلہ کرتے ہی ہم سب ساتھی پہلے گزرنے والے طالبان ساتھیوں کے گروپ کے پیچھے گلی میں گھس گئے اور گلی کے اندر دوڑنے لگے' میں سب ساتھیوں سے پیچھے تھا کیونکہ میرے پاس کلاشنکوف کے اضافی میگزین اور RPG7 لانچر اور راکٹ کے گولوں کی صورت میں کافی وزن تھا جس کی وجہ سے مجھے دوڑنے میں کافی دقت محسوس ہو رہی تھی' ایک دو ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ راکٹوں کو پھینک دو تاکہ دوڑ میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ رہ سکو لیکن مجھے اس طرح راکٹوں کا ضائع کرنا اچھا معلوم نہ ہوا' اس لئے میں نے ان ساتھیوں کے مشورے کو نظر انداز کر دیا اور ساتھیوں کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا' ایک گلی کے موڑ پر آ کر ساتھی رکے ہوئے تھے اور چھپ کر اپنے دائیں طرف والی گلی میں دیکھ رہے تھے جہاں رش لگا ہوا تھا اور رش کی وجہ یہ تھی کہ دشمن کے لوگوں نے چند طالب مجاہدین کو پکڑا ہوا تھا اور انہیں بری طرح زدوکوب کر رہے تھے جبکہ دو تین آدمی جو شکل وصورت سے عالم معلوم ہوتے تھے زدوکوب کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے اور فارسی زبان میں تکرار کر رہے تھے' جس کی ہمیں تو کوئی سمجھ نہ آئی لیکن ایک طالب ساتھی نے جو ہمارے ساتھ گلی میں چھپا ہوا تھا' سرگوشی کرتے ہوئے بتایا کہ ''یہ دو تین آدمی چاریکار کے مولوی ہیں جو زدوکوب کرنے والوں کو کچھ دن پہلے طالبان سے کئے گئے عہد کی یاد دلا رہے ہیں اور ان کی منت سماجت کر رہے ہیں'' لیکن ہم نے دیکھا کہ ان زدوکوب کرنے والوں پر ان کی منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ ان کو بھی دھکے دے کر ایک طرف ہٹا رہے تھے اور

طالبان ساتھیوں کو ٹھڈوں مکوں اور کلاشنکوف کے بٹوں سے بہت بری طرح پیٹ رہے تھے' بھائی عتیق الرحمٰن جو میرے قریب ہی کھڑے ہوئے تھے یہ ظلم وستم کا منظر برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے نتائج سے بے پروا ہو کر اور طالبان ساتھیوں کا خیال کرتے ہوئے کلاشنکوف کو برسٹ پر رکھ کر ان لوگوں پر فائر کھول دیا ان میں سے پانچ چھ آدمی وہیں پر ڈھیر ہو گئے جبکہ باقی طالبان ساتھیوں کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے' ہم نے بھی فوراً گلیوں کا چوک کراس کر کے دوڑ لگا دی اور قیدی ساتھیوں نے بھی اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرپٹ دوڑ لگا دی اور ہم سے بھی آگے نکل گئے' ساتھی گلیوں میں ادھر ادھر لڑاتے دوڑے چلے جا رہے تھے جبکہ میں حسب سابق سب سے پیچھے تھا مگر مسلسل دوڑتا چلا جا رہا تھا' اب ان چیزوں کا وزن میرے لئے برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا' کبھی کبھی تو میرے دل میں خیال آتا کہ لانچر اور راکٹوں کو پھینک دوں اور تیزی سے ساتھیوں سے جا ملوں لیکن پھر اس خدشے کے پیش نظر کہ اگر آگے ان کی ضرورت پڑی تو کیا کروں گا اور سب سے بڑھ کر میرے دل میں خیال آتا کہ یہ ایک امانت ہے جو میرے سپرد کی گئی ہے اور اس سے روگردانی کرنا خیانت ہوگا' یہ خیال آتے ہی میرے دل میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا اور میں دل ہی دل میں اللہ رب العزت سے دعا کرنے لگا کہ الٰہی مجھے استقامت اور ہمت عطا فرما، میں یہ دعا کرتا جا رہا تھا اور اپنی تمام تر توانائیاں مجتمع کر کے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

دوسرے ساتھی اب مجھ سے کافی دور نکل چکے تھے اور میں آہستہ آہستہ خود کو ان کے قریب تر کرنے کی کوشش کر رہا تھا' دور سے میں نے دیکھا کہ آگے والے ساتھی بائیں جانب مڑ چکے ہیں تو میں نے ہمت کر کے کچھ تیز دوڑنا شروع کیا اور جب میں ساتھیوں کے تعاقب میں بائیں طرف مڑا تو دیکھا کہ یہ گلیوں کا اختتام ہے اور آگے اونچا نیچا میدان شروع ہو رہا تھا ابھی میں میدان کی طرف رخ کرنے ہی والا تھا کہ دفعتاً میری نظر گلی کی آخری حویلی کی بالائی منزل پر پڑی جہاں بہت سارے آدمی ہلکا اور بھاری اسلحہ سنبھالے آگے والے ساتھیوں پر فائر کرنے کیلئے پر تول رہے تھے' یہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ اگر وہ لوگ یہاں سے ساتھیوں پر فائر کرتے تو آگے جانے والے ساتھیوں میں سے کوئی بھی نہ بچتا' چنانچہ میں نے

اللہ کا نام لے کر لانچر کا رخ سیدھا کیا جس میں، میں پہلے ہی راکٹ فٹ کر چکا تھا اور اس حویلی سے جو میرے سے تقریباً سو ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلہ پر تھی کی بالائی منزل پر فائر کر دیا، راکٹ لگتے ہی عمارت میں آگ بھڑک اٹھی اور دھماکے ہونے لگے جو کافی دیر تک ہوتے رہے، بالائی عمارت پر موجود اکثر لوگ تقریباً ڈھیر ہو چکے تھے کیونکہ وہاں سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوئی جبکہ میں فائر کرنے کے بعد تباہی کا منظر دیکھتے ہی وہاں سے سرپٹ دوڑ پڑا حالانکہ کچھ دیر پہلے تک مجھ کو چلنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا لیکن اب نجانے میں کس طرح انتہائی تیزی کے ساتھ دوڑ کر ساتھیوں کے پاس جا پہنچا، انجانے خوف کی وجہ سے مجھ میں اتنی ہمت آ گئی یا ساتھیوں کا دفاع کرنے کی خوشی کی وجہ سے...... بہر حال جیسا بھی تھا میں اپنے گروپ میں جا پہنچا، جواب دوڑنے کی بجائے چل رہا تھا، اور گروپ کے ساتھی اردگرد موجود دشمن پر مڑ مڑ کر فائر بھی کرتے جا رہے تھے کہ اچانک ہمارے گروپ میں موجود قاری عبدالجلیل صاحب کو جو مڑ کر فائر کر رہے تھے دشمن کی طرف سے آئی ہوئی گولی ان کے عین دل کے اوپر آ لگی، میں نے اور دوسرے ایک دو ساتھیوں نے ان کو سنبھالا اور زمین پر لٹا دیا دریں اثناء دوسرے تمام ساتھی بھی زمین پر لیٹ چکے تھے، خون فوارے کی طرح قاری صاحب کے سینے سے بہہ رہا تھا اور ان کی زبان پر کلمہ شہادت جاری تھا، چند ہی لمحوں میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ اپنی دیرینہ آرزو کو پا کر شہادت جیسے عظیم رتبے پر فائز ہو گئے۔

اگرچہ کسی ساتھی کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جاتا بلکہ فخر کیا جاتا ہے مگر ایک ساتھی کے بچھڑ جانے کا غم ایک فطری چیز ہے اسی وجہ سے سب ساتھی افسردہ ہو گئے۔ ابھی اس واقعہ کو چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک اور عظیم ساتھی ماسٹر عبدالعزیز صاحب بھی ہم سے جدا ہو گئے، ہوا یوں کہ ماسٹر صاحب کو دور دشمن کے کچھ لوگ نظر آئے تو انہوں نے کھڑے ہو کر فائر کرنا چاہا کہ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور قاری صاحب کی طرح ان کو بھی عین دل کے مقام پر لگی، ماسٹر صاحب گولی کھانے کے باوجود اپنے ٹارگٹ پر فائر کرنے کے بعد ہی چکرا کر نیچے بیٹھے، ہم نے جلدی سے ماسٹر صاحب کو پکڑا اور نیچے زمین پر لٹا دیا، ماسٹر صاحب کی زبان پر کلمہ شہادت جاری تھا، چند ہی لمحوں میں ماسٹر صاحب بھی داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے شہادت

جیسے عظیم رتبے پر فائز ہو گئے۔

ماسٹر عبدالعزیز کے شہید ہونے کے بعد ہم سب ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ موجودہ صورتحال میں کہ جب بچ نکلنے کا ایک فیصد بھی چانس نہیں ہے اور ہمارے چاروں طرف دشمن پھیلے ہوئے ہیں کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ اب لڑ کر شہید ہونے یا بغیر لڑے زندہ گرفتاری دینے کے علاوہ تیسرا کوئی راستہ نہیں تھا' چنانچہ تمام ساتھیوں نے اپنا اٹل فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ ہمیں گرفتار ہونے کی ذلت سے عزت ووقار کے ساتھ لڑ کر شہید ہونا منظور ہے' یہ فیصلہ کرتے ہی سب ساتھی ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے دائرے کی شکل میں پوزیشنیں لے کر لیٹ گئے جبکہ ایک ساتھی احمد کو تمام ساتھیوں کے درمیان میں رکھ کر کلاشنکوف کی میگزینیں بھرنے کا کام اس کے سپرد کر دیا گیا' تمام ساتھیوں نے اپنی اپنی اضافی گولیاں جو میگزینوں کے علاوہ تھیں بھائی احمد کے قریب ڈھیر کر دیں اور ارد گرد دفاعی فائرنگ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ تمام ساتھیوں کو ایک بات کا اور بھی خیال رکھنے کو کہا گیا کہ وہ برسٹ فائر کرنے کی بجائے سنگل سنگل فائر کریں تاکہ زیادہ دیر تک لڑا جا سکے' چنانچہ سب ساتھی اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف سنگل سنگل فائر کر رہے تھے' میں بھی جنوب کی جانب پوزیشن لئے فائر کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک اسی سمت سے میری نظر ایک قوماز (فوجی ٹرک) پر پڑی' جو شمالی اتحاد کے فوجیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ''قول اردو'' کی جانب بڑھا چلا جا رہا تھا' میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنی کلاشنکوف کو ایک طرف رکھا اور لانچر اٹھا کر اس میں راکٹ فٹ کر کے کھڑے ہو کر نشانہ لیتے ہوئے وما رمیت اذ رمیت ولا کن اللہ رما پڑھ کر قوماز (فوجی ٹرک) پر فائر کر دیا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نشانہ بالکل صحیح اپنے ٹارگٹ پر لگا اور قوماز (فوجی ٹرک) اور اس پر بیٹھے ہوئے شمالی فوجیوں کے پرخچے اڑ گئے' میں نے باقی ماندہ راکٹ بھی یکے بعد دیگرے دشمنوں پر پریشر ڈالنے کیلئے مختلف سمتوں میں جہاں کہیں دشمن کے لوگوں کے جمگھٹے نظر آئے فائر کر دیئے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ دشمن کی پیش قدمی جو وہ تیزی سے ہماری طرف جاری رکھے ہوئے تھے وہ تقریباً رک گئی لیکن ان کی طرف سے فائرنگ جواب وہ رک رک کر کر رہے تھے مسلسل جاری تھی' دریں اثناء ہمارے دو اور ساتھی بھی گولیاں لگنے سے

شہید ہو چکے تھے لیکن پھر بھی دوسرے ساتھیوں کے حوصلے بلند تھے اور کسی ساتھی کے چہرے پر پریشانی کے آثار دور دور تک بھی نظر نہیں آ رہے تھے، ہر ساتھی اپنی جگہ عظم و ہمت کا کوہِ گراں معلوم ہو رہا تھا۔

دشمن کے ساتھ ہمارا یہ مقابلہ تقریباً رات کے 9 بجے تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں ہمارے اکثر ساتھی شہید ہو چکے، ہم چار ساتھی ابھی تک زندہ تھے جن میں قاری ابراہیم شدید زخمی حالت میں ہونے کے باوجود دشمن کے ساتھ مقابلے میں لگا ہوا تھا' میں اپنی جگہ لیٹا ہوا تھا اور وقفے وقفے سے سر اٹھا کر دشمن پر فائر کر رہا تھا کہ اچانک کسی گولی کا ایک چھرہ میری دائیں آنکھ کے اوپر والے نرم حصے کو چھیدتا ہوا نکل گیا اور مجھے ایسے لگا کہ جیسے کوئی گرم سلاخ میری آنکھ میں گھس گئی ہو' خون آنکھ کے اوپر والے حصے سے نکل کر میرے چہرے پر بہہ رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب میری بھی شہادت قریب ہے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی معلوم ہوا کہ یہ معمولی سا زخم ہے' چنانچہ میں دوبارہ مستعد ہو کر دشمن پر فائر کرنے لگا' میگزین میں گولیاں ختم ہونے پر میں نے بھائی احمد کو آواز دی کہ مجھے بھرا ہوا میگزین دو، جواب نہ ملنے پر جب میں بھائی احمد کی طرف متوجہ ہوا تو عجیب منظر دیکھا کہ بھائی احمد گولیاں لگنے سے شہید ہو چکے تھے اور آخری میگزین جوان کے ہاتھ میں تھا گولی میگزین کے اوپر رکھ کر ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے دبا کر میگزین میں فٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہو' بھائی احمد نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی لیکن زندگی کے آخری لمحات میں بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوا' میں کرالنگ کرتے ہوئے بھائی احمد کی لاش کے پاس گیا اور میگزین ان کے ہاتھ سے لے لی جو انہوں نے بڑے آرام سے چھوڑ دی حالانکہ جان نکلنے کے بعد انسان کے اعضاء سخت اکڑ جاتے ہیں لیکن یہ شہید کی کرامت تھی کہ میرے پکڑنے پہ اس نے میگزین ایسے چھوڑا جیسے زندہ آدمی چھوڑتا ہے' بہر حال میں میگزین لے کر اپنی جگہ پر آ گیا اور خالی میگزین اپنی کلاشنکوف سے اتار کر بھری ہوئی میگزین کو فٹ کیا اور دوبارہ دشمن پر فائر کرنے لگا ابھی میں نے چند ہی فائر کئے تھے کہ اچانک تڑ تڑاہٹ کی آواز گونجی اور مجھے ایسے لگا کہ جیسے میری بائیں ٹانگ کی پنڈلی میں کئی گرم سلاخیں گھس گئی ہوں' جب میں نے اپنی ٹانگ کی طرف دیکھا تو خون فوارے کی طرح میری ٹانگ

سے نکل رہا تھا' تب مجھے احساس ہوا کہ میری ٹانگ دشمن کی طرف سے چلائی گئی گولیوں کا نشانہ بن چکی ہے، میں نے اپنا رومال ٹانگ پر باندھنے کی کوشش کی لیکن نہ باندھ سکا کیونکہ ٹانگ پر رومال باندھنے کیلئے بیٹھنا پڑتا جبکہ بیٹھنے سے مزید گولیاں لگنے کا اندیشہ تھا' چنانچہ میں نے اپنی ٹانگ کو جوں کا توں چھوڑ دیا اور ہمت کر کے دوبارہ دشمن پر فائر کرنے لگا۔

خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے آہستہ آہستہ مجھ پر نقاہت اور کمزوری طاری ہوتی جا رہی تھی لیکن پھر بھی میں ہمت کر کے دشمن پر مسلسل فائر کر رہا تھا' اچانک کھٹاک کی آواز کے ساتھ ہی میری کلاشنکوف خاموش ہو گئی جب میں نے چیک کیا تو معلوم ہوا کہ گولیاں ختم ہو چکی ہیں' میں نے زخمی ساتھیوں قاری ابراہیم اور بھائی غلام یٰسین کو آواز دے کر گولیوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا'' کہ ہمارے پاس تو کافی دیر سے گولیاں ختم ہو چکی ہیں'' ہم تین ساتھیوں کے علاوہ باقی سب ساتھی شہید ہو چکے تھے جبکہ دو تین مزید ہمارے ساتھی جو ہمارے گروپ سے آگے نکل گئے تھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کس حالت میں ہیں؟

اب ہمارے پاس یونہی پڑے رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ زخمی ہونے کی وجہ سے تینوں میں سے کوئی بھی چلنے کے قابل نہ تھا جبکہ دشمن کی طرف سے مسلسل فائر آ رہے تھے جس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے دشمن آہستہ آہستہ ہمارے قریب تر آتا جا رہا ہے' تھوڑی ہی دیر بعد ہمارا یہ خیال درست ثابت ہوا کیونکہ اردگرد سے واضح آوازیں سنائی دے رہی تھیں' ابھی ہم آوازوں پر غور کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک گرنیڈ جو دشمن نے پھینکا تھا ہمارے قریب آ کر گرا اور ایک دھماکے سے پھٹ گیا جس کے چھروں نے میرے پورے جسم کو چھید کر رکھ دیا دریں اثناء غلام یٰسین کی کراہیں بھی مجھے سنائی دیں کیونکہ میرے ساتھ وہ بھی گرنیڈ کے چھروں کا نشانہ بن چکا تھا جبکہ قاری ابراہیم ہمارے سے کچھ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے گرنیڈ کے چھروں سے محفوظ رہا' میرے اپنے پورچ میں بھی ایک ہینڈ گرنیڈ بچا پڑا تھا جسے میں نے کسی ایسے ہی مشکل وقت کیلئے بچا کر رکھا تھا چنانچہ میں نے اپنے پورچ سے اپنی تمام تر ہمت کو بروئے کار لاتے ہوئے ہینڈ گرنیڈ نکالا جسے اٹھانا بھی میرے لئے بہت

مشکل معلوم ہو رہا تھا' کیونکہ میرے دونوں بازو بھی ہینڈ گرنیڈ کے چھروں سے زخمی ہو چکے تھے لیکن پھر بھی میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہمت کر کے ہینڈ گرنیڈ کے کلپ کو مضبوطی سے دبایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پن کو کھینچ دیا جب دشمن کے سپاہی ہمارے سروں پر پہنچ گئے اور ہمیں زدوکوب کرنے لگے تو میں نے ہمت کر کے گرنیڈ اپنے بالکل قریب پھینک دیا گرنیڈ کے گرتے ہی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ ہی دشمن کے لوگ آہ و بکا اور چیخ و پکار کرنے لگے، میرے اس گرنیڈ حملے میں جو ایک خودکش قسم کا حملہ تھا دشمن کے تین چار آدمی مردار ہو گئے جبکہ بہت سے زخمی ہو گئے لیکن معجزانہ طور پر میں اس حملے میں بالکل محفوظ رہا چنانچہ بچ جانے والے دشمن کے افراد ہماری جگہ سے دور بھاگ گئے اور فائر کرنے لگے جو ہمارے ادھر ادھر لگ رہے تھے چند ہی لمحوں کے بعد فائرنگ کا سلسلہ بند ہو گیا' بعد ازیں دشمن نے ہمارے اوپر بڑے بڑے پتھر پھینکنے شروع کر دیئے جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب جوابی کارروائی کرنے والا کوئی نہیں ہے تو انہوں نے اپنی ٹارچوں کو روشن کیا اور ہمارے سروں پر پہنچ کر شہیدوں کی لاشوں پر مردار خور گدوں کی طرح جھپٹ پڑے انکا اسلحہ' جوتے' کوٹ' پگڑیوں اور جیبوں کا صفایا کرنے لگے' اس کام میں ہر آدمی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور دشمن کے ہر آدمی کی یہ خواہش تھی کہ اس کے حصے میں زیادہ سے زیادہ مال آ جائے' اس کوشش میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑ بھی رہے تھے اور گھتم گھتا ہو رہے تھے' دفعتاً ان میں سے کچھ لوگ میری طرف بھی جھپٹے، میں نے قاری ابراہیم اور غلام یٰسین کی طرح اپنے آپ کو مردہ ظاہر کیا ہوا تھا لیکن چونکہ میری آنکھ زخمی ہونے کی وجہ سے پھڑک رہی تھی اس لئے جب ٹارچ کی روشنی انہوں نے میرے چہرے پر ڈالی تو سب چیخ پڑے ''زندہ است۔ زندہ است ایں زندہ است ''یعنی یہ زندہ ہے' چنانچہ سب سے پہلے تو انہوں نے پیسوں سمیت بوٹوں اور اضافی کپڑوں یعنی چادر' واسکٹ اور کوٹ وغیرہ سے مجھے فارغ کر دیا اور بعد ازیں سب ملکر حسب موقع اور حسب طاقت میری پٹائی کرنے لگے' ٹھڈوں' مکوں اور کلاشنکوفوں کے بٹوں سے انہوں نے میری ایسی ٹھکائی لگائی کہ مجھے اپنی ہڈیاں چٹختی ہوئی اور پستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں' لیکن وہ ظالم تھے کہ بس کرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے' انہوں نے مجھے اس وقت تک خوب مارا

جب تک وہ تھک نہ گئے اور انہیں یقین نہ ہو گیا کہ میں ختم ہو چکا ہوں' تب انہوں نے جا کر بس کیا' اس عرصہ میں میں کئی دفعہ بے ہوش ہو کر ہوش میں آ چکا تھا' جب مجھے وہ اپنی طرف سے ختم کر چکنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے تو اگر چہ میں اپنے ہوش میں تھا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے میری روح جسم کا ساتھ چھوڑ دے گی' کیونکہ میرے اندر سر کو بھی جنبش دینے کی سکت نہیں تھی' دشمن کے لوگوں نے ہم سے کچھ دور جا کر ایک بار پھر کلاشنکوف کے دو چار برسٹ فائر کر دیئے جن میں سے اللہ کے فضل سے ہم تینوں زخمیوں میں سے کسی کو کوئی گولی نہیں لگی' بلکہ فائر کی ہوئی گولیاں زمین میں اور کچھ شہیدوں کے جسموں میں پیوست ہو گئیں اس کے بعد ہر طرف مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔

سمت شمال کی جانب سے آنے والی یخ بستہ ہوائیں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چل رہی تھیں اور ہم بے سروسامانی کی حالت میں میدان میں پڑے ہوئے تھے، دریں اثناء بھائی غلام یٰسین نے مجھے آواز دی۔ حامد...... حامد...... میں نے انتہائی نقاہت کے ساتھ جواب دیتے ہوئے پوچھا...... کیا بات ہے......؟ بھائی غلام یٰسین نے بڑی آہستگی سے پوچھا وہ دشمن کے لوگ چلے گئے ہیں؟ میں نے کہا: ''ہاں، چلے گئے ہیں...... تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بھائی غلام یٰسین پھر گویا ہوئے کہ قاری ابراہیم اٹھ کر کہیں چلا گیا ہے...... میں نے بے خیالی میں کہا چلا گیا ہے تو جانے دو لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ قاری ابراہیم بھی تو ہماری طرح زخمی تھا پھر وہ کیسے چلا گیا......؟ یہ خیال آتے ہی میں نے بھائی غلام یٰسین کو مخاطب کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ ''کیا قاری ابراہیم زخمی نہیں تھا''؟ اس پر بھائی غلام یٰسین نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''اس کے جسم کا اوپر والا حصہ زخمی تھا جبکہ ٹانگوں پر کوئی زخم نہیں تھے اس لیے وہ ہمیں بھی شہید ہی سمجھ کر چلا گیا ہے۔''

تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے اور سونے کی کوشش میں رات گزاری لیکن یہ رات ہمیں بہت طویل محسوس ہو رہی تھی اور ایسے لگتا تھا کہ یہ رات کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے، بہر حال ہم نے یہ رات یونہی بے پناہ اذیت کی حالت میں گزاری اور صبح ہونے کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب چند آدمیوں کا ایک گروہ ہمارے قریب آ دھمکا اور

آتے ہی انہوں نے شہیدوں کی لاشوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ الٹ پلٹ کرنا شروع کردیا اور اُن کی جیبوں کی تلاشی لینے لگے، کچھ لوگ ہماری طرف بھی متوجہ ہوگئے مجھے اور بھائی غلام یٰسین کو زندہ پاکر ٹھڈوں اور مکوں سے ہم دونوں کو مارنا شروع کردیا وہ لوگ ہمیں مارتے بھی جاتے اور ساتھ ساتھ ڈالر بتی...... ڈالر بتی یعنی ہمیں ڈالر دو...... ہمیں ڈالر دو...... قالدار بکش...... قالدار بکش (پاکستان روپے کو وہ لوگ قالدار کہتے ہیں) یعنی روپے نکالو......
بہر حال جو کچھ شہیدوں کی جیبوں میں اور ہمارے پاس رات والے لوگوں سے بچ گیا تھا یہ لوگ نکال کر وہاں سے فوراً رفو چکر ہوگئے، ہم نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا کہ اگرچہ زخمی حالت میں ہی سہی لیکن تاحال زندہ تو ہیں، اس گروپ کے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب صبح کی روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی، شمالی والوں کا ایک اور گروپ ہمارے سروں پر آن پہنچا، انہوں نے بھی پہلے والے لوگوں کی طرح آتے ہی شہیدوں کی لاشوں کی بے حرمتی شروع کردی اور ساتھ ہی ٹھڈوں اور مکوں سے وحشیانہ طریقے سے ہماری بھی درگت بنانا شروع کردی، یہ لوگ بھی پہلے والے لوگوں کی طرح ڈالروں اور روپوں کا مطالبہ کرنے لگے بہرحال اپنی تسلی کر چکنے کے بعد یہ لوگ بھی دفع ہوگئے ان لوگوں کے جانے کے کچھ دیر بعد وردی پوش فوجیوں کا ایک دستہ آن پہنچا اور ایک بار پھر ہم وحشیانہ تشدد برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے لیکن اِن لوگوں نے آتے ہی بغیر بدتمیزی کیئے شہیدوں کو چیک کیا کہ ان میں کوئی زندہ تو نہیں ہے بعد ازاں ہم دونوں کو الگ الگ چادریں بچھا کر بڑے آرام سے ان کے اوپر لٹا دیا اور چار چار آدمیوں نے چادروں پر سٹریچر کی طرح ہمیں اٹھا لیا اور ایک طرف کو چل دیے اور تھوڑی دیر بعد نہر کا پل کراس کرکے وہ لوگ ہمیں لے کر ''قول اردو'' پہنچ گئے اور ہمیں ''قول اردو'' (چھاؤنی) کی مسجد کے سامنے جا کر لٹا دیا۔

زخمی قیدیوں پر شمالی اتحاد کا ظلم وستم

سورج طلوع ہو چکا تھا اور ہلکی ہلکی دھوپ پڑ رہی تھی جس میں ہمیں بہت راحت محسوس ہو رہی تھی لیکن پیاس کی شدت سے میری زبان باہر نکلنے کو تھی لیکن میں اپنے آپ کو ادھر ادھر کی

سوچوں میں مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا' سردست میرے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی جو مجھے ذہنی طور پر کافی پریشان کر رہی تھی وہ یہ کہ جس جگہ آج ہم قیدیوں کی حیثیت سے دشمن کے رحم وکرم پر پڑے ہوئے تھے کل تک یہ جگہ ہمارے قبضہ اور استعمال میں تھی اور ہم یہاں فاتح کی حیثیت سے آزادانہ گھوما پھرا کرتے تھے لیکن آج پانی کے ایک گھونٹ پر بھی ہمارا اختیار نہیں تھا' ابھی میں انہیں سوچوں میں گم اپنی تکلیف اور پیاس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے چند آدمیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ایک دفعہ پھر پیاس کا احساس شدت اختیار کر گیا تو میں نے اپنی تمام تر توانائیوں کو مجتمع کرتے ہوئے زور سے پانی ...... پانی ...... پکارا لیکن حلق کے خشک ہونے اور کمزوری کی وجہ سے میری آواز میرے منہ میں ہی رہی' آنے والوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھا اور میرے ہونٹوں کو ہلتے دیکھا تو وہ میرے قریب آکر میرے اوپر جھک گئے تو میں نے کوشش کر کے پھر پانی، پانی پکارا تو ان میں سے دو آدمیوں نے جنہوں نے بھاری فوجی بوٹ پہنے ہوئے تھے' یک بارگی ٹھڈے میرے منہ اور میرے پیٹ پر رسید کر دیئے اور ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں مجھ سے کہنے لگے کہ ملا عمر کو بلاؤ کہ وہ تمہارے لئے پانی لائے اور پھر بے تحاشا فحش قسم کی گالیاں بکنے لگے تو میں منہ ہی منہ میں آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا' میرے ہونٹ ہلتے دیکھ کر پتہ نہیں وہ کیا سمجھے کہ اچانک سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور فٹبال کی طرح کبھی مجھے ٹھڈوں کے ساتھ ایک طرف پھینکنے لگے اور کبھی دوسری طرف' کمزوری اور حلق کے بالکل خشک ہونے کی وجہ سے' باوجود شدید تکلیف کے میرے منہ سے آہ تک بھی نہیں نکل رہی تھی' ابھی وہ لوگ مجھ پر زور آزمائی کر رہے تھے کہ ایک طویل القامت اور مضبوط جسم والا آدمی تین چار گن مینوں کی معیت میں ایک ہائی فور گاڑی جو ابھی مین گیٹ کی طرف سے ہمارے قریب آکر رکی تھی' سے برآمد ہوا اور آتے ہی ان لوگوں پر جو میری پٹائی کرنے میں بری طرح مگن تھے برس پڑا اور ایک دو کو تھپڑ بھی رسید کر دیئے اور کافی دیر تک ان کو فارسی زبان میں جھاڑیں پلاتا رہا' آنے والا آدمی جو شمالی والوں کا کوئی بڑا کمانڈر محسوس ہو رہا تھا اس وقت میرے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا کیونکہ اس کے آتے ہی وہ لوگ جو وحشیوں کی طرح مجھے زدوکوب کر رہے تھے سہم کر ایک طرف ہٹ گئے اور مجھے ان کے ظلم وستم سے خلاصی نصیب

ہوئی' بعد ازیں آنے والا کمانڈر جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عبدالرب رسول سیاف تھے جو کبھی افغانستان کے مشہور جہادی رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے لیکن بدقسمتی سے اس وقت وہ انڈیا اور روس نوازی میں مبتلا ہو کر احمد شاہ مسعود کے اتحادی بنے ہوئے تھے' وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہوئے مجھ پر جھک گئے اور میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں کہنے لگے کہ غم نہ کرو آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور ان جاہل لوگوں نے جو آپ کے ساتھ سلوک کیا ہے میں اس پہ بہت شرمندہ ہوں' میں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی یا نہیں دے سکا' بس اس کا نرم رویہ دیکھتے ہی پھر میں نے ہونٹوں کو حرکت دینا شروع کی اور پانی ...... پانی ...... پانی پکارنے لگا، میری بات سمجھ کر وہ کمانڈر کہنے لگا کہ اس وقت پانی پینا آپ کیلئے نقصان دہ ہے کیونکہ آپ زخمی ہیں اور زخموں کی حالت میں پانی پینا انتہائی خطرناک ہوسکتا ہے لیکن میں نے اس کی کسی بات پر مطلقاً کوئی توجہ نہیں دی بلکہ میں نے اپنی زبان باہر نکال کر اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میری زبان اور میرا حلق بالکل خشک ہو چکا ہے اور مجھے پانی کی بہت زیادہ پیاس ہے' چنانچہ میری حالت کو دیکھتے ہوئے اس کمانڈر نے نزدیک ہی بہتے ہوئے چشمے سے اپنے ہاتھ سے پانی کا چلو بھرا اور میرے منہ میں ٹپکا دیا جس سے مجھے کچھ سکون حاصل ہوا لیکن پانی پینے کی طلب مزید بڑھ گئی' میرے مانگنے کے باوجود مزید پانی اس کمانڈر نے مجھے نہیں دیا بلکہ مجھے اور بھائی غلام یٰسین کو تسلیاں دینے لگا کہ ابھی گاڑی آتی ہے تو آپ لوگوں کو ہسپتال لے جائیں گے اور آپ لوگوں کا علاج معالجہ کریں گے اور اس کے بعد آپ کو کابل آپکے ساتھیوں کے پاس پہنچا دیں گے' کمانڈر کے منہ سے یہ باتیں سن کر ہم مطمئن ہو گئے کہ ہم جلد ہی اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جائیں گے، لیکن پھر بھی میں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمانڈر کو کہنے کی کوشش کی کہ ہمیں ابھی کابل ہمارے ساتھیوں کے پاس پہنچانے کا بندوبست کریں' میری بات بمشکل سمجھ کر کمانڈر نے کہا کہ آپ بے فکر ہو جائیں ہم پہلے آپ حضرات کا علاج معالجہ کروائیں گے اس کے بعد کابل روانہ کریں گے' بہرحال ہم نے ہمدردی کے چند کلمات کو بھی غنیمت جانا وگرنہ اردگرد کھڑے ہوئے اکثر لوگ ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک بائی فور ڈالہ ہمارے قریب آ کر رکا' مذکورہ بالا کمانڈر نے بائی فور گاڑی کے ڈالے میں گدے بچھوائے اور اس کے بعد چند لوگوں نے مل کر ہمیں گاڑی میں بچھے ہوئے گدوں پر لٹا دیا اور چند گن مین بھی ہمارے ساتھ ہی گاڑی کے ڈالے میں سوار ہو گئے جبکہ کمانڈر اپنی گاڑی میں سوار ہو کر مین روڈ کی طرف روانہ ہو گیا اور ہماری گاڑی جس میں ہمیں سوار کیا گیا تھا کے ڈرائیور کو بھی اپنے پیچھے آنے کا کہہ گیا' چنانچہ ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے کمانڈر کی گاڑی کے تعاقب میں گاڑی دوڑا دی' چار یکار ہسپتال کے اندر داخل ہو کر دونوں گاڑیاں رک گئیں، کمانڈر نے اپنی گاڑی سے اتر کر وہاں پر موجود ڈاکٹروں کو ہدایات دینی شروع کر دیں جس کے بعد ہسپتال کا دوسرا عملہ حرکت میں آ گیا اور ہمیں گاڑی سے اتار کر سٹریچروں کے ذریعہ ہسپتال کے اندر لے گئے اور بیڈوں پر لٹا دیا' مذکورہ بالا کمانڈر ہمیں ہسپتال پہنچا کر ایسا غائب ہوا کہ پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا' بہر حال ہم ہسپتال کے بیڈوں پر لیٹے منتظر تھے کہ کب ہماری مرہم پٹی وغیرہ کی جاتی ہے' لیکن کافی دیر تک کوئی بھی آدمی ہمارے قریب تک نہیں پھٹکا جبکہ ہمارے زخموں سے اب تک خون رس رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخموں میں درد شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

میں اردگرد سے بے خبر بیڈ پر لیٹا تکلیف کی وجہ سے کراہ رہا تھا کہ اچانک کسی خیال کے تحت میں نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو میں حیران رہ گیا کیونکہ میرے دائیں اور بائیں بیڈوں کی مزید دو لائنیں تھیں جہاں بھائی غلام یٰسین کے علاوہ ہمارے اور بھی ساتھی زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے جن میں قاری ابراہیم بھی شامل تھا' حالانکہ پہلے میرے ذہن میں یہی تھا کہ فقط ہم دو ساتھی زخمی حالت میں یہاں ہیں، ابھی میری حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور افتاد آن پڑی وہ یہ کہ چند مسلح آدمی دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور آتے ہی زخمی ساتھیوں کو تنگ کرنے لگے' دفعتاً آنے والے لوگوں کا سرغنہ میری طرف متوجہ ہوا اور میرے پاس آ کر انڈین فلموں سے یاد کی ہوئی گالیاں بکنے لگا اور مجھ سے کہنے لگا کہ تو ابھی تک زندہ ہے' حالانکہ گزشتہ رات ہم تو تجھے اپنی طرف سے ختم کر آئے تھے' میں نے ہمت کر کے اسے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "جسے اللہ رکھے اسے کوئی نہیں مار سکتا" میری بات سن کر اس نے انتہائی غصے

کے ساتھ کلاشنکوف کا بٹ میرے پیٹ پر دے مارا جس کی وجہ سے میرے منہ سے ایک تیز کراہ نکل گئی اور درد کی شدت سے میں دوھرا سا ہو گیا' مارنے کے بعد وہ ظالم مجھ سے کہنے لگا کہ میں دیکھتا ہوں اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچاتا ہے' دراصل یہ آدمی اس وقت سے مجھے جانتا تھا جب چاریکار پر ہمارا قبضہ تھا، اس وقت یہ آدمی ہماری بہت چاپلوسی کیا کرتا تھا اور اپنے آپ کو طالب ظاہر کر کے اکثر ''قول اردو'' (چھاؤنی) میں ہمارے پاس آیا کرتا تھا اور ہم بھی اس کا احترام کیا کرتے تھے اور اسے آنے جانے سے منع نہیں کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اکثر ہمارے لئے مخبری بھی کیا کرتا تھا اور ان لوگوں کی نشاندہی کرتا تھا جنہوں نے اسلحہ گھروں میں چھپایا ہوا تھا' لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ آدمی ڈبل کراس ہے' یعنی اپنا اعتماد بحال رکھتے ہوئے اندر ہی اندر ہماری جڑیں کاٹتا رہا' بہر حال مذکورہ آدمی ابھی میرے ساتھ بدکلامی میں مصروف تھا کہ ایک ڈاکٹر اور اس کے چند معاونین کمرے میں داخل ہوئے تو میری اس منحوس سے خلاصی ہوئی اور وہ ڈاکٹر کے پاس جا پہنچا جو میرے قریب ہی ایک زخمی کا معائنہ کر رہا تھا اور اس کے ساتھ کانا پھوسی کرنے لگا اور میری طرف اشارے کرنے لگا' تھوڑی دیر بعد وہ آدمی ڈاکٹر کو لے کر میرے قریب آ گیا جہاں کھڑے ہو کر وہ فارسی زبان میں ایک دوسرے سے بحث کرنے لگے' مجھے چونکہ اس وقت تک فارسی زبان زیادہ نہیں آتی تھی اس لئے مجھے تو سمجھ نہ لگ سکی لیکن کچھ الفاظ جو میری سمجھ میں آئے ان سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ آدمی ڈاکٹر سے مطالبہ کر رہا تھا کہ اس آدمی کو (یعنی مجھے) میرے حوالے کر دو' جبکہ ڈاکٹر اس کمانڈر کا حوالہ دے کر جو ہمیں چھوڑ گیا تھا اپنی مجبوری ظاہر کر رہا تھا' تھوڑی دیر تک ان کے درمیان بحث مباحثہ ہوتا رہا' میں چونکہ مکمل طور پر انہیں کی طرف متوجہ تھا اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا کہ ''یا اللہ! مجھے اس ظالم کے شر سے محفوظ فرما'' چنانچہ ان کی بحث ختم ہونے پر میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں کسی بات پر متفق ہو گئے ہیں' بحث کے ختم ہوتے ہی وہ آدمی پھر میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ ''اوہ پنجابی! کل تو بچ گیا تھا لیکن اب نہیں بچے گا'' یہ کہہ کر اور کچھ مزید گالیاں بک کر وہ آدمی ہسپتال سے نکل کر چلا گیا تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کیونکہ اس کے ساتھ آنے والے بھی اسی کے ساتھ چلے گئے تھے ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے ساتھ آنے

والوں میں سے بھی کوئی مجھے مشق ستم بنائے گا' لیکن ان کے جانے کے بعد ایک اور مصیبت ڈاکٹر کی شکل میں مجھ پر آن پڑی' ہوا یوں کہ وہ لوگ جونہی باہر نکلے تو ڈاکٹر جو میرے قریب ہی کھڑا تھا مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ ''اگر چاہتے ہو کہ تمہاری مرہم پٹی کروں تو مجھے دس ہزار روپے دو'' حالانکہ دوسرے سب زخمیوں کی مرہم پٹی ہو چکی تھی اور اکثر زخمیوں کو توانائی بحال کرنے کیلئے ڈرپیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں' مگر ڈاکٹر کا مجھ سے دس ہزار روپے کا مطالبہ کرنا، مجھے بہت عجیب معلوم ہوا اور میں نے ڈاکٹر کو جواب دیتے ہوئے کہا ''اس وقت میرے پاس دس ہزار روپے کہاں سے آ گئے کیونکہ میرے پاس جو رقم تھی وہ تمہارے لوگوں نے مجھ سے چھین لی ہے اور ایک کوڑی بھی میرے پاس نہیں چھوڑی'' مگر ڈاکٹر مسلسل اصرار کر رہا تھا کہ مجھے دس ہزار روپے چاہئیں' آخر کار میں نے مجبور ہو کر کہا کہ ''میں تمہیں ایک رقعہ لکھ کر دیتا ہوں اسے کابل میں ہمارے ساتھیوں کے پاس لے جاؤ تمہیں دس ہزار کی بجائے پچاس ہزار مل جائیں گے لیکن خدارا میری مرہم پٹی کرو'' لیکن ڈاکٹر میری اس بات پر ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اپنے مطالبے پر ویسے ہی اڑا ہوا تھا' آخر تنگ آ کر میں نے اسے کہا کہ ''تم ہی بتاؤ کہ اس وقت جب کہ میں تمہارے ہاتھوں میں قید ہوں میرے جسم پر موجود کپڑوں کے ایک جوڑے کے علاوہ ہر چیز تمہارے لوگ مجھ سے چھین چکے ہیں' میں تمہارے لئے دس ہزار روپے کہاں سے لاؤں'' اس مطالبہ کا مقصد فقط مجھے اذیت دینا تھا کیونکہ ڈاکٹر کو بخوبی علم تھا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے' بہر حال اس ڈاکٹر نے اپنے پیشے سے غداری کرتے ہوئے خباثت کی انتہا کر دی اور میری ٹانگ جو زیادہ زخمی تھی اسے صاف کئے اور کوئی دوا وغیرہ لگائے بغیر کریپ بینڈیج (گرم پٹی) انتہائی سختی کے ساتھ کس کر باندھ دی اور دو چار فحش قسم کی گالیاں بکتا ہوا وارڈ سے باہر نکل گیا۔

ہم دو دن تک اسی ہسپتال میں رہے، ان دو دنوں میں جہاں ہمیں ہر وقت گالیوں اور دشمن کے لوگوں کے غیض و غضب کا سامنا کرنا پڑا وہاں ایک عجیب واقعہ ہمارے دیکھنے میں آیا وہ یہ کہ تقریباً صبح' دوپہر اور شام کے وقت جب ڈاکٹر اور ہسپتال کا عملہ اور ادھر ادھر کے دوسرے لوگ وارڈ میں موجود نہیں ہوتے تھے تو ایک بوڑھا سفید ریش آدمی انتہائی خاموشی کے ساتھ وارڈ میں داخل ہوتا اور ہم سب زخمیوں کے سرہانے ایک ایک سیب رکھ کر اسی طرح

خاموشی سے باہر نکل جاتا، جب تک ہم اس ہسپتال میں رہے اس بوڑھے آدمی کا یہی معمول رہا‘ اس واقعہ کو میں عجیب اس لئے نہیں کہہ رہا کہ یہاں کوئی ہم سے ہمدردی کر رہا تھا بلکہ یہاں پر طالبان کو چاہنے والے بہت لوگ تھے، عجیب اس لئے ہے کہ مسلح پہرے کے ہوتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر کسی کی بھی ان حالات میں طالبان کے ساتھ فقط ہمدردی ہی ثابت ہو جائے تو اس کا انجام اس کے مکمل خاندان سمیت بہت برا ہوگا یہ ہمت کرنا کہ طالبان یعنی ہمارے لئے نہ صرف ہمدردی رکھنا بلکہ اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے تینوں وقت ہمارے لئے سیب پہنچانا واقعتاً ایک بہت بڑی بات تھی‘ بہر حال تقریباً تیسرے دن ایک ایک ساتھی کو سٹریچر پر باہر لے جایا جانے لگا تو میں یہ دیکھ کر دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ اللہ کرے یہ لوگ ہمیں جیسا کہ کمانڈر نے کہا تھا ”کہ تمہیں تمہارے ساتھیوں کے پاس کابل پہنچا دیں گے“ ہمیں کابل میں ہمارے ساتھیوں کے پاس پہنچا دیں‘ سب سے آخر میں میرا نمبر بھی آ گیا‘ چنانچہ مجھے بھی سٹریچر پر ڈال کر باہر لے جایا گیا جہاں ایک فوجی گاڑی کھڑی ہوئی تھی، اچانک میری نظر گاڑی کی چھت پر پڑی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ گاڑی کی پلین چھت کے اوپر دوسرے زخمی ساتھیوں کو لٹایا ہوا تھا مجھے بھی دو تین آدمیوں نے پکڑ کر کسی بے جان چیز کی طرح انتہائی بے دردی کے ساتھ چھت پر پہنچا دیا اور چھت پر لیٹے ہوئے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مجھے بھی ٹھونس دیا پھر ایک موٹے رسے کے ساتھ جس طرح گاڑی کی چھت پر سامان کو باندھا جاتا ہے ہمیں بھی انتہائی سختی کے ساتھ باندھ دیا گیا اور گاڑی جبل السراج کی طرف روانہ ہوگئی۔ گاڑی کے اندر شمالی اتحاد کے مسلح فوجی بیٹھے ہوئے تھے جبکہ کچھ فوجی گاڑی کے باہر گاڑی کے پائیدانوں پر پاؤں رکھے لٹکے ہوئے تھے‘ گاڑی اپنی منزل کی طرف انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں تھی اور گاڑی کی چھت پر بوریوں کی مانند بندھے ہوئے ہم تمام ساتھیوں کی تکلیف کے مارے چیخیں نکل رہی تھیں کیونکہ گاڑی کا ڈرائیور قصداً ہمیں تکلیف دینے کیلئے تیز رفتار گاڑی کو ادھر ادھر کر رہا تھا اور کبھی یک دم بریک لگا دیتا تھا جس کی وجہ سے ہماری چیخیں نکل جاتی تھیں جن کو سن کر نیچے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اور باہر لٹکے ہوئے شمالی اتحاد کے فوجی قہقہے لگا رہے تھے، بہر حال یہ انتہائی جان سوز اور تکلیف دہ مرحلہ اس وقت ختم ہوا جب

گاڑی گل بہار روڈ پر جبل السراج کی ایک عمارت کے مین گیٹ پر جا کر رک گئی اور ہمارے اوپر لپیٹا ہوا رسہ کھول دیا گیا' بعدازیں ہمیں گاڑی کی چھت سے اتار کر عمارت کے اندرونی کمروں میں منتقل نہیں بلکہ پھینک دیا گیا۔اور ہم دو دو ساتھیوں کو ایک ایک کمرے میں بے دردی سے پھینک کر کمروں کے دروازے بند کر دیئے گئے' یہ رات ہم نے انہیں سرد کمروں میں ٹھٹھرتے ہوئے اور زخموں کی تکلیف سے کراہتے ہوئے گزاری' اگلے دن جب سورج نے طلوع ہو کر تمام عالم کو منور کر دیا تو ہمیں کمروں سے نکال کر ایک فوجی ٹرک میں ٹھونسنا شروع کر دیا گیا لیکن غنیمت یہ ہوئی کہ اس بار ہمیں اٹھانے والے شمالی اتحاد کے فوجیوں کی بجائے وہ طالبان تھے جو حالیہ جنگ میں گرفتار ہو کر آئے تھے اور خوش قسمتی سے زخمی نہیں تھے' ان اسیر طالبان ساتھیوں نے ہم زخمیوں کو انتہائی احتیاط اور شفقت کے ساتھ اٹھا کر ٹرک میں منتقل کر دیا' اس ٹرک میں اسیر ساتھی بہت زیادہ تھے جس کی وجہ سے ہم زخمی ساتھیوں کیلئے بہت مشکل پیش آ رہی تھی' لیکن وہ طالبان ساتھی جو زخمی نہیں تھے انہوں نے کمال ہمدردی کرتے ہوئے خود تنگ ہو کر اور ادھر ادھر سمٹ کر ہم زخمی ساتھیوں کے لیے کچھ آسانی پیدا کر دی۔ چنانچہ جب تمام ساتھیوں کو سوار کیا جا چکا تو ٹرک کے ڈرائیور نے ٹرک کو حرکت دی اور ٹرک گل بہار کی طرف روانہ ہو گیا' کچا روڈ ہونے کی وجہ سے ٹرک ہچکولے کھاتا ہوا اور اچھلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا جس کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی اس لیے کہ میرا پورا جسم زخمی تھا اور جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں زخم نہ ہوں اس لئے میں مسلسل کراہ رہا تھا' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک افغانی طالب ساتھی نے شمالی اتحاد کے فوجیوں (جو ٹرک پر موجود تھے) کی ڈانٹ ڈپٹ سننے اور ان کے منع کرنے کے باوجود میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا' انتہائی شفقت اور محبت کے ساتھ مجھے حوصلہ دینے لگا اور میری ہمت بندھانے لگا۔

ٹرک جب گل بہار شہر سے گزر کر درہ پنجشیر میں داخل ہوا تو تنگی پنجشیر پر پہنچ کر ٹرک روک دیا گیا کیونکہ آگے سڑک کو توڑ کر ناقابل گزر بنا دیا گیا تھا' سڑک توڑنے کی وجہ یہ تھی کہ جب طالبان نے کابل فتح کیا تو احمد شاہ مسعود اپنی فوج سمیت بھاگ کر درہ پنجشیر میں جا گھسا اور سڑک کو اس جگہ سے ڈائنامائٹ سے اڑا دیا جہاں سے درہ پنجشیر میں بہنے والا دریا بالکل

سڑک کے ساتھ سے ہو کر گزرتا تھا اور سڑک کی دونوں جانب بلند پہاڑ تھے' جو بالکل سڑک اور دریا سے متصل تھے اور بائیں طرف والا پہاڑ کافی حد تک سڑک پر جھکا ہوا تھا اور اسی لئے یہ جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے تنگئ پنجشیر کے نام سے مشہور ہے۔

جب ٹرک ٹوٹی ہوئی سڑک کے قریب رکا تو تمام قیدیوں کو ٹرک سے نیچے اترنے کا حکم ملا' چنانچہ تمام تندرست قیدی جو زخمی نہیں تھے ٹرک سے نیچے اترے اور انہیں قیدی ساتھیوں نے ہم زخمیوں کو بھی بڑی احتیاط کے ساتھ اٹھا کر نیچے اتارا' جب سب زخمیوں کو ٹرک سے اتارا جا چکا تو شمالی اتحاد کا کمانڈر جو قیدیوں کو جیل تک پہنچانے کا ذمہ دار تھا، اس نے تندرست قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''زخمی قیدیوں کو اٹھاؤ اور سڑک کے ٹوٹے ہوئے حصے (جو تقریباً سو ڈیڑھ سو قدم تھا) کو عبور کر کے جہاں پر دوبارہ سڑک شروع ہوتی ہے وہاں پر پہنچاؤ'' چنانچہ طالبان قیدی ساتھی ہم زخمیوں کو اٹھا کر چل پڑے اور قابل گزر (گاڑیوں کیلئے) سڑک دوبارہ جہاں سے شروع ہوتی تھی وہاں پر انہوں نے جہاں بن پڑی ہمیں لٹا دیا' جو ساتھی مجھے اٹھا کر لایا تھا وہ اگرچہ جسامت اور قد کاٹھ کے لحاظ سے کافی مضبوط معلوم ہوتا تھا لیکن جب وہ مجھے اٹھا کر ٹوٹے پھوٹے اور اونچے نیچے راستے سے آرہا تھا تو بری طرح ہانپ رہا تھا اور کئی جگہ تو گرتے گرتے بچا جہاں پر اس نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا' دوسرے زخمیوں کو اٹھا کر لانے والے ساتھیوں کا بھی تقریباً یہی حال تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ دو دن سے انہیں کھانے کیلئے کچھ نہیں دیا گیا تھا بلکہ ان دنوں میں انہیں مسلسل تشدد اور ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا اسی لئے اکثر طالبان ساتھیوں کے چہروں پر نیل پڑے ہوئے تھے اور ان کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے جبکہ کئی ساتھیوں کے چہروں' پیشانیوں اور سروں پر گہرے گھاؤ بھی نظر آرہے تھے' یہی وجہ تھی کہ جونہی وہ ساتھی تباہ شدہ سڑک سے صحیح سڑک پر پہنچے تو ہمیں وہیں لٹا کر خود بھی بے سدھ ہو کر لیٹ گئے لیکن ان کو یہ تھوڑی دیر سستانا بہت مہنگا پڑا اور ساتھ ہی ہماری شامت بھی آگئی کیونکہ وہاں پر پہلے سے موجود اور ہمارے ساتھ آنے والے شمالی اتحاد کے فوجی ان ساتھیوں کے لیٹنے کو بہانہ بنا کر ان پر پل پڑے اور ٹھڈوں مکوں اور کلاشنکوف کے بٹوں کے ساتھ ان کو اور ہمیں بری طرح مارنے لگے' ہر طرف سے آہ وفغاں اور چیخوں کی آوازیں آنا

شروع ہو گئیں، تمام اسیر ساتھی مار پیٹ کی شدت کی وجہ سے بلبلا اٹھے اور اکثر ساتھی آہوں اور چیخوں کی صورت میں اللہ اللہ پکار رہے تھے۔

اس وقت عجیب قسم کا منظر تھا، کوئی سخت سے سخت دل رکھنے والا مسلمان بلکہ شاید کوئی انسان اس جگہ پر پیش آمدہ منظر کو دیکھنے اور سننے کی تاب نہ لا سکے لیکن شمالی اتحاد کے فوجی تھے کہ ان پر ہماری چیخ و پکار اور آہ و فغاں کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہو رہا تھا بلکہ ان کے رویے سے معلوم ہو رہا تھا کہ ہماری آہ و فغاں اور چیخ و پکار سے یہ ظالم لطف اندوز ہو رہے ہوں اور اس ظلم وستم سے بڑھ کر ان کا کوئی اور مشغلہ نہ ہو حالانکہ طالبان کا رویہ اپنے دشمنوں کے ساتھ تحریک کی ابتداء سے لیکر آج تک نہایت ہی مشفقانہ رہا ہے اور طالبان نے کبھی بھی گرے ہوئے دشمن پر وار نہیں کیا بلکہ وہ اس چیز کو نامردی اور بے غیرتی تصور کرتے ہیں اور بد سے بدترین دشمن کو بھی گلے لگانے سے گریز نہیں کرتے جس کی زندہ مثالیں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں مثلاً:

''ایک دفعہ میں دوپہر کے وقت چاریکار ''قول اردو'' (چھاؤنی) کے مطبخ میں افغانی ساتھیوں کے ساتھ کھانا لینے کے انتظار میں کھڑا تھا کہ طالبان کے معروف کمانڈر ملا سیف الرحمٰن منصور مطبخ میں داخل ہوئے اور مطبخ میں کام کرنے والوں (جو سب کے سب چاریکار ہی کے رہنے والے تھے) سے نہایت شیریں زبان میں ان کے مسائل وغیرہ دریافت کرنے لگے' دفعتاً ایک آدمی ڈرتے ڈرتے اور نہایت سہمے ہوئے انداز میں کمانڈر سیف الرحمٰن منصور سے باتیں کرنے لگا' تھوڑی دیر باتیں سننے کے بعد کمانڈر سیف الرحمٰن منصور نے متذکرہ آدمی کو گلے سے لگایا اور کچھ کہنے لگا، بعدازیں اپنے ساتھ آئے ہوئے ساتھیوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے کچھ کہا جسے سن کر وہ ساتھی فوراً مطبخ سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دس دس ہزار افغانی کرنسی کی تین چار گڈیاں تھیں جو اس نے آتے ہی سیف الرحمٰن منصور کو تھما دیں اور کمانڈر سیف الرحمٰن منصور نے نوٹوں کی گڈیاں اس آدمی کو تھما دیں جس کو کمانڈر صاحب نے تھوڑی دیر قبل گلے سے لگایا تھا۔

میں یہ سارا تماشا نہایت تعجب سے دیکھ رہا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کیا

ماجرا ہے؟ کیونکہ مجھے پشتو اور فارسی وغیرہ ابھی تک اچھی طرح سمجھ نہیں آتی تھی، چنانچہ میں نے بھائی عبدالحمید صاحب جو ہمارے گروپ کا افغان طالب تھا اور میرے قریب ہی کھڑا تھا، اس سے پوچھا کہ ''یہ کیا چکر تھا؟'' اس پر عبدالحمید نے بتایا ''یہ آدمی جسے کمانڈر سیف الرحمٰن منصور نے رقم کی گڈیاں دی ہیں یہ شمالی اتحاد کے فوجیوں میں سے ہے جو کچھ دن پہلے تک طالبان کے خلاف شمالی اتحاد کی طرف سے صف اول میں رہ کر لڑا کرتا تھا اور اس نے کئی بار طالبان کو کافی نقصان بھی پہنچایا ہے، اب اسے کچھ مسئلہ درپیش تھا جس میں اسے کچھ پیسوں کی اشد ضرورت تھی چنانچہ وہ (بقول اس کے اپنے) شمالی اتحاد کے بڑے کمانڈروں کے پاس اپنی التجا لے کر گیا لیکن انہوں نے اسے دھتکار دیا اور اس کی مجبوری پر بالکل کوئی توجہ نہ دی اور آج یہ متذکرہ شخص اپنے ہم قوم باورچیوں جو ہمارے ہاں ''قول اردو'' (چھاؤنی) میں کام کرتے ہیں اُن کے کہنے پر چھاؤنی آیا اور باورچی خانہ میں طالبان کے کسی ذمہ دار کا انتظار کر رہا تھا چنانچہ جونہی کمانڈر سیف الرحمٰن منصور باورچی خانہ میں داخل ہوا تو یہ متذکرہ شخص پہلے تو بہت ہی خوف زدہ تھا کیونکہ اسے اپنے کرتوت اچھی طرح یاد تھے کہ وہ کس طرح ان طالبان ساتھیوں پر ظلم وستم کیا کرتا تھا جو اس کے اپنے علاقہ کے رہنے والے ہوتے تھے، لیکن بعد ازیں یہ شخص ہمت کر کے کمانڈر صاحب کے روبرو پیش ہو گیا اور ڈرتے ڈرتے اپنی مشکل اور پریشانی کمانڈر سیف الرحمٰن صاحب کے سامنے بیان کی، آپ لوگوں کے سامنے ہے کہ کمانڈر صاحب نے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ اس کی مشکلات سنیں اور نہ صرف سنیں بلکہ اس آدمی کو انتہائی شفقت کے ساتھ اپنے گلے لگایا اور فوراً اسکی مشکل حل کر دی، حالانکہ کمانڈر سیف الرحمٰن منصور اس شخص سے اور اس کے سابقہ سیاہ کارناموں سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن انہوں نے اس شخص کے (جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا محمد نبی) ساتھ مطلقاً اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی بلکہ نیکی کی چند نصیحتیں کرنے کے بعد اسے رخصت کر دیا، عبدالحمید نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کمانڈر صاحب نے اس پر بالکل کوئی احسان نہیں جتایا بلکہ صرف یہ کہا ''بحیثیت حکمران اپنی رعایا کا خیال رکھنا ہماری ذمہ داری ہے اور یہ کام ہمارے فرائض میں شامل ہے''

اسی طرح ایک بار ہماری چاریکار شہر والی قرار گاہ (قیام گاہ) جو عارضی جیل بھی تھی، اس میں شمالی اتحاد کے دو مسلح فوجیوں کو گرفتار کر کے لایا گیا جو چاریکار کے ایک شورش زدہ علاقے میں ایک گھر میں چھپ کر طالبان پر فائرنگ کر رہے تھے جس کے نتیجے میں کئی طالب ساتھی زخمی بھی ہوگئے، بعد ازیں طالبان نے چھاپہ مار کر انہیں گرفتار کر لیا اور ہمارے پاس عارضی جیل میں پہنچا دیا' ان قیدیوں کو ہمارے پاس پہنچانے والے طالبان ساتھیوں نے ہمیں تاکید کرتے ہوئے کہا کہ "ان کی خوب نگرانی کرو تاکہ یہ بھاگنے نہ پائیں اور ان کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا بھی خیال رکھیں تاکہ انہیں آپ لوگوں سے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے"

ایک دن بعد جب طالبان کا ایک ذمہ دار اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ہمارے پاس آیا تو اس نے خیریت پوچھنے کے بعد ہمیں کہا کہ ان دو قیدیوں کو سیل سے باہر لاؤ تاکہ انہیں کابل روانہ کیا جائے' چنانچہ شمالی اتحاد کے ان فوجیوں کو باہر لایا گیا تو کمانڈر صاحب جوان کو کابل روانہ کرنے کیلئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے نہایت شفقت کے ساتھ ان کا حال پوچھنے لگے اور ان کا دل بہلانے کیلئے گپ شپ کرنے لگے' ان کے درمیان ہونے والی بات چیت کا ترجمہ ہمارا ایک پشتون ساتھی ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ہمارے لئے کرتا جا رہا تھا' اچانک ان قیدیوں میں سے ایک قیدی رونے لگا اور دور نظر آنے والے پہاڑ کی جانب اپنی پرنم آنکھیں گاڑ کر انتہائی جذباتی انداز میں کہنے لگا "کمانڈر صاحب وہ سامنے پہاڑ پر میرا گھر ہے وہاں پر میری بوڑھی ماں جو چل پھر نہیں سکتی اسے میں ہی اٹھا کر ادھر ادھر لے جاتا ہوں وہ کس قدر بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی اور اسے ضروریات کے لئے کون اٹھا کر لے جاتا ہوگا؟ اس کے علاوہ میرے دو چھوٹے بچے ہیں جو رو رو کر اپنی ماں یعنی میری بیوی سے پوچھ رہے ہوں گے کہ اماں...... ابا کہاں گئے وہ کیوں گھر نہیں آئے؟ وہ ان کو کیسے بہلاتی ہوگی؟ اس قیدی کی یہ جذبات میں ڈوبی ہوئی گفتگو کمانڈر صاحب بڑے انہماک سے سن رہے تھے اور ان کی آنکھیں بھی اس قیدی کی جذباتی گفتگو سن کر پرنم ہو چکی تھیں جنہیں صاف طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔

کمانڈر صاحب نے تسلی کے ساتھ اس شخص کی گفتگو سننے کے بعد دونوں قیدیوں کو مخاطب

کرتے ہوئے کہا ''حق کو پہچاننے کی کوشش کرو اور اپنی آنکھوں سے غفلت کی پٹی کو اتار پھینکو اور شر و فساد پھیلانے والوں کا ساتھ دینے اور انہیں کسی بھی قسم کی قوت پہنچانے سے باز آ جاؤ ورنہ کل قیامت کے دن خالق و مالک کائنات کے سامنے شرمندگی، رسوائی اور دردناک عذاب سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا'' یہ چند نصیحتیں کرنے کے بعد کمانڈر صاحب اپنے ساتھ آئے ہوئے ساتھیوں سے مخاطب ہوئے اور ان سے کہا کہ ''ان دونوں قیدیوں کو کابل لے جانے کی بجائے ان کے قریہ (گاؤں) کی حدود میں چھوڑ آؤ کیونکہ میں انہیں آزاد کر رہا ہوں' اپنی آزادی کا سن کر دونوں قیدی کمانڈر صاحب اور طالبان کو بہت دعائیں دینے لگے''

یہ تو طالبان کا رویہ تھا اپنے دشمنوں کے ساتھ لیکن وہی دشمن جن کے ساتھ طالبان اعلیٰ ترین اخلاق سے پیش آیا کرتے تھے آج وہی ہم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے اور انتہائی بری طرح سب اسیروں کو ہم زخمیوں سمیت زدوکوب کر کے لطف اندوز ہو رہے تھے اور انسانیت کی ذرہ بھر رمق بھی ان میں دکھائی نہیں دے رہی تھی، بہرحال جب وہ لوگ ہمیں مار مار کر تھک گئے تو ہمیں اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے سے دور پھینکنے لگے، میں نے دیکھا کہ بھائی غلام یٰسین کو دو درندہ صفت شمالی اتحادی فوجیوں نے اٹھا کر وہاں پر کھڑے ہوئے دیوہیکل ٹینک کے چین کے بالکل ساتھ پھینک دیا ابھی میں یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ انہیں دو فوجیوں نے مجھے بھی اٹھا کر بھائی غلام یٰسین کے قریب بے دردی کے ساتھ پھینک دیا جس سے مجھے بہت زیادہ تکلیف ہوئی اور کوشش کے باوجود میرے منہ سے تیز کراہیں نکلنے لگیں اور کراہتے ہوئے میں نے ان کو غصے سے اردو میں دو چار کھری کھری سنا دیں جس کی ان کو سمجھ لگی یا نہ لگی لیکن مجھے اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑی کیونکہ میرے منہ سے الفاظ سن کر وہ دونوں جنہوں نے مجھے یہاں پھینکا تھا ایک بار پھر مجھ پر پل پڑے اب میرے پاس کراہنے اور چیخنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ زبان کھولنے کا انجام میں پہلے ہی بھگت رہا تھا، بہرحال جب ان دونوں کا دل خوب ٹھنڈا ہو گیا تو وہ مجھے وہیں چھوڑ کر کچھ دور کھڑے اپنے ساتھیوں کے پاس چلے گئے، میرے ذہن سے ان کی مار پیٹ کے دوران بھائی غلام یٰسین اور اس ٹینک کا خیال جس کی چین کے نیچے میں بھائی غلام یٰسین کے ساتھ پڑا ہوا تھا، نکل چکا تھا اس وقت فقط ان کی مار پیٹ سے زخموں میں

ہونے والا درد اور ٹیسیں تھیں اور میری کراہیں، اردگرد کی مجھے بالکل کوئی خبر نہیں تھی، دفعتاً بھائی غلام یٰسین کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جو مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، جب میں نے تھوڑا سا غور کیا تو میرے قریب ہی پڑا ہوا بھائی غلام یٰسین مجھے حامد ...... حامد ...... کہہ کر پکار رہا تھا ...... تو میں نے اسے جواب دیتے ہوئے نقاہت کے ساتھ پوچھا ''ہاں ...... کیا بات ہے؟ میرے پوچھنے پر اس نے جو بات کی اسے سن کر ایک دفعہ تو میرے بھی اوسان خطا ہو گئے اور اس لمحے زخموں کا درد اور تکلیف مجھے بھول گئی اور اپنے اوپر جھکے ہوئے دیوہیکل ٹینک پر میری نظریں گڑ گئیں اصل میں بھائی غلام یٰسین نے بات ہی ایسی کہی تھی جو حقیقت کے بالکل قریب لگ رہی تھی یعنی بھائی غلام یٰسین نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے توجہ ٹینک کی طرف دلائی تھی اور نقاہت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا تھا ''بھائی حامد ...... یہ لوگ اب ٹینک ہمارے اوپر سے گزاریں گے ...... کلمہ وغیرہ پڑھ لو ......'' اس بات کو سن کر میرا پریشان ہونا ایک فطری بات تھی جبکہ ٹینک بھی ہمارے بالکل اوپر جھکا ہوا کھڑا تھا ...... لیکن جلد ہی میں نے اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور پھر میں نے بھائی غلام یٰسین کو جواب دیتے ہوئے کہا ''غلام یٰسین بھائی! فکر نہ کرو ...... اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائیں گے ...... اور ہمارے ساتھ بہتری والا معاملہ فرمائیں گے ...... اور اگر شہادت کا وقت آن پہنچا ہے تو اس سے ہمیں خوش ہونا چاہیے نہ کہ پریشان ...... کیونکہ یہی تو ہماری سب سے بڑی آرزو ہے کہ اللہ کی راہ میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور شہادت جیسے عظیم مرتبہ کو پالیں'' میری بات سن کر بھائی غلام یٰسین قدرے مطمئن ہو گیا اور ذکر اللہ میں مصروف ہو گیا جبکہ میں نے بھی دل میں ہی دل میں قرآن کریم کی وہ آیات جو مجھے ازبر تھیں، انکی تلاوت کرنے لگا۔ شمالی اتحاد والوں نے ہمارے اوپر سے ٹینک گزارنے کے لیے ٹینک سٹارٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بسیار کوشش کے باوجود ٹینک ان سے سٹارٹ نہ ہوا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد پنجشیر کی جانب سے ایک بڑا روسی کماز (ٹرک) آیا جسے واپس پنجشیر کی طرف بیک کر کے کھڑا کر دیا گیا بعد ازیں اتحادی فوجیوں کی جانب سے اسیروں کیلئے حکم صادر ہوا کہ ٹرک پر چڑھ کر بیٹھ جاؤ اور زخمیوں کو بھی اٹھا کر ٹرک پر سوار کرو، چنانچہ سب ساتھی

ٹرک پر سوار ہو گئے اور ہمیں بھی طالبان ساتھیوں نے جو تندرست تھے یعنی زخمی وغیرہ نہیں تھے اٹھا کر ٹرک پر سوار کر دیا اور اس طرح ٹینک سے ہماری جان چھوٹ گئی' اس بار بھی پہلے کی طرح یہ ٹرک جو اگرچہ پہلے ٹرکوں سے بڑا تھا لیکن ہم اسیروں کی تعداد کے لحاظ سے تنگ تھا لیکن پھر بھی سب اسیروں کو اس میں ٹھونس دیا گیا بعد ازیں شمالی اتحاد کے فوجی بھی ٹرک کے پچھلے حصے اور ٹرک کے کیبن کی چھت پر سوار ہو گئے اور ٹرک پنجشیر کی اندرونی جانب محو سفر ہو گیا' تقریباً آدھا گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ٹرک ہمیں لے کر ایک آبادی والے علاقہ جس کا نام '' دالنگ سنگ '' تھا، میں پہنچا اور ٹرک ڈرائیور نے ٹرک وہاں پر روک دیا، وہاں پر پنجشیری فوجیوں اور دیگر لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا جیسے ہی ٹرک لوگوں کے مجمع کے پاس رکا تو لوگوں نے ہماری خوب خبر لینا شروع کی' یعنی ان میں سے کوئی ہمیں پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے لگا' کوئی ہمارے اوپر تھوک پھینکنے لگا اور کوئی کلاشنکوف کے بٹوں اور ڈنڈوں سے ہم اسیروں کی درگت بنانے لگا' ہر پنجشیری حسب استطاعت ہماری ٹھکائی لگا رہا تھا اور ساتھ ساتھ انتہائی فحش گالیوں کے مغلظات کی بھر مار تھی جو وہ ہمیں بک رہے تھے ان ظالموں نے بھی ہم زخمیوں پر رحم نہیں کھایا بلکہ وہ سب بلاتمیز سب اسیروں پر یلغار کئے ہوئے تھے' میں چونکہ ٹرک کے درمیان میں لیٹا ہوا تھا اور میرے اردگرد دوسرے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے اس لئے کچھ محفوظ رہا لیکن پھر بھی تین چار کلاشنکوفوں کے بٹ مجھے پڑ ہی گئے' ٹرک میں ہر طرف اسیروں کی چیخ و پکار اور پنجشیری فوجیوں کی ہا...... ہو...... بزن...... بزن (مارو...... مارو) بکشید ایں سگ ہائے پاکستانیاں را (ان پاکستانی کتوں کو مار دو کی آوازیں تھیں) ہمارے ساتھ آنے والے شمالی اتحاد کے پہریدار جو اکثر پنجشیری تھے، ایک طرف کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے اور بلند قہقہے لگا رہے تھے اور ساتھ ساتھ لوگوں کو ہم پاکستانیوں کی نشاندہی بھی کرتے جا رہے تھے۔

فقط دس منٹ ٹرک '' دالنگ سنگ '' کی آبادی میں رکا رہا لیکن ان دس منٹوں میں ہم اسیروں کی اچھی خاصی درگت بنا دی گئی' دس منٹ بعد ٹرک کے ڈرائیور نے آگے کی طرف ٹرک کو حرکت دی تو سب اسیروں نے سکھ کا سانس لیا' لیکن ٹرک ڈرائیور نے ابھی چلنا شروع ہی کیا تھا کہ دور سے ایک پنجشیری فوجی بھاگتا ہوا ٹرک کی طرف آیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے

ٹرک پر چڑھ کر ٹرک کے بالکل پیچھے بیٹھے ہوئے اسیروں میں سے ایک دو کو کلاشنکوف کے بٹ مار کر اور ان پر تھوک کر چلتے ہوئے ٹرک سے چھلانگ لگا کر نیچے اتر گیا' اس آدمی کی اس حرکت کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اس ظالمانہ اور نامردی والے کام کو ایک سعادت سمجھتا ہو' کیونکہ ایک بندھے ہوئے اور بے بس آدمی پر چھوٹا سا بچہ بھی ہاتھ اٹھا سکتا ہے' مردانگی اور شجاعت کا تو میدان جنگ میں پتہ چلتا ہے جس میں یہ لوگ ہمیشہ گیدڑوں کی طرح دم دبا کر بھاگتے ہوئے ہی نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

دوسرا حصہ:

بہارک جیل پنجشیر

ٹرک نے جب سپیڈ پکڑی تو میرے سمیت سب ساتھیوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ اب ان وحشی لوگوں کی مصیبت سے جان چھوٹ گئی لیکن شعر کے اس مصرع کے مصداق ''ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں'' بہارک جیل میں پہنچنے تک ہر آبادی میں ''دالنگ سنگ'' کی طرح ہمارا استقبال کیا گیا اور جیل میں پہنچ کر ہی اس استقبال والی مصیبت سے جان چھوٹی لیکن جیل میں دوسری پیش آنیوالی مصیبتیں ہماری منتظر تھیں۔

ٹرک ہمیں لے کر جیسے ہی بہارک جیل کے مین گیٹ کے پاس پہنچا تو جیل کی چھت اور مین گیٹ پر کھڑے ہوئے جیل کے پہریدار الرٹ ہو گئے اور ٹرک کو جیل کے باہر مین گیٹ کے پاس ہی روک لیا گیا اور ان تمام اسیر ساتھیوں کو جو کھڑے ہو سکتے تھے ٹرک سے نیچے اتار کر ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا' بعد ازیں جیل کے مین گیٹ کے چھوٹے دروازے سے ایک ایک کر کے اور گن گن کر اندر داخل کیا جانے لگا، جب سب ساتھی اندر داخل کئے جا چکے تو اندر سے پہلے سے آئے ہوئے کچھ اسیر طالبان جیل حکام کے حکم سے باہر آئے اور احتیاط کے ساتھ ہمیں اٹھا کر اندر لے گئے اور ایک پلاٹ میں جا کر ہمیں لٹا دیا جہاں پر سبزیاں اگی ہوئی تھیں۔

ٹرک کے جان لیوا جھٹکوں اور دھکوں کے بعد یہاں جیل کے اندر دھوپ میں لیٹے ہوئے مجھے قدرے سکون محسوس ہو رہا تھا لیکن اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ میں سر کے علاوہ جسم کے کسی بھی دوسرے حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا' البتہ زخموں کے درد وغیرہ اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے مجھے بالکل محسوس نہیں ہو رہے تھے' فقط پیاس تھی جو شدت سے مجھے محسوس ہو رہی تھی اب چونکہ پہلے سے موجود اسیر طالبان ساتھی ابھی پہنچنے والے ساتھیوں کو میرے اردگرد پانی پلاتے ہوئے نظر آ رہے تھے اس لئے میری پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا' چنانچہ میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک طالب ساتھی کو جو ابھی پہنچنے والے ایک ساتھی کو پانی پلا رہا تھا' آواز دینا چاہی لیکن نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے میری آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ

گئی، میں کافی جدوجہد کے بعد آخر کار اس ساتھی کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ ساتھی بھاگتا ہوا پانی لے کر میرے پاس پہنچا ایک ہاتھ سے میرا سر اٹھا کر، دوسرے ہاتھ سے اس نے جگ نما پانی کا برتن میرے منہ سے لگا دیا، میں نے بے صبروں کی طرح غٹا غٹ پانی پینا شروع کر دیا، لیکن تھوڑا سا پانی پلانے کے بعد اس ساتھی نے پانی کا برتن میرے منہ سے ہٹا دیا اور پیار سے مجھے مخاطب کر کے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہنے لگا ''بھائی! آپ زخمی ہیں اس لئے آپ کا زیادہ ٹھنڈا پانی پینا نقصان دہ ہے'' لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور مزید پانی پینے کی ضد کرنے لگا چنانچہ میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس ساتھی نے مزید پانی مجھے پلایا اور میرا سر احتیاط سے زمین پر رکھ کر ایک طرف چلا گیا ابھی وہ ساتھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ مجھے قے ہونا شروع ہو گئی اور جو پانی میں نے پیا تھا وہ زرد رنگ کی صورت اختیار کر کے قے کی وجہ سے نکل گیا اب مجھے پھر پانی کی شدید طلب ہونے لگی میں نے پھر ایک بار اسی ساتھی کو جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگا اپنی طرف متوجہ کیا وہ ساتھی فوراً میرے قریب آ کر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور مجھ سے نہایت ہی شفقت کے ساتھ پوچھنے لگا کہ ''کیا بات ہے؟'' میں نے اسے کہا کہ مجھے پانی پلاؤ، اس پر اس ساتھی نے کہا کہ ''ابھی تو میں نے آپ کو اتنا زیادہ پانی پلایا ہے حالانکہ پانی پینا آپ کیلئے زخموں کی وجہ سے نقصان دہ ہے'' تو میں نے اسے بتایا کہ جو پانی آپ نے مجھے پلایا تھا وہ قے کی صورت میں نکل گیا ہے اس پر اس ساتھی نے دوبارہ پھر مجھے پانی پلایا اور چلا گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر میرا وہی پہلے والا حال ہوا۔

جب سائے ڈھلنے لگے تو ہم سب ساتھیوں کو سامنے موجود ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور کمرے کا واحد دروازہ بند کر کے مقفل کر دیا گیا، کمرے کا اندرونی ماحول عجیب قسم کا منظر پیش کر رہا تھا، یہ کمرہ ایک بڑا ہال تھا جو ماضی میں سینما ہال کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اس میں بیک وقت 50'60 آدمیوں کے سونے کی گنجائش تھی، لیکن اس وقت اس ہال میں تقریباً ساڑھے تین سو قیدیوں کو ٹھونسا ہوا تھا جس کی وجہ سے کوئی بھی صحیح طریقہ سے لیٹ یا بیٹھ نہیں سکتا تھا، ہر آدمی اس کمرے میں مشکل کا شکار تھا جبکہ ہم زخمیوں کی مشکلات سب سے دو چند تھیں اور زخمیوں کی آہ و فغاں اور چیخ و پکار ایک ہولناک منظر پیش کر رہی تھی، اور انسانیت کی

تذلیل کا ایک بھیانک باب شمالی اتحاد کے وحشی درندوں کی طرف سے یہاں پر رقم ہو رہا تھا۔
میں نے تقریباً بیس دن اسی غلاظت سے اٹے ہوئے ہال میں نیم بے ہوشی کی حالت میں گزارے، اس دوران مجھے اپنا اور اپنے اردگرد کا بالکل کوئی ہوش نہ تھا' اس دورانیے میں مجھے فقط اتنا یاد ہے کہ میں ہر وقت پانی پانی پکارتا تھا جب کوئی ساتھی مجھے پانی پلا دیتا تو پانی پی کر مجھے فوراً قے ہو جاتی تھی اور پھر نہ جانے کتنی دیر میں بے ہوش رہتا اور پھر جب مجھے ہوش آتا تو مجھے ایک ہی چیز کا شدت سے احساس ہوتا اور وہ تھی پیاس اور میری زبان سے صرف پانی پانی ہی نکل پاتا تھا اس کے علاوہ اس دوران مجھے کچھ یاد نہیں کہ ساتھیوں پر کیا کیا ظلم ڈھائے گئے اور کس کس طرح ان کو ستایا گیا۔
تقریباً بیس روز بعد جب مجھے کچھ اچھی طرح ہوش آیا تو دو تین آدمی میرے اوپر جھکے ہوئے تھے (غالباً ان لوگوں نے مجھے طاقت وتوانائی بحال کرنے والے انجکشن لگائے تھے اسی لئے میں کچھ دیر کیلئے صحیح طور پر اپنے ہوش وحواس میں رہا یعنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں آگئی) جو شکل وصورت اور حلیے سے یورپین لگتے تھے پھر ان کے سینے پر لگے ہوئے بڑے بڑے بیج پر کراس کا نشان دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ ریڈ کراس کے کارندے ہیں ان میں سے ایک نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا "Can you speak English" یعنی کیا آپ انگلش بول سکتے ہیں؟...... میں نے بھی انگلش میں جواب دیتے ہوئے انتہائی نقاہت کے ساتھ کہا، ہاں...... گزارا کر لیتا ہوں...... اس پر اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ کی ٹانگ کے زخم بہت بری طرح خراب ہو چکے ہیں اور ان میں زہر پھیل چکا ہے اور نہ زہر کافی آگے تک سرایت کر چکا ہے اس لئے آپ کی ٹانگ کاٹنی پڑے گی ورنہ ایک دو دن میں یہ زہر اوپر تک سرایت کر جائے گا جس سے آپ کی زندگی ختم ہو سکتی ہے' بلکہ اگر یہ زہر (گانگرین) اوپر تک پہنچ جاتا ہے تو موت یقینی ہے'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''اگر گانگرین ہو چکا ہے تو پھر آپ میری ٹانگ کاٹ دیں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ گانگرین جیسی خطرناک بیماری کا اس علاقہ میں تو کیا پورے افغانستان میں علاج ممکن نہیں ہے'' چنانچہ انہوں نے ترجمان کے ذریعے جیل حکام کو بتایا کہ اسے ہسپتال لے جانا ہے' لہٰذا اس کو بھی دوسرے زخمیوں کے

ساتھ ایمبولینس میں سوار کرادیں' چنانچہ دو تین طالبان ساتھیوں کو جو قریب ہی کہیں کھڑے تھے بلایا گیا جب وہ آ گئے تو انہوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور باہر لے آئے' باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور خنکی کافی بڑھ چکی تھی' ایمبولینس کا دروازہ ابھی تک بند تھا وہ ساتھی مجھے لے کر باہر بارش میں ہی کھڑے تھے' مجھے بہت زیادہ سردی لگ رہی تھی جس کی وجہ سے میرے دانت بج رہے تھے اور پورا جسم کپکپا رہا تھا، ان میں سے ایک ساتھی بھاگ کر ایک طرف گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک بوسیدہ میلے کچیلے کمبل کے ساتھ واپس آیا اور کمبل میرے اوپر ڈال دیا' کچھ ہی دیر بعد ایمبولینس جو جنگی ایمبولینس تھی اور بالکل بکتر بند گاڑی کی طرح تھی اس کا دروازہ کھولا گیا اور مجھے اندر داخل کر کے ایک جگہ پر لٹا دیا گیا اندر پہلے سے بہت سارے زخمی موجود تھے جن کو مجھ سے پہلے گاڑی میں ڈالا جا چکا تھا' ہم زخمیوں کی تعداد کے حساب سے یہ ایمبولینس چھوٹی تھی جس کی وجہ سے ہم سب زخمی کافی پریشان تھے' کیونکہ جب بھی کوئی ساتھی تھوڑا سا ہلتا تو کسی نہ کسی ساتھی کا زخم اس ہلنے سے ضرور دکھ جاتا' اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام زخمی ساتھی اپنی اپنی جگہ پر ساکت و جامد رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بکتر بند گاڑی نما ایمبولینس ہم زخمیوں کو لے کر جب روانہ ہوئی تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا' گاڑی آہستہ آہستہ کچے راستے پر محو سفر تھی جبکہ میری حالت پھر پہلے کی طرح ہوتی جا رہی تھی یعنی مجھ پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی لیکن میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر کے ہوش میں رہنے کی کوشش کر رہا تھا' جو کافی حد تک بے سود ہی ثابت ہو رہی تھی لیکن اس دوران میرے ذہن میں جو خیالات گردش کر رہے تھے وہ آج بھی جب مجھے یاد آتے ہیں تو بے اختیار میری ہنسی نکل جاتی ہے ''یعنی اپنے آپ کو ہوش و حواس میں رکھنے کی تقریباً ناکام کوشش کرتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ ریڈ کراس والے ہمیں کابل میں کسی ہسپتال میں لے کر جائیں گے' میں ڈرائیور سیٹ کے پیچھے لگے ہوئے پائپ کو دونوں ہاتھوں سے تکلیف کے باوجود پکڑ کر ونڈ سکرین میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا ایک جگہ پر جب مجھے کچھ دھندلی سی روشنیاں نظر آئیں تو میں نے سمجھا کہ جبل السراج آ گیا ہے، اپنے گمان میں اب مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ ہمیں کابل ہی لے کر جا رہے ہیں اور غنودگی کی حالت میں میں اپنے

ذہن میں یہ پلان بنا رہا تھا کہ یہ گاڑی جب کابل پہنچے گی تو یقیناً ہمارے ساتھیوں کے ''اوطاق'' (رہائش گاہوں) کے سامنے سے گزرے گی جہاں مسلح ساتھی ہر وقت گیٹ پر پہرہ دے رہے ہوتے ہیں اور جونہی یہ گاڑی ایمبولینس ہمارے ساتھیوں کی رہائش گاہ کے قریب پہنچے گی تو میں شور مچادوں گا جس کے نتیجے میں ہمیں ضرور ہمارے ساتھی آزاد کروالیں گے۔''

لیکن .... یہ انتظار .... انتظار ہی رہا کیونکہ گاڑی ایمبولینس درہ پنجشیر سے نکلی ہی نہیں تھی' البتہ نجانے کب ہوش کی وادیوں سے نکل کر میں بے ہوشی کی گمنام وادیوں میں پہنچ گیا تھا اور جب مجھے کچھ ہوش آیا تو دن کا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور ایک آدمی میری ٹانگ کے زخموں کو صاف کر رہا تھا اور ہوش بھی غالباً زخموں کی صفائی کے دوران ہونے والے درد کی وجہ سے ہی آیا تھا' بہر حال ٹانگ کی صفائی کرنے کے بعد مجھے ایک سٹریچر پر لٹا کر باہر لے جایا گیا تو باہر دھوپ خوب چمک رہی تھی اور مجھے دھوپ میں لیٹے ہوئے بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرے دماغ پر پھر یکدم تاریکی کی چادر چھا گئی اور میں ایک بار پھر بے ہوش ہوگیا' لیکن اس بار میری بے ہوشی قدرتی نہیں تھی بلکہ کسی زود اثر اینستھیریا (بے ہوش کرنے والی کسی دوا) کے زیر اثر تھی۔

آخری بار جب مجھے ہوش آیا (یعنی اس کے بعد میں ان زخموں کی وجہ سے بے ہوش نہیں ہوا) تو میں نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی لیکن صحیح طریقے سے کچھ نہ دیکھ پایا' ہر چیز مجھے دھندلی سی اور بہت دور محسوس ہو رہی تھی چنانچہ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں' تھوڑی دیر بعد دوبارہ میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے دماغ پر چھائی ہوئی تاریکی اور آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی اور کچھ ہی دیر بعد میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو بیڈ پر لیٹے ہوئے پایا' میرے سرہانے کی جانب ڈرپ، سٹینڈ پڑا ہوا تھا جس پر تین چار خالی ڈرپوں کی بوتلیں لٹکی ہوئی تھیں جو غالباً مجھ پر ہی خالی ہوئی تھیں اور میری دائیں جانب چار بیڈ تھے جن پر دوسرے زخمی طالبان ساتھی لیٹے ہوئے تھے اور میری بائیں جانب کمرے کا واحد دروازہ تھا' ارد گرد دیکھتے ہوئے مجھے کچھ الجھن سی محسوس ہونے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرا بیڈ ٹوٹا ہوا ہے اور میری بائیں ٹانگ ٹوٹے ہوئے بیڈ سے

نیچے لٹک رہی ہے' یہ خیال آتے ہی میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر اس جگہ کو چیک کرنا چاہا جہاں سے مجھے اپنی ٹانگ نیچے لٹکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی' جب میرے ہاتھ نے مطلوبہ جگہ کو چھوا تو اچانک درد کی وجہ سے میری چیخ نکل گئی اور ساتھ ہی میرے ذہن میں گزشتہ واقعات گردش کرنے لگے اور مجھے یاد آیا کہ ریڈ کراس کے ڈاکٹر نے میری ٹانگ کاٹنے کے بارے میں کہا تھا، یہ خیال آتے ہی میں نے دوبارہ آہستہ آہستہ ٹانگ کے اس حصے کو ہاتھ لگا کر دیکھا جہاں اچانک میرا ہاتھ لگنے سے مجھے تکلیف ہوئی تھی اور جہاں سے مجھے اپنی ٹانگ لٹکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی تب جا کر مجھے پتہ چلا کہ میری ٹانگ کاٹی جا چکی ہے۔اور پہلی بار میرا ہاتھ ٹانگ کے اسی کٹے ہوئے حصے پر ہی لگا تھا جس کی وجہ سے میری چیخ نکل گئی تھی۔

میری چیخ کی آواز سن کر میرے تیسرے نمبر کے بیڈ سے مجھے آواز سنائی دی کہ "حامد بھائی !کیا ہوا؟" پہلے تو میں توجہ نہ دے سکا پھر جب دوبارہ وہیں سے میرا حال پوچھا گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ بھائی یٰسین ہیں جو مجھ سے مخاطب ہیں تو میں نے اسے جواب دیتے ہوئے کمزور سے لہجے میں کہا "کچھ نہیں ....بس ذرا زخم دکھ گیا تھا" اس کے بعد اس نے چند تسلی آمیز جملے کہے اور خاموش ہو گیا، اس کے بعد میرے ساتھ والے بیڈ پر لیٹے ہوئے افغانی طالب ساتھی نے بھی مجھ سے میرا حال پوچھا اور تسلی دی (اس ساتھی کو تھوڑی بہت اردو بولنا آتا تھا)

اب جبکہ میری ٹانگ کاٹی جا چکی تھی اور ٹانگ کے زخموں میں پھیلے ہوئے زہر کا اثر میرے جسم سے ختم ہوا تو مجھے بھوک بھی شدت کے ساتھ لگنے لگی اور برداشت سے باہر ہونے لگی' چنانچہ میں نے اپنے ساتھ والے بیڈ پر لیٹے ہوئے افغانی طالب ساتھی سے کھانے کے بارے میں پوچھا اور اپنی بھوک کی شدت سے اسے آگاہ کیا جس پر اس ساتھی نے مجھے بتایا کہ اب دوپہر ہو چکی ہے اور کھانا ابھی آنے ہی والا ہے' اور ہوا بھی ایسے ہی یعنی میرے کھانے کے بارے میں پوچھنے کے چند منٹ بعد ہی ایک بوڑھا باریش آدمی ایک بڑی سی لکڑی کی ٹرے جس میں چاولوں (پلاؤ) کے چھوٹے چھوٹے کاسے رکھے ہوئے تھے لے کر اندر داخل ہوا اور ہم سب زخمیوں کو ایک ایک کاسہ دے کر باہر نکل گیا' میں کاسہ پکڑتے ہی ندیدوں کی طرح چاولوں پر ٹوٹ پڑا اور کھانے لگا لیکن جتنی جلدی میں کھانے کی کوشش کر رہا تھا اتنی ہی مجھے

کھانے میں دشواری پیش آ رہی تھی، کیونکہ جب میں چاولوں کا لقمہ اپنے دائیں ہاتھ سے منہ کی طرف لے جاتا تو چند دانے میرے منہ میں پہنچتے باقی سب نیچے گر جاتے اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بازوؤں میں گرنیڈ کے چھرے لگے تھے جس کی وجہ سے میرے دائیں ہاتھ کا تقریباً آدھا حصہ بے حس تھا اگرچہ یہ ہاتھ کام کرتا تھا لیکن اس ہاتھ میں کوئی چیز پکڑنے یا گرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا، چنانچہ جب میں دائیں ہاتھ سے نہ کھا سکا تو میں نے مجبوراً بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا اور بڑے بڑے لقمے لے کر کاسہ ختم کر دیا لیکن میری بھوک ہنوز باقی تھی اس لئے میں ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا کہ کسی ساتھی کے چاول بچ جائیں اور وہ مجھے دے دے لیکن چاول تھے ہی کتنے جو کسی سے بچتے، میں اندر ہی اندر اپنی اس سوچ پر بہت نادم ہوا اور ٹیک لگا کر لیٹ گیا، ابھی میں لیٹا ہی تھا کہ وہی سفید ریش خادم جو کھانا لے کر آیا تھا کمرے میں داخل ہوا، اس بار وہ قہوہ لے کر آیا تھا، اس نے ہر بیڈ کی تپائی پر ایک ایک چھوٹی چینک اور چھوٹے چھوٹے چائے پینے والے شیشے کے گلاس رکھ دیے اور کھانے کے برتن سمیٹ کر لے گیا۔

سب ساتھی اپنے کپوں میں پھیکا بغیر میٹھے کے قہوہ ڈال کر پینے لگے، میں نے بھی اپنے کپ میں قہوہ انڈیلا اور کچھ ٹھنڈا ہونے کیلئے رکھ دیا، اسی دوران ایک ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا اور سیدھا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور خندہ پیشانی سے میرا حال چال پوچھنے لگا بعد ازیں دوائی کے چند پیکٹ جیب سے نکال کر مجھے دوائی کھانے کی ترتیب سمجھانے لگا اور آخر میں یہ کہہ کر باہر نکل گیا ''کہ اگر کوئی تکلیف ہو تو مجھے آواز دے لینا میں قریب ہی کمرے میں ہوتا ہوں'' میں نے چائے (قہوے) کے ساتھ دوا کی ایک خوراک کھائی اور آرام سے لیٹ گیا۔

پہلے دو ہفتے ہسپتال میں ہماری ہر صبح کا آغاز چیخیں سننے اور چیخیں مارنے سے ہوتا تھا ...... یہ چیخیں اور کراہیں کسی ظلم وستم اور کسی تشدد کی وجہ سے نہیں ہوتی تھیں بلکہ ہمارے مسیحا ہماری چیخیں نکلواتے تھے یعنی ہر صبح تقریباً 8 بجے دو تین ڈاکٹر ڈریسنگ کے سامان والی ٹرالی لے کر وارڈ میں داخل ہوتے تھے، ٹرالی کی آواز سن کر ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، بہرحال

ڈاکٹر حضرات وارڈ میں داخل ہو کر مجھ سے ابتداء کرتے اور میری کٹی ہوئی ٹانگ کے زخموں کی صفائی وغیرہ کر کے پٹی تبدیل کرتے، اس دوران ضبط کی بہت کوشش کے باوجود بھی میری چیخیں یا کراہیں نکل ہی جاتیں بعد ازیں دوسرے ساتھیوں کا نمبر آتا تو ان سب کی بھی یہی حالت ہوتی' یہ ڈاکٹر حضرات جو اگرچہ پنجشیری ہی تھے اور ریڈ کراس کے تحت تھے لیکن نہایت ہی شفقت کے ساتھ ہمارا علاج کر رہے تھے یہ اور بات ہے کہ وسائل کی کمی کی وجہ سے ہمیں ڈریسنگ کے دوران بہت تکلیف ہوتی تھی جس میں ڈاکٹروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔

شیر باز شہید

ہسپتال میں یہ ہمارا چوتھا یا پانچواں روز تھا جب تقریباً 11 بجے ایک ساتھی جس کی ایک ٹانگ زخمی تھی وہ ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا وارڈ میں داخل ہوا اور سامنے دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے خالی بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی ٹھیٹھ پنجابی میں سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا ''ساتھیو! کی حال چال اے تہاڈا'' (یعنی ساتھیو! آپ لوگوں کا کیا حال چال ہے) پہلے سے کیونکہ میں اس ساتھی کو جانتا نہیں تھا اس لئے اسے پہچانا بھی نہیں تھا لیکن حلیے سے جب وہ وارڈ میں داخل ہوا تھا تو میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ پاکستانی ساتھی ہے' میں نے بھی اسے پنجابی میں جواب دیتے ہوئے کہا ''الحمد للہ ہم خیریت سے ہیں'' اس کے فوراً بعد میں نے اس ساتھی سے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہو، اس پر اس ساتھی نے جس کا نام ''شیر باز'' تھا نے تفصیل کے ساتھ بتاتے ہوئے کہا ''کہ میں لاہور اردو بازار میں کتابوں کا کام کرتا تھا' اور اصل ہارون آباد کا رہنے والا ہوں'' پھر میں نے اسے بتایا کہ میں بھی لاہور ہی کا رہنے والا ہوں' شیر باز کے وارڈ میں آنے سے ہمارا وقت اچھا گزرنے لگا' کیونکہ شیر باز (جاوید شہید) نہایت ہی خوش طبع ساتھی تھا اور اس کی آواز بھی بہت ہی اچھی تھی وہ اکثر ہمیں جہادی نظمیں سناتا اور ادھر ادھر کی دلچسپ گپ شپ لگاتا رہتا جس کی وجہ سے ہمیں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن ہم سب زخمی تقریباً صبح کے دس بجے پٹیوں کے تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر اپنے اپنے بیڈوں پر لیٹے ہوئے تھے کہ شمالی اتحاد کا ایک وردی پوش کمانڈر اپنے چند باڈی

گارڈوں کی معیت میں ہمارے وارڈ میں آن وارد ہوا چونکہ میں دروازے کے بالکل قریب والے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اس لئے وہ وارڈ میں داخل ہوتے ہی سیدھا میرے پاس آن کھڑا ہوا‘ پہلے تو کچھ دیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھنے لگا ’’تو پاکستانی ہستی‘‘ یعنی تو پاکستانی ہے‘ میں نے جواب میں ہاں میں سر ہلا دیا وہ پھر گویا ہوا ’’فارسی مے دانی‘‘ یعنی فارسی جانتا ہے......؟ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا نہیں‘ اس پر وہ انڈیا کی فلموں سے سیکھی ہوئی فلمی اردو میں مجھ پر برس پڑا اور مغلظات بکنے لگا اور مجھے مارنے کیلئے آگے بڑھا لیکن بھلا ہو وہاں کے ڈاکٹروں کا جو شور کی آواز سن کر بھاگتے ہوئے آئے اور اس کمانڈر کو ملامت کرنے لگے اور متذکرہ کمانڈر اور اس کے ساتھیوں کو یہ کہہ کر وارڈ سے باہر نکال دیا کہ ’’یہ تمہارا مرکز تحقیق نہیں ہے بلکہ ہمارا شفاخانہ (ہسپتال) ہے‘ جب یہ لوگ جیل میں منتقل ہوں گے تو وہاں پر ان سے تحقیق و تفتیش کرنا‘‘ اس کمانڈر کے جانے کے بعد میں نے سکھ کا سانس لیا کہ پٹنے سے بال بال بچ گیا۔ اس واقعے کے بعد ڈاکٹروں نے احتیاط کے مدنظر وارڈ کی تمام کھڑکیاں بند کروادیں اور وراڈ کے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا، اب کوئی اندر تو نہیں آ سکتا لیکن دروازے پر لگے ہوئے شیشے سے شمالی اتحاد کے لوگ ہمیں آ کر تنگ کرنے لگے جب ہم نے اس چیز کی ڈاکٹروں سے شکایت کی تو انہوں نے شیشوں پر بھی کاغذ چڑھوا دیئے تا کہ باہر سے کوئی ہمیں دیکھ ہی نہ سکے۔

مندرجہ بالا واقعہ سے اگلے روز میں نے دیکھا کہ شیر باز بھائی شہید (جاوید) کچھ خاموش خاموش ہے تو میں نے اسے آواز دے کر پوچھا ’’جاوید بھائی آج آپ خلاف معمول خاموش ہیں خیریت تو ہے؟‘‘ اس پر اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ آج میرے پاؤں میں بہت درد ہو رہا ہے کیونکہ آج ڈاکٹروں نے میرے پاؤں میں لگی ہوئی دو گولیاں نکالی ہیں جبکہ ایک گولی جو پاؤں کی اوپر والی ہڈی کے اندر پھنسی ہوئی ہے، وہ نہیں نکل سکی حالانکہ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی ہے اور آخر میں ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا کہ ایک گولی ہڈی کے اندر گھسی ہوئی ہے وہ ہم سے نہیں نکل سکی اور وجہ اس کی یہ بتائی کہ اس قسم کے آپریشن کیلئے ہمارے پاس بلکہ پورے پنجشیر میں کوئی وسائل نہیں ہیں اور ان کی اسی کوشش کی وجہ سے آج میرے پاؤں میں شدید درد

ہو رہا ہے' میں نے اسے تسلی دی اور اس کی توجہ ہٹانے کیلئے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں' باتوں ہی باتوں میں میں نے جاوید (شیر باز) بھائی سے پوچھا کہ ''آپ کس طرح گرفتار ہوئے ؟'' اس پر جاوید بھائی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی گرفتاری کی داستان سنانی شروع کی' جاوید بھائی نے بتایا کہ ''ہم کچھ ساتھی درہ سالنگ کی طرف تھے' یہاں پر حالات بہت ہی مخدوش ہو چکے تھے جبکہ ہمیں مسلسل اطلاعیں مل رہی تھیں کہ جبل سراج میں بغاوت ہو گئی ہے اور دشمن نے ہماری سپلائی لائن کاٹ دی ہے اور ہمارے اردگرد کے پہاڑوں پر بھی دشمن آگے بڑھا چلا آ رہا تھا اور ہمارا گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا' ہم نے جب یہ صورتحال دیکھی تو سوائے وہاں سے نکلنے کے ہمیں اور کوئی صورت نظر نہ آئی' چنانچہ ہم نے وہاں سے جبل سراج کی طرف کوچ کیا' اور پہاڑوں سے ہوتے ہوئے جبل سراج کی طرف چل پڑے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہم نے محسوس کیا بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہم سے دو تین سو قدم کے فاصلے پر دشمن کمین لگائے بیٹھا ہے' ہم وہاں سے پھر واپس پلٹے' ہمارے پلٹتے ہی دشمن نے ہم پر فائر کھول دیا' ہم سب بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں ہو گئے اور جوابی فائرنگ کرتے ہوئے اور رکوع کے بل چلتے ہوئے واپس سڑک کی جانب جانے لگے' جب ہم سب ساتھی خیریت کے ساتھ سڑک پر پہنچ گئے تو آپس میں فیصلہ کیا گیا کہ سڑک کے ذریعے ہی جبل سراج کی طرف نکلنے کی کوشش کرتے ہیں' چنانچہ سب ساتھی سڑک پر جبل سراج کی طرف چلنے لگے' میرا پاؤں چونکہ پہاڑوں سے اترتے ہوئے مڑ گیا تھا اور اس میں موچ آ گئی تھی اس لئے میرے پاؤں میں شدید درد ہو رہا تھا' جو پہلے اتنا زیادہ محسوس نہیں ہوا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے پاؤں کا درد بڑھتا جا رہا تھا اور چلنا مشکل ہو رہا تھا' اسی وجہ سے میں سب ساتھیوں سے پیچھے تھا' جب ساتھیوں نے مجھے جلدی چلنے کو کہا تو میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاؤں میں موچ آ گئی ہے اور مجھ سے چلا نہیں جا رہا تو ایک ساتھی نے مجھے سہارا دیا اور میں ساتھیوں کے ساتھ مل کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔

جب ہم سڑک کے ایک موڑ پر پہنچے تو اچانک موڑ سے بہت سے مسلح لوگ جو وہاں پہلے سے کمین لگائے چھپے ہوئے بیٹھے تھے برآمد ہوئے اور انتہائی کرخت آواز میں دریش

(ہالٹ)...... دریش (ہالٹ......) پکارنے لگے‘ دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد سے بھی دشمن کے مسلح لوگ جو یقیناً ہمارے انتظار میں چھپے ہوئے تھے نکل آئے اور ہمیں اسلحہ پھینک دینے کا حکم دینے لگے‘ اب ہمارے پاس ان کا حکم ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا‘ چنانچہ ہم سب نے اسلحہ پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو گئے‘ بعدازیں ان لوگوں نے ہمیں تھوڑا سا آگے چلنے کا حکم دیا جس سے ان کا مقصد ہمیں اسلحہ سے دور کرنا تھا‘ چنانچہ جب ہم اسلحہ سے دور ہو گئے تو انہوں نے ہمارا پھینکا ہوا اسلحہ اٹھا لیا۔“

بھائی جاوید نے مزید حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ”ہمارا اسلحہ جمع کر لینے کے بعد دشمن نے ہمیں ایک قطار میں کھڑا ہونے کو کہا جب ہم سب ایک قطار میں کھڑے ہو گئے تو دشمن کے لوگ ہم ٹوٹ پڑے اور ہماری تلاشی لینے لگے اور آپس میں گتھم گتھا ہونے لگے‘ دشمن کے ہر آدمی کی خواہش تھی کہ وہ تلاشی لے تاکہ ہم سے چھینا ہوا مال اس کے ہاتھ میں آئے اس کوشش میں ہمیں سرنڈر کرنیوالے اکثر فوجی آپس میں لڑ جھگڑ بھی رہے تھے جبکہ ہر آدمی اپنا غصہ ہم سب ساتھیوں پر نکال رہا تھا‘ تلاشی کے دوران ہی وہ لوگ ہمیں ٹھڈوں‘ مکوں‘ اور گنوں کے بٹوں کے ساتھ مشق ستم بنا رہے تھے‘ الغرض انہوں نے ہماری ہر چیز چھین لی فقط ایک شلوار قمیض ہمارے بدن پر رہنے دی اور جوتے تک بھی اتروا لئے“ یہاں تک پہنچ کر جاوید بھائی کچھ دیر کیلئے رکا اور پھر دوبارہ سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے بولا کہ ”تلاشی کے تکلیف دہ مرحلے سے گزرنے کے بعد ہم سب ساتھیوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور شمالی اتحاد کے فوجی ہمیں جبل سراج کے رخ ایک قطار میں چلانے لگے‘ میں پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے حسبِ سابق سب سے پیچھے تھا لیکن میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا کہ تیز چلوں لیکن تیز چلنے کی اس کوشش کی وجہ سے میرا پاؤں ایک بار پھر مڑ گیا اور ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے منہ کے بل زمین پر گر پڑا اور میں جیسے ہی زمین پر گرا دو تین شمالی اتحاد کے فوجی مجھ پر پل پڑے اور کلاشنکوف کے بٹوں اور ٹھڈوں کے ساتھ میری ٹھکائی کرنے لگے اسی اثناء میں میں نے کھڑا ہو کر آگے ساتھیوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن مجروح پاؤں وزن برداشت نہ کر سکا اور میں دھڑام سے پھر گر پڑا‘ مجھے گرتا دیکھ کر بپھرے ہوئے فوجی نے کلاشنکوف کا بلٹ

چڑھایا اور میرے پاؤں کی طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر دی' تین چار گولیاں میرے پاؤں کے اوپر والے حصے میں سوراخ کرتی ہوئیں اندر گھس گئیں...... تکلیف سے میری چیخیں نکل گئیں' گولیاں مار کر بھی ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ دو تین فوجی مجھے کلاشنکوف کے بٹوں سے پھر مارنے لگے' جب ان کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے ہمارے ساتھیوں میں سے دو ساتھیوں کو بلایا جنہوں نے میرے زخمی پاؤں پر ایک کپڑا باندھ دیا اور مجھے سہارا دے کر چلنے لگے' جاوید بھائی یہاں تک حالات سنانے کے بعد خاموش ہو گئے اور تھوڑی دیر رکنے کے بعد پھر بولے" حامد بھائی! یہ تھے میری گرفتاری کے حالات' جن سے گزر کر طرح طرح کے ظلم وستم سہتے ہوئے ہم بھارک جیل میں پہنچ گئے، جہاں سے کچھ دنوں کے بعد ریڈ کراس والے مجھے شدید زخمی ہونے کی وجہ سے اس ہسپتال میں لے آئے ہیں اور آگے خدا جانے ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔"

مجھے جاوید (شیر باز) بھائی کی روداد سن کر بہت افسوس ہوا اور افسوس کرنے کے علاوہ ہم اس وقت کر بھی کیا سکتے تھے اور پھر کس کس ساتھی کی گرفتاری کے حالات پر افسوس کرتے' یہاں تو سب کے سب گرفتار ہونے والے ساتھی ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ یعنی ہر قیدی ساتھی طرح طرح کے ظلم وستم کی چکی میں پسنے کے بعد ہی جیل تک پہنچا اور کئی ساتھی ایسے بھی تھے جن کو گرفتار ہو کر جیل تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا اور یہی لوگ میرے خیال میں ہم جیل میں پہنچنے والے ساتھیوں سے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ گرفتار تو ہوئے لیکن جلد ہی اپنی منزل مقصود یعنی شہادت کے درجے کو پہنچ گئے اگر چہ ان شہید ہونے والوں کی داستانیں ایسی ہیں کہ سن کر دل دہل جاتے ہیں اور پتھروں کو بھی پسینے آجاتے ہیں' مگر وہ بچ جانے والے قیدیوں کی طرح روز مرنے اور روز جینے کے مشکل ترین لمحات سے بچ گئے' آئندہ صفحات میں کچھ ایسے ساتھیوں کی داستان بھی رقم کروں گا جو ظلم وستم کی چکی میں پس کر جلد ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

یہ ہسپتال جس میں ہم زخمی قیدی زیر علاج تھے پنجشیر ہی کی ایک بستی جس کا نام "رخا" تھا میں واقع تھا اور ریڈ کراس اس ہسپتال کو چلا رہی تھی اور ہسپتال کا سارا عملہ ریڈ کراس کے تحت تھا' ہسپتال کے سب ڈاکٹر اگر چہ پنجشیری ہی تھے لیکن دوسرے پنجشیریوں کے مقابلے میں اکثر ڈاکٹروں کا رویہ ہمارے ساتھ بہت اچھا اور نہایت مشفقانہ تھا اور وہ لوگ ہمارا بہت خیال رکھتے

تھے اور ہم زخمی قیدیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور دل دکھانے والی متنازعہ باتوں سے احتراز کرتے تھے' آدھی رات کے وقت بھی ہم زخمی ساتھیوں میں سے کسی کو کوئی تکلیف ہوتی اور ہم ڈاکٹروں کو آواز دیتے تو ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر چاہے سو رہا ہوتا لیکن ہماری آواز سن کر ضرور آجاتا تھا اور اس بات کا برا بھی نہیں مناتا تھا اور ہماری تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرتا' جہاں یہ اچھے ڈاکٹر تھے وہیں پر کچھ متعصب ڈاکٹر بھی تھے جن کا کام ہی اپنی طنز بھری باتوں سے ہم زخمیوں کو تکلیف پہنچانا ہوتا تھا' جبکہ نیچے کا عملہ یعنی صفائی وغیرہ کرنے والا عملہ اور خدمت پر مامور عملہ بھی ہمارے ساتھ قدرے بہتر سلوک کرتا تھا' ان میں ایک آدمی تھا جو انتہائی گندی طبیعت کا مالک تھا جو ایک آنکھ سے بھی کانا تھا اس سے جب پانی پینے کیلئے مانگا جاتا تو وہ انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہتا کہ ''بے نظیر سے کہو کہ تمہارے لئے پانی لائے'' اور اس کے علاوہ فارسی میں انتہائی بے ہودہ قسم کی گالیاں بھی ہمیں بکتا رہتا تھا' ہماری شکایت پر کئی بار اسے ڈاکٹروں سے ڈانٹ بھی پڑی لیکن اس آدمی پر ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

بھائی غلام یٰسین جو میرا ساتھی تھا اور میرے ساتھ ہی زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا اس کے بھی دائیں پاؤں کی تین انگلیاں زخموں کے خراب ہونے کی وجہ سے کاٹی جا چکی تھیں لیکن وہ کافی باحوصلہ ساتھی تھا، اکثر زبانی قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہتا تھا' اس کے علاوہ بھائی منیر اور قاری ابراہیم کو بھی زخموں کی وجہ سے یہاں ہسپتال میں لایا گیا، ان کا بھی یہاں کافی دن علاج ہوتا رہا لیکن ان کو ہم سے پہلے دوبارہ جیل میں منتقل کر دیا گیا جبکہ ہم تقریباً دو ماہ رخا ہسپتال میں زیر علاج رہے۔

مجھے اس ہسپتال میں داخل ہوئے تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے کہ ایک دن گیارہ بجے کے قریب یورپین افراد پر مشتمل ریڈ کراس کی ایک ٹیم ہمارے وارڈ میں داخل ہوئی اور داخل ہوتے ہی انہوں نے ہیلو' ہائے کہا اور میرے بیڈ کے پاس آ کر کھڑے ہوگئے اور میرے ساتھ ٹیم کے تینوں افراد نے باری باری ہاتھ ملایا پھر ان میں ایک آدمی جو ٹیم لیڈر معلوم ہوتا تھا مجھ سے مخاطب ہو کر انگلش میں پوچھنے لگا "Can you speek English" کیا آپ انگلش بول سکتے ہیں؟ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "Yes, I can, but broken" یعنی ہاں میں

انگلش بول سکتا ہوں لیکن ٹوٹی پھوٹی' میری بات سن کر وہ خوش ہو گیا اور میرا حال چال پوچھتے ہوئے کہنے لگا "آپ لوگوں کا علاج یہاں پر ٹھیک ہو رہا ہے یا کہ نہیں؟" میں نے کہا "الحمد للہ! ٹھیک ہو رہا ہے" اس کے بعد متذکرہ بالا شخص نے پھر مجھ سے پوچھا کہ "یہاں پر آپ لوگوں کو کوئی مسئلہ یا کوئی پریشانی تو نہیں؟" "نہیں کوئی خاص مسئلہ یا پریشانی نہیں ہے' اس پر اس متذکرہ شخص نے اطمینان کا اظہار کیا اور ادھر ادھر کی چند مزید باتیں کرنے کے بعد اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے سبز اور پیلے رنگ کے کارڈ نکالے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ "ہم آپ لوگوں کے ریڈ کراس کے شناختی کارڈ بنانا چاہتے ہیں تاکہ آپ لوگوں کا ریکارڈ ہمارے پاس محفوظ ہو جائے" یہ بات سن کر مجھے کچھ تشویش ہوئی کہ آخر یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس سے ان کا کیا مقصد ہے؟ چنانچہ میں نے ریڈ کراس کے ٹیم لیڈر سے پوچھا کہ "یہ جو آپ ہمارا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں ریڈ کراس کے شناختی کارڈ دینا چاہتے ہیں اس کی کیا وجہ اور کیا مقصد ہے؟" ریڈ کراس کے ٹیم لیڈر نے وضاحت کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ "ہمارا اپنے پاس جنگی قیدیوں کا ریکارڈ محفوظ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً جیل میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور ہم جنگی قیدیوں کے احوال معلوم کرتے رہیں اور جنیوا کنونشن کے مطابق مقامی حکومت سے جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

تمام ضروری اندراجات کے بعد ریڈ کراس والوں نے تمام قیدیوں کو میسج کارڈ دیئے اور ہمیں بتایا کہ ان کارڈوں پر آپ حضرات اپنی خیر خیریت لکھ کر اور اپنا اپنا ایڈریس لکھ کر ہمیں دیں، ہم یہ پیغامات آپ کے گھروں میں پہنچائیں گے اور وہاں سے جوابات وصول کر کے آپ تک پہنچائیں گے۔

میسج کارڈ اور بال پوائنٹس ہمیں دے کر اور اگلے دن دوبارہ آنے کا کہہ کر ریڈ کراس والے چلے گئے، ان کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ یہ کیا معاملہ ہے اور یہ ریڈ کراس والے جو یہود و نصاریٰ کا ایک ٹولہ ہے ہمارے خیر خواہ کیونکر ہو سکتے ہیں، میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ جاوید شہید کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی وہ کہہ رہا تھا کہ "حامد

بھائی میرا خط لکھ دو‘‘ میں نے اِس کا کارڈ لیا اور اس سے پوچھا کہ کہ والدین کے نام لکھنا ہے؟ اس پر جاوید بھائی نے کہا کہ نہیں اردو بازار لاہور کے ایک دوست کے نام لکھنا ہے، میں نے خط لکھنا شروع کر دیا سلام ودعا اور حال احوال لکھنے کے بعد جب جاوید بھائی نے کہا کہ ابو عبیدہ کو بھی میرا اسلام اور احوال لکھ دینا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ ایک ابو عبیدہ کو میں بھی جانتا تھا جو ڈیفنس میں ذمہ دار ہوتا تھا چنانچہ میں نے جاوید سے پوچھا کہ یہ حضرت کون ہیں جن کا نام آپ نے ابو عبیدہ لکھوایا ہے، اس پر جاوید نے بتایا کہ یہ لاہور میں ڈیفنس کے علاقہ کے ذمہ دار ہیں، میں نے جاوید کو بتایا کہ میں بھی کچھ عرصہ ابو عبیدہ کے ساتھ رہا ہوں، خط مکمل ہو گیا لیکن ابو عبیدہ کا تذکرہ کافی دیر تک کرتے رہے اور ابو عبیدہ کی نزاکتوں اور صفائی پسندیوں کو یاد کر کے خوب محظوظ ہوتے رہے۔

اگلے روز ریڈ کراس والے آئے ہمارے ساتھ کچھ گپ شپ لگانے اور خط جمع کرنے کے بعد چلے گئے، انہی دنوں کچھ زخمی ساتھیوں جن میں قاری ابراہیم، قاری محمود اور کچھ افغانی ساتھی شامل تھے ہسپتال سے ڈسچارج ہو گئے، تو ریڈ کراس والوں نے انہیں بھارک جیل منتقل کر دیا، اب ہسپتال میں میرے ساتھ جاوید، غلام یٰسین اور دو افغانی طالب موجود تھے۔ ایک دن ہم صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر زخموں کی پٹیاں تبدیل کروا کر لیٹے ہوئے تھے کہ ایک وردی پوش پنجشیری کمانڈر چند لوگوں کی معیت میں ہمارے وارڈ میں داخل ہوا تو ہم سب زخمیوں نے جلدی جلدی لحاف اپنے اوپر ڈال لئے، ہمارا یہ عمل بالکل ایسے ہی تھا جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بلی بھی مجھے نہیں دیکھ رہی، حالانکہ وہ اپنے شکار کو دیکھ رہی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح پنجشیری کمانڈر بھی ہمیں آنکھیں بند کرتے یعنی لحاف اوڑھتے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں یقیناً ہماری اس کیفیت سے لطف اندوز ہوا ہوگا، بہر حال اس کمانڈر نے آتے ہی میرا لحاف کھینچ کر اتارا اور فارسی زبان میں انتہائی غصیلے لہجہ میں بکنے لگا جس کی مجھے کچھ سمجھ نہیں لگ رہی تھی بس اس کے لہجے سے اتنا پتہ چل رہا تھا کہ وہ یقیناً ہماری شان میں کوئی قصیدہ نہیں پڑھ رہا تھا، شاید اپنی بیوقوفی کا اس کمانڈر کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں پنجابی کے ساتھ فارسی بول رہا ہوں کیونکہ فارسی میں غصہ نکالنے کے بعد ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے

بولنے لگا اور سب سے پہلے جو جملہ اس نے مجھے مخاطب کر کے بولا وہ یہ تھا کہ ''تو پنجابی ہے'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو انڈین فلموں سے سیکھی ہوئی فحش گالیوں کی اس نے بوچھاڑ کر دی اور پھر کہنے لگا کہ ''میں تم سب پنجابیوں کو ابھی گولیوں سے بھون ڈالوں گا، اور اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک کلاشنکوف بردار سے کلاشنکوف لی اور مجھ سے انتہائی زہریلے لہجے میں مخاطب ہو کر پوچھا اور کون کون پنجابی ہے، میں انتہائی پریشانی کی حالت میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں اس خبیث الفطرت انسان نما درندے کو کیا جواب دوں جو ایک زخمی قیدی اور ایسے بے بس انسان پر جو انہی کے رحم و کرم پر تھا رعب جھاڑ رہا تھا اور اپنی ''بہادری'' دکھا رہا تھا، کہ دفعتاً تین چار ڈاکٹر دوڑتے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئے اور آتے ہی ڈاکٹروں کا سرخیل میڈیکل سپریٹنڈنٹ اس کمانڈر کو مخاطب ہو کر کہنے لگا ''دیکھو محترم پہلے بھی ہم بارہا آپ کے لوگوں کو بتا چکے ہیں کہ یہ ICRC کا ہسپتال ہے جو ایک بین الاقوامی ادارہ ہے آپ کی جیل نہیں ہے، ان زخمی قیدیوں کو یہاں پر علاج کیلئے لایا گیا ہے نہ کہ تحقیق اور تشدد کے لئے اور جب تک یہ لوگ ICRC کے زیر علاج ہیں براہ کرم آپ انہیں تنگ نہ کریں، جب انہیں جیل منتقل کر دیا جائے گا تو وہاں یہ شوق پورا فرما لینا اور برائے مہربانی یہاں سے تشریف لے جائیں ڈاکٹر کی تقریر سن کر کمانڈر بڑبڑاتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے نکل گیا، بعد ازیں ms دوسرے ڈاکٹروں اور وہاں پر جمع ہونے والے ہسپتال کے عملے پر برس پڑا کہ دروازے کا تالہ کیوں کھلا چھوڑا گیا اور ان لوگوں کو ہسپتال میں داخل کس نے ہونے دیا، اس پر سب لوگ اپنی اپنی صفائی پیش کرنے لگے جبکہ صبح کی ڈیوٹی والے ڈاکٹر نے کہا کہ ''میں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد اپنے ہاتھ سے وارڈ کا دروازہ مقفل کیا تھا اور چابی ڈیوٹی روم میں لٹکا دی تھی، ڈاکٹر حضرات کی بحث یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ وہ وارڈ سے نکل گئے، چھوٹا عملہ بھی ان کی تقلید میں وارڈ سے نکل گیا، ہم سب ساتھیوں نے سکون کا سانس لیا، میرے دل سے ڈاکٹروں کے لئے بے ساختہ دعائیں نکل رہی تھیں، جبکہ دوسرے ساتھیوں کا بھی یہی حال تھا، اور سب زخمی ساتھیوں کی زبان پر یہی تھا کہ اگر ڈاکٹر وقت پر نہ پہنچتے تو نجانے شمالی اتحاد کا کمانڈر اور اس کے ساتھی ہمارا کیا حشر کرتے۔

میرے ساتھ والے بیڈ پر موجود افغانی طالب بھائی عبدالسلام جس نے مندرجہ بالا ساری گفتگو کا ترجمہ ہمارے لئے کیا، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ" حامد بھائی! پریشان مت ہونا اور دل برداشتہ بھی نہ ہونا کیونکہ جب انسان اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلتا ہے تو مشکلات اور پریشانیاں تو آتی ہی رہتی ہیں، اللہ کا محبوب بندہ تو وہی ہوتا ہے جو آلام و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے، مجھے اور وہاں پر موجود ساتھیوں کو بھائی عبدالسلام کی باتوں سے کافی حوصلہ ملا اور جو غم تھوڑی دیر پہلے تک مجھ پر اور دیگر ساتھیوں پر مسلط تھا وہ چھٹ گیا اور ماحول میں جو تناؤ پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔

ایک دن ریڈ کراس کی ٹیم جو دو عورتوں اور تین مردوں پر مشتمل تھی ہسپتال میں ہمارے پاس آئی اور آتے ہی ریڈ کراس کے افراد ہمارا حال احوال پوچھنے لگے، مزید برآں انہوں نے ہم سے ہسپتال کے عملہ کے ہمارے ساتھ برتاؤ کے بارے میں پوچھا کہ ڈاکٹر حضرات آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں جس پر ہم نے ان کو بتایا کہ ڈاکٹروں کا سلوک ہمارے ساتھ بہت اچھا ہے اور تمام ڈاکٹر ہمارے ساتھ ہمدردی اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔

میں نے ریڈ کراس کی ٹیم لیڈر خاتون سے جو اردو اچھی طرح بول سکتی تھی سے پوچھا کہ آپ کی ریڈ کراس نے ہماری رہائی کیلئے کیوں کچھ نہیں کیا، تو اس پر اس خاتون نے بتایا کہ ریڈ کراس ایسے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی بلکہ ریڈ کراس جنگ زدہ اور آفت زدہ علاقوں میں متاثرہ افراد کی مدد کرتی ہے علاوہ ازیں جنگی قیدیوں کو امداد بہم پہنچاتی ہے، بعد ازیں متذکرہ خاتون نے اپنے دوسرے ساتھی سے بیساکھیاں لیں جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور مجھے دیں اور مجھ سے کہا کہ ان کے ذریعے چلنے کی کوشش کرو، چنانچہ میں نے بیساکھیاں پکڑیں اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں بیساکھیوں کے ذریعہ کھڑا نہ ہو سکا چنانچہ ریڈ کراس کے دو افراد نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر احتیاط سے کھڑا کیا اور بیساکھیاں میرے ہاتھوں میں تھما کر مجھے چلانے لگے، دو چار چکر وارڈ کے انہوں نے مجھے پکڑ کر لگوانے کے بعد مجھے دوبارہ بیڈ پر بٹھا دیا ، ریڈ کراس کی لیڈر خاتون نے مجھے روزانہ تھوڑا تھوڑا چلنے کی کوشش کرنے کی تاکید کی اور اپنی ٹیم کے ہمراہ وارڈ سے نکل گئی۔

آنے والے دنوں میں میں نے دو تین مرتبہ بیساکھیوں کے ذریعہ چلنے کی کوشش کی لیکن نہ چل سکا بلکہ ایک مرتبہ تو اسی کوشش میں برے طریقہ سے گرا، تکلیف تو بہت ہوئی کیونکہ زخم ابھی تازہ تھے مگر کسی نئی چوٹ سے اس لئے بچ گیا کہ کھڑے ہوتے ہوئے بیڈ پر ہی گرا جو کہ کافی نرم تھا اس کے بعد میں نے ہسپتال میں رہتے ہوئے دوبارہ چلنے کی کوشش نہیں کی۔

ہم تقریباً مزید ایک مہینہ ہسپتال میں رہے اور اس کے بعد ریڈ کراس والوں نے ہمیں دوبارہ جیل میں منتقل کر دیا جہاں پر ہمارے ساتھی قیدیوں نے میرے بارے میں بتایا کہ ہم آپ کی زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے کیونکہ جس وقت آپ کو ہسپتال لے جایا گیا تھا اس وقت آپ کی حالت بہت نازک تھی، بہر حال ساتھیوں نے ہمارے آنے پر خدا کا شکر ادا کیا اور ہمیں خوب تسلی دی اور ہمارا حوصلہ بڑھایا، حالانکہ ہمارے آنے سے پہلے بقول ساتھیوں کے جیل میں قیامت صغریٰ کا منظر تھا یعنی ساتھیوں کو تحقیق کے دوران انتہائی ظلم و ستم کے ساتھ تشدد کا نشانہ بنایا گیا، پورا مہینہ جیل کے در و دیوار صبح سے لے کر رات گئے تک مظلوم ساتھیوں کی چیخ و پکار سے گونجتے رہے، کوئی ایسا ستم نہ تھا جو چنگیز و ہلاکو کے جانشینوں نے ساتھیوں پر روا نہ رکھا ہو۔

جیل کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی، کمرے بہت کم تھے جبکہ قیدی زیادہ تھے، دراصل یہ کوئی باقاعدہ جیل نہ تھی بلکہ کوئی فوجی دفتر وغیرہ تھا جس میں ایک بڑا کمرہ تھا جو کبھی ایک چھوٹا سا سینما تھا جس میں پچاس ساٹھ آدمیوں کی گنجائش تھی لیکن اس وقت اس میں تین سو قیدی ٹھونسے ہوئے تھے اس کمرے کے بالکل پیچھے مزید تین چار کمرے تھے جن کے دروازے الگ الگ تھے اور ان میں سے ہر کمرہ پانچ چھ آدمیوں کی گنجائش کا تھا لیکن ان میں پچیس پچیس قیدیوں کو رکھا ہوا تھا، اس سے آگے بائیں طرف تین کمرے تھے جن میں سے دو کمروں میں طالبان کمانڈر قیدیوں کو رکھا ہوا تھا جبکہ ایک کمرہ میں سابقہ کمیونسٹ حکومت کے نائب صدر اسد اللہ سروری کو رکھا ہوا تھا جو کبھی خفیہ ایجنسی "خاد" کا سربراہ بھی تھا۔

ان کمروں کے سامنے چھوٹا سا گراؤنڈ تھا جس میں توت اور سیب کے درخت لگے ہوئے تھے اور اس گراؤنڈ سے بائیں طرف ذرا اونچائی پر مطبخ اور تنور تھا، سینما کی عمارت کے اوپر بالا

خانہ تھا جو جیل کے عملہ کے زیر استعمال تھا جس کی سیڑھیاں پچھلے کمروں کے ساتھ تھیں جبکہ بیرونی مین گیٹ کے ساتھ دو کمرے تھے جو پہرے داروں کے استعمال میں تھے گیٹ کے اوپر بائیں طرف ایک پہرے دار کی برجی تھی، گیٹ میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف یعنی سینما کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا گراؤنڈ تھا (جہاں پر نئے قیدیوں کے آنے پر۔ بعد میں تین کمرے تعمیر کردیئے گئے تھے) اور گراؤنڈ کے ساتھ ہی انتہائی بائیں جانب تین کمرے تھے جو کہ تقریباً سارے تحقیق کرنے والے عملے کے زیر استعمال تھے۔

جیل کے اس کمرہ میں جس میں مجھے لایا گیا تھا اس میں ہمارے ساتھیوں کے علاوہ چند نئے چہرے بھی تھے جن میں کچھ تو ہمارے ہی ہم مشن تھے لیکن چند ساتھی ایسے بھی تھے جو طالبان کے مہمان تھے اور طیارہ ہائی جیکنگ میں گرفتار ہوئے تھے، (ان کا مفصل ذکر آگے آ رہا ہے) بہر حال مجھے اور بھائی یسین کو اس کمرے یعنی سینما کے ایک گوشے میں جگہ دی گئی جہاں پر پہلے بھی کچھ زخمی ساتھی موجود تھے اس گوشے میں جگہ بہت کم تھی جبکہ ساتھی زیادہ تھے، لیکن ساتھیوں نے کمال ہمدردی کے ساتھ خود تنگ ہو کر مجھے اور بھائی غلام یسین کو جگہ فراہم کی۔

ہسپتال سے جیل میں پہنچے میرا تیسرا دن تھا جب صبح تقریباً دس بجے جیل کا باشی ڈگروال (یہ شمالی اتحاد کا اپنا قیدی تھا، باشی جیل کے نمبردار کو وہاں کی زبان میں کہا جاتا ہے، ڈگروال یعنی کیپٹن جو کسی وجہ سے یہاں قید تھا) ہمارے کمرہ میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ زخمی باہر آ جائیں اور اپنے زخموں کی پٹیاں تبدیل کروالیں کیونکہ باہر ڈاکٹر آیا ہوا ہے، میں چونکہ ابھی بیساکھیوں پر خود سے ٹھیک طرح سے نہیں چل سکتا تھا اس لئے بھائی فرقان الرحمٰن جو کہ کراچی کے رہنے والے تھے مجھے بوقت ضرورت سہارا دے کر باہر لے جاتے تھے، چنانچہ اب بھی بھائی فرقان نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا، جب ہم کمرہ سے باہر نکلے تو بہت سارے ساتھی باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے جن میں استاد حسان حبیب بھی تھے جب ہم ان کے قریب سے گزرے تو استاد نے رومال اپنے منہ پر ڈال لیا، پٹی تبدیل کروا کر جب ہم واپس آئے تو استاد حسان ویسے ہی منہ چھپائے بیٹھے تھے، میں نے بھائی فرقان جو مجھے سہارا

دیئے ہوئے تھے کو کہا کہ مجھے بھائی حسان کے قریب بٹھا دو (یاد رہے کہ استاد حسان حبیب ہمارے گروپ کے ذمہ دار تھے) جب میں استاد حسان کے قریب بیٹھ چکا تو میں نے سلام کرنے کے بعد ان سے پوچھا کہ حسان بھائی کیا مسئلہ ہے آپ کیونکر پریشان ہیں؟ اس پر انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا کہ "حامد بھائی بڑوں نے مجھ پر اعتماد کر کے مجھے آپ سب کا ذمہ دار بنایا تھا لیکن میں اس ذمہ داری میں پورا نہیں اتر سکا اور آپ سب ساتھیوں کو یہاں پھنسوا دیا، کل میں اللہ تعالیٰ کے حضور اور بڑوں کے سامنے کیا جواب دوں گا، اس پر میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ حسان بھائی! ہم سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین کی سر بلندی کیلئے نکلے ہیں اور اپنی جانوں کا سودا اللہ تعالیٰ سے کر کے آئے ہیں اور پھر جہاد فی سبیل اللہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے بلکہ یہ کانٹوں سے پر مشکلات کا راستہ ہے اور اس راستے میں جو بھی آئے گا اس کے ذہن میں یہ ہونا چاہیے کہ اس راستے میں زخم بھی لگیں گے، جسم کے اعضاء بھی کٹیں گے، گردنیں بھی تن سے جدا ہونگی اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں گی اور جب ہم اپنی جانیں خالق کائنات کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہیں تو خریدار اب ہمیں جس حال میں رکھے اس کا شکر گزار رہنا چاہیے، اور پھر ساتھیوں کے قید ہونے میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں ہے اور بھی تقریباً سات سو طالبان ہمارے ساتھ ہی گرفتار ہوئے ہیں ان کے تو آپ ذمہ دار نہیں تھے، اس لئے اس بات کو سوچ کر آپ پریشان نہ ہوں، یہ اللہ کے کام ہیں اور ہمیں اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہیے، میری اس بات چیت سے حسان بھائی کچھ مطمئن ہو گئے اور کہنے لگے کہ "حامد بھائی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جلد از جلد اس قید سے نجات عطا فرمائے اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرمائے، میں نے آمین کہا اور وہاں سے اٹھ کر فرقان بھائی کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا۔

اگلے دن باشی مجھے بلا کر تحقیق والے کمرے میں لے گیا اور مجھے وہاں لے جا کر بٹھا دیا وہاں پر کمرے میں تین چار تحقیق کرنے والے افسر بیٹھے ہوئے تھے جو میری طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے قصاب ذبح ہونے والے جانور کی طرف دیکھتے ہیں، تھوڑی دیر بعد ایک اور ساتھی کو لایا گیا جس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ یہ ساتھی کشمیر کے ایک ٹریننگ سنٹر میں

استاد تھا اور میں نے اس کے ساتھ کچھ دن گزارے تھے حالانکہ اس ساتھی کے بارہ میں دوسرے پاکستانی قیدیوں نے بتایا تھا کہ تحقیق کے دوران ہماری ترجمانی کرنے والا ایک ایرانی طالب ہے جو پاکستانیوں یعنی ہماری جماعت ہی کا ایک فرد ہے، لیکن چونکہ میں نے ابھی تک اس ساتھی کو دیکھا نہیں تھا اب جب اس ساتھی کو دیکھا تو کشمیر میں گزرا ہوا وقت میری آنکھوں کے سامنے آ گیا اس ساتھی کا نام خالد تھا، خالد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہا اور جب میری طرف دیکھا تو چند ثانیے غور سے دیکھتا رہا پھر آنکھ کا اشارہ کر کے فوراً دوسری طرف متوجہ ہو گیا، یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ اپنی شناسائی یہاں پر ظاہر نہ کروں، بہر حال میری تحقیق شروع ہو گئی اور مجھے لوہے کے ایک بینچ پر بٹھا دیا گیا اور سامنے ٹیبل پر ایک بڑا سا پرانی قسم کا ٹیلی فون نما آلہ لا کر رکھ دیا گیا جبکہ کمرے کی دیواروں کے ساتھ تشدد کرنے والے مختلف قسم کے خطرناک آلات آویزاں تھے جن کو دیکھتے ہی انسان کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

میری تحقیق کرنے والا بھوری آنکھوں، اور بھوری ڈاڑھی والا آدمی تھا جو آدمی کم اور بھیڑیا زیادہ معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں سے وحشت ٹپکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور بھائی خالد کے توسط سے پہلا سوال کیا کہ ''کہاں کے رہنے والے ہو؟ بھائی خالد نے اس سوال کے ساتھ ہی جلدی جلدی مجھ سے کہا کہ ہر سوال کے جواب میں باتیں کرتے رہنا جہاں مشکل ہو گی میں خود ہی جواب دیتا رہوں گا'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''پاکستانی ہوں، اس نے فوراً دوسرا سوال کیا کہ، پاکستان کے کونسے شہر کے رہنے والے ہو؟ میں نے جواب دیا لاہور کا رہنے والا ہوں، اس نے تیسرا سوال داغا، کہاں سے گرفتار ہوئے ہو؟ میں نے کہا کہ چاریکار سے، چوتھا سوال، اسلحہ کونسا تھا تمہارے پاس؟ میں نے کہا کہ کلاشنکوف۔ پانچواں سوال: تمہارا افغانی کمانڈر کون تھا؟ ملا محب اللہ اخوندزادہ، میں نے جواب دیا۔ میں جو جواب دے رہا تھا تحقیق کرنے والا جس کا نام بعد میں ہم نے ''بلا'' رکھا تھا مسلسل لکھ رہا تھا، چھٹا سوال کرتے ہوئے تحقیق کرنے والے نے اپنے آپ کو بڑا دانش ور اور باخبر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم اپنے مخصوص ذرائع سے تمہارے بارے میں ہر طرح کی خبر رکھتے ہیں کہ تم پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے جنرل ہو لیکن ہم تمہاری زبان سے اگلوانا

چاہتے ہیں، اب بولو کہ تم آئی ایس آئی کے جنرل ہو؟ میں یہ سوال سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

مان جاؤں کہ تم جنرل ہو

اس سوال کرنے والے کی عقل پر میرا دل ماتم کرنے کو چاہ رہا تھا کہ مجھے بیس سال کی عمر میں جنرل بنا رہے تھے حالانکہ پاکستان میں تقریباً پچاس کی عمر کے قریب جا کر کوئی جنرل کے عہدہ پر پہنچتا ہے، میں نے جواب دیتے ہوئے وہی کہا جو حقیقتاً سچ تھا کہ میں ایک عام آدمی ہوں اور طالب علم ہوں، لیکن ''بلا'' اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھا اور اسی بات پر اڑا ہوا تھا کہ تم تسلیم کرو کہ تم آئی ایس آئی کے جنرل ہو، میرے مسلسل انکار پر وہ بھڑک اٹھا، بری طرح دھاڑنے اور مغلظات بکنے لگا، اسی اثناء میں اس نے قریب ہی موجود فوجیوں کو دھاڑتے ہوئے کچھ کہا تو ایک فوجی جو شاید اسی کام کیلئے مستعد کھڑا تھا جلدی سے میرے سامنے میز پر رکھی ہوئی مشین کی طرف لپکا اور مشین سے منسلک شکنجہ نما چٹکیوں کو اٹھایا ایک ایک میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر لگا دی اور مشین کے ہینڈل کو پکڑ کر حکم کا انتظار کرنے لگا، بلا ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا کہ اب بھی وقت ہے مان جاؤ کہ تم جنرل ہو، مجھے اس قسم کی صورتحال کی بالکل توقع نہیں تھی کیونکہ ساتھیوں نے بتایا تھا کہ سب زخمی ساتھیوں کی تحقیق بالکل سرسری سی ہوئی تھی اور کسی زخمی ساتھی پر تشدد نہیں کیا گیا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی لیکن موجودہ صورتحال جس سے میں دوچار تھا بالکل میرے اندازے اور گمان کے برعکس تھی۔

بہرحال اُس نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے انتہائی کرخت لہجے میں کہا کہ ''یہ مشین جو دیکھ رہے ہو پتھروں کی زبان بھی کھول دیتی ہے اور تم کیا چیز ہو، میرے انکار پر اس نے مشین پر متعین فوجی سے کچھ کہا جس نے سنتے ہی مشین کا ہینڈل تیزی سے گھما دیا جس کے نتیجے میں مجھے اس زور سے کرنٹ کا جھٹکا لگا کہ میں اچھل کر بینچ سے نیچے جا گرا اور چٹکیاں میری انگلیوں سے نکل گئیں، میرا گرنا تھا کہ وہاں پر موجود فوجیوں نے مجھے ٹھڈوں اور چھڑیوں سے پیٹنا شروع کر دیا اور دو تین منٹ مسلسل پیٹنے کے بعد مجھے اٹھا کر دوبارہ پھر لوہے کے بینچ پر بٹھا دیا لیکن ان دو تین منٹوں میں انہوں نے مار مار کر میرا بھرکس بنا دیا جبکہ کرنٹ اتنا شدید تھا جس نے مجھے دن میں تارے دکھا دیئے اتنے ظلم وستم کے باوجود میں نے کوشش کی کہ میری طرف

سے بزدلی کا مظاہرہ نہ ہو، اسی لئے کرنٹ کھانے اور مار برداشت کرنے کے باوجود میری کوشش یہی تھی کہ میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکلے جس میں کافی حد تک میں کامیاب بھی رہا تھا لیکن مجھے یہ بہادری کافی مہنگی پڑی کیونکہ میرے خاموش رہنے اور شور شرابا نہ کرنے کی وجہ سے ان کی حس چنگیزیت کو شاید سکون نہیں ملا، اسی لئے انہوں نے مجھے دوبارہ لوہے کے بینچ پر بٹھا کر مجھے چٹکیاں لگا دیں لیکن اس بار انہوں نے چٹکیوں کی تعداد بڑھا دی یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر چٹکیاں لگانے کے علاوہ میرے دونوں کانوں اور پاؤں کے انگوٹھے پر بھی چٹکیاں لگا دیں اور اس پر مستزاد یہ کہ میرا پاؤں پانی سے بھرے ہوئے لوہے کے ٹب میں ڈال دیا گیا۔

اس تمام کارروائی کے دوران ''بلاّ'' یعنی تحقیق کرنے والا مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا اور جب مجھے کرنٹ لگانے کیلئے چٹکیاں لگ چکیں تو ''بلاّ'' مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ ''اب تمہاری ہڈیاں بھی بولیں گی کہ میں آئی ایس آئی کا جنرل ہوں بصورت دیگر اسی طرح کرنٹ لگا لگا کر تمہیں مار ڈالیں گے اور تمہاری لاش سامنے بہتے ہوئے دریا میں بہا دیں گے لیکن آخری بار تمہیں موقع دیتا ہوں سچ سچ بتا دو تم پاکستانی فوج کے صاحب منصب (افسر) ہو'' لیکن میرا پھر وہی جواب تھا جو دراصل حقیقت پر مبنی تھا یعنی میں تو کوئی فوجی افسر نہیں ہوں، خالد بھائی نے ''بلےّ'' کی مندرجہ بالا باتوں کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی بتا دیا کہ زیادہ بہادر بننے کی کوشش نہ کرو بلکہ تھوڑی سی اذیت پر بھی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لوں اور تکلیف کا بھرپور طریقہ سے اظہار کروں، خالد بھائی نے مزید بتایا کہ ایسا کرنے سے ہی جان چھوٹے گی کیونکہ جس آدمی پر یہ لوگ تشدد کرتے ہیں اسے اپنے سامنے بے بس اور کمزور دیکھ کر یہ لوگ خوش ہوتے ہیں چنانچہ مشین پر متعین فوجی نے جیسے ہی مشین کا لیور گھمایا، میں نے دونوں ہاتھوں سے بینچ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تاکہ گرنے سے محفوظ رہ سکوں اور چیخنا چلانا شروع کر دیا اس مرتبہ کرنٹ کے جھٹکے پہلے سے کئی گنا شدید تھے جنہوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرا ذہن بالکل ماؤف کر دیا لیکن میرے چیخنے چلانے اور تڑپنے کا خاطر خواہ اثر ہوا کہ وہاں پر موجود ہر آدمی ''بلےّ'' سمیت میرے چیخنے چلانے پر قہقہے لگا رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

میرے کچھ سنبھلنے پر "بلے" نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "اب تمہارے ہوش ٹھکانے آ چکے ہوں گے، اب بتاؤ اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟ میں کچھ دیر خاموش رہا جس سے "بلے" اور وہاں پر موجود دوسرے لوگوں کو امید ہو چلی تھی کہ اب کی بار میں جنرل ہونے کا اعتراف کر لوں گا لیکن کچھ دیر بعد جب میرے اوسان کچھ بحال ہوئے تو میں نے کہا کہ جو میں تمہیں بتا رہا ہوں وہی سچ ہے، لیکن آپ مجھے جھوٹ بولنے پر اکسا رہے ہیں اور مجبور کر رہے ہیں، لیکن میں جو کچھ نہیں ہوں اس کے ہونے کا اعتراف نہیں کر سکتا، یعنی میں جنرل ہونا تو درکنار عام فوجی بھی نہیں ہوں، میرے جواب پر "بلا" آگ بگولا ہو گیا اور مغلظات بکنے لگا اور اٹھ کر اس نے قریب کھڑے ایک فوجی سے بید کی چھڑی لی اور اندھا دھند مجھے پیٹنے لگا اور پیٹ پیٹ کر جب تھک گیا اور میرا حال بھی کافی ابتر ہو گیا تو اس نے حکم دیا کہ لے جاؤ اسے میں بعد میں اسے دیکھتا ہوں کہ اس میں کتنا دم خم ہے، چنانچہ مجھے میرے کمرے میں ساتھیوں کے پاس پہنچا دیا گیا۔

تحقیق کے نام پر ظلم و ستم کا یہ سلسلہ تقریباً ایک ہفتہ تک جاری رہا اور ہر روز صبح، دوپہر اور رات کو مجھے اذیت اور کرب کی اس بھٹی سے گزارا جاتا رہا، میرے زخموں سے پٹیاں نوچ کر ان پر نمک پاشی کی جاتی رہی، زخموں پر نمک ملا پانی ڈال کر کرنٹ کی چٹکیاں لگائی جاتی رہیں، غرضیکہ ایک ہفتہ تک مجھے دردناک اذیتوں سے دوچار کیا جاتا رہا، اس دوران کوئی ایسا ستم نہ تھا جو مجھ پر روا نہ رکھا گیا ہو لیکن ان کا یہ سوال جس پر ان کی سوئی اٹکی ہوئی تھی کہ تم فوج کے صاحب منصب ہو، میرا ایک ہی جواب تھا کہ میں صرف عام طالب علم ہوں اور فوج سے میرا دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔

یاد رہے کہ میری اس استقامت کے پیچھے میری بہادری اور قوت برداشت کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا بلکہ یہ خوف زیادہ کارفرما تھا کہ اگر میں ظلم و ستم سے جان چھڑانے کیلئے اعتراف کر لوں تو نہ جانے یہ لوگ میرا کیا حشر کریں اور مجھے کن کن عذابوں سے گزاریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا یہ اعتراف میری آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہی نہ بن جائے اور یہ لوگ مجھے روس یا انڈیا کے حوالے نہ کر دیں کیونکہ روس اور انڈیا کے ساتھ شمالی اتحاد کا بڑا مضبوط گٹھ

جوڑ تھا۔

میری تحقیق کا مسلسل ساتواں دن تھا اور جب مجھے وہ تحقیق والے کمرے کی طرف لے جا رہے تھے تو خالد بھائی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''حامد بھائی یہ جو کہتے ہیں اس کا اعتراف کرلو اور اپنی جان ان ظالموں سے چھڑاؤ اب یہ ان کی انا کا مسئلہ بنا ہوا ہے اب یہ کوئی بھی بڑا قدم اٹھا سکتے ہیں، تمہارے اعتراف کرنے یا نہ کرنے سے تمہاری قید کی مدت نہ بڑھ سکتی ہے اور نہ کم ہوسکتی ہے ہم چونکہ جنگی قیدی ہیں اور جنگی قیدیوں کی کوئی متعین مدت نہیں ہوتی ، سر دست اس روز روز کے ظلم وستم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرو''۔

میں نے خالد بھائی کو جواب دیتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے خالد بھائی اگر میرے اعتراف کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس سے اگر ہر روز کے تشدد اور مار کٹائی سے جان چھوٹتی ہے تو آج میں اعتراف کرلوں گا، آگے اللہ مالک ہے اور جو معاملہ بھی ہو اللہ تعالیٰ اس میں استقامت دے اور ہماری حفاظت فرمائے آمین۔

تحقیق کا کمرہ روز کی طرح آلات تشدد سے سجا ہوا تھا اور ''بلا'' بھی اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ میرا منتظر تھا اور میں جونہی کمرے میں داخل ہوا ''بلے'' نے انتہائی طنزیہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''تمہاری طبیعت کچھ بہتر ہوئی ہے یا ابھی بھی کوئی کسر باقی ہے'' میں جواب دیئے بغیر اپنی جگہ یعنی لوہے کے بینچ پر بیٹھ گیا جبکہ ''بلے'' نے بھی کاغذ قلم سنبھالا اور مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ 'آج میری ڈیوٹی کے اس ہفتہ کا آخری دن ہے اور تمہیں آج اپنے صاحب منصب ہونے کا اعتراف کرنا پڑے گا ورنہ تمہاری زندگی کا بھی آج آخری دن ہوگا میں اب تک تمہارے ساتھ رعایت برتتا آرہا ہوں لیکن اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''اگرچہ جو کچھ تم لوگ مجھے بنا رہے ہو وہ میں نہیں ہوں لیکن مجبوراً میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں فوجی افسر ہوں اور اگر تم لوگ مجھے پاکستان کا صدر یا وزیراعظم بھی بناؤ تو اس کا بھی میں اعتراف کرلوں گا۔ ''بلے'' نے دھاڑتے ہوئے کہا کہ زیادہ بکواس نہ کرو جو سوال تم سے کیا جارہا ہے اس کا سیدھے لفظوں میں جواب دو اور زیادہ

چالاک بننے کی کوشش نہ کرو، میں نے کہا ہاں میں فوجی صاحب منصب ہوں، بلا خوش ہوتے ہوئے چیخا ہاں یہ ہوئی نہ بات آخر کار میں نے تمہیں منوا ہی لیا، میرے سامنے تو بڑے بڑے سورمے بکری بن جاتے ہیں اور تم کیا چیز ہو، یہ بات کر کے اس نے اپنے سامنے موجود کاغذوں پر کچھ لکھا جو ظاہر ہے میرا اعتراف ہی ہو گا اور وہاں پر موجود دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر کچھ کہنے لگا، جبکہ دوسرے لوگ ''بلے'' کے جواب میں تبریک تبریک یعنی مبارک ہو کہنے لگے جبکہ ''بلا'' پھولے نہیں سمارہا تھا اور تکبر اور غرور سے اس کا سر اونچا ہو رہا تھا اور ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی نا قابل تسخیر قلعہ فتح کر لیا ہو۔

میرے اعتراف کرنے کے بعد میری جان خالد بھائی کے گمان کے مطابق واقعی چھوٹ گئی لیکن مسلسل ایک ہفتہ جوانہوں نے میری درگت بنائی اس نے مجھے نہایت کمزور کر دیا تھا اور اس بہیمانہ تشدد کے اثرات کافی عرصہ تک رہے۔

جیل میں ہم قیدیوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی، قیدیوں کی تعداد کے حساب سے جیل میں رہنے کی جگہ نہ ہونے کے برابر تھی، تندرست ساتھی تو ایک طرف ہم زخمیوں کو جیل کے کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا تھا جہاں بمشکل پانچ چھ آدمیوں کی جگہ تھی جبکہ ہم ۲۵ زخمیوں کو وہاں ٹھونسا ہوا تھا، ایسی حالت میں جب بھی کوئی ساتھی اٹھ کر بیٹھتا یا کچھ حرکت کرتا تو کسی نہ کسی ساتھی کے زخم ضرور دکھ جاتے، صفائی کا جیل کے کمروں میں کوئی انتظام نہیں تھا اور لباس بھی وہی تھے جن میں ہم گرفتار ہوئے تھے جو جگہ جگہ سے پھٹ کر بوسیدہ ہو چکے تھے، غرض یہ کہ جو لباس ساتھیوں نے پہن رکھا تھا وہ صرف ستر پوشی ہی کرتا تھا، جبکہ جوتے بہت تھوڑے ساتھیوں کے پاؤں میں تھے اور اکثر ساتھی جوتوں سے محروم اور ننگے پاؤں رہنے پر مجبور تھے۔

جیل میں کھانے کی حالت بھی تسلی بخش نہیں تھی، کھانا اگرچہ اکثر تین وقت ملتا تھا لیکن انتہائی کم اور ناقص، صبح کے ناشتہ میں تقریباً ۵۰ گرام کی روٹی اور ایک کپ پھیکے قہوہ کا ہر قیدی کو دیا جاتا، دوپہر کو چاول فی کس چند نوالے اور رات کو پھر ۵۰ گرام کی ایک روٹی ملتی اور جس آٹے سے روٹی بنائی جاتی وہ بھی انتہائی ناقص ہوتا تھا، غرض کہ جیل میں جو کھانا ملتا تھا وہ صرف جسم کا سانسوں کے ساتھ رشتہ برقرار رکھنے کیلئے تھا، غذائیت نام کی جیل کے کھانے میں کوئی چیز نہیں

تھی، کئی دفعہ تو ایسا ہوتا تھا کہ کھانا ملتا ہی نہ تھا اور کئی کئی وقت فاقے کرنے پڑتے تھے، جس کی وجہ سے سب قیدی ساتھی دن بدن لاغر اور کمزور ہوتے جا رہے تھے، غرضیکہ جیل میں ہمارا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

حسن بھائی اور خالد بھائی کو ابتدائی چند مہینے ہم سے الگ دوسرے کمرے میں افغانی ساتھیوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا اور ان کو ہمارے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی، جس کا خالد اور حسن بھائی کو بڑا قلق تھا اور ہم بھی اکثر ان کے بارے میں پریشان رہتے تھے۔

جیل میں قیدیوں کے لگے بندھے معمولات تھے یعنی صبح ہوتے ہی تمام قیدیوں کو زخمیوں کے علاوہ قضائے حاجت اور وضو کے لئے دریا پر لے جایا جاتا، اکثر جیل کا عملہ قصداً ہماری صبح کی نماز قضا کروا دیتا تھا اور سورج نکلنے پر باہر لے جایا جاتا، اگرچہ ساتھی صبح صادق کے وقت ہی دروازے پیٹنے شروع کر دیتے تھے لیکن پہریداروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، صرف کبھی کبھار ہی ٹھیک وقت پر صبح کے وقت ساتھیوں کو وضو کیلئے لے جایا جاتا، پھر دوپہر اور عصر کے وقت دریا پر لے جایا جاتا، تین وقت جیل کا عملہ قیدیوں کو قضائے حاجت اور وضو کیلئے لے جاتا تو ضرور تھا لیکن ان اوقات کے دوران اشالی اتحاد کی شقاوت، بدبختی اور ظلم اپنی انتہا کو پہنچا ہوتا تھا اور ان کے قبیح ظلم اور شقاوت کی مثال شاید تاریخ انسانی میں کہیں بھی نہ ملتی ہو، جونہی ساتھی دریا کے ساتھ والے وسیع میدان میں پہنچ کر قضائے حاجت کے لئے بیٹھتے شمالی اتحاد کے سپاہی ان پر پتھر برسانا شروع کر دیتے اور "برخیز، زود کن" یعنی جلدی کرو، اٹھ جاؤ کا شور مچانا شروع کر دیتے، مجبوراً ساتھیوں کو اٹھنا پڑتا جس سے ساتھیوں کے کپڑے اور جسم ناپاک ہو جاتا اور ایسے میں جو تکلیف ساتھیوں کو اٹھانا پڑتی تھی وہ وہی جانتے ہیں اس کو زبان بیان کرنے اور قلم لکھنے سے قاصر ہے۔

دریا کے کنارے جب قیدی یخ بستہ اور رگوں میں خون کو منجمد کر دینے والے ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہے ہوتے تھے تو ایسے میں شمالی اتحاد کے ظالم بھیڑیئے وضو کرتے ہوئے ساتھیوں میں سے کسی نہ کسی کو دھکا دے کر دریا میں پھینک دیتے اور پھر تین چار مزید قیدی ساتھیوں کو دریا میں پھینکے گئے ساتھی کو باہر نکالنے کیلئے دریا میں اترنے پر مجبور کر دیا جاتا حالانکہ دریا کے

کنارے کے قریب پانی گہرا نہیں ہوتا تھا اور دریا میں پھینکا گیا قیدی خود ہی نکل آتا تھا لیکن پھر بھی تین چار ساتھیوں کو دریا میں اترنا پڑتا تھا، ایسے میں سپاہی دریا کے کنارے کھڑے ہو کر خوب قہقہے لگاتے اور قیدیوں کی بے بسی پر خوب جھومتے اور آوازیں کستے۔ تمام قیدی بے بسی سے یہ تمام ظلم وستم دیکھتے اور برداشت کرتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

جو ساتھی دریا میں گرائے جاتے تھے ان کو پنجشیر کے یخ بستہ اور برفانی موسم میں انہیں گیلے کپڑوں میں ہی گزارا کرنا پڑتا تھا کیونکہ تمام قیدیوں کے پاس پہنے ہوئے کپڑوں کے علاوہ کوئی اضافی کپڑے تھے ہی نہیں، لیکن قدرت نے یہاں یہ آسانی فرمائی کہ جیسے ہی ساتھی کمروں میں پہنچتے تھوڑی دیر بعد سردی کافور ہو جاتی حالانکہ باہر برفباری ہو رہی ہوتی تھی جبکہ کمرے گرم ہوتے تھے، حالانکہ ایسے برفباری والے علاقوں میں ہیٹر اور بخاریاں بھی اتنا گرم نہیں کرتی تھیں جتنا ہمارے جیل کے کمرے خود بخود گرم ہو جاتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کمرے چھوٹے تھے جبکہ قیدیوں کی تعداد کمروں کی گنجائش سے بہت زیادہ تھی۔ اگرچہ ہم قیدی ساتھی کم جگہ ہونے کی وجہ سے مسلسل تکلیف میں رہتے تھے، ٹھیک طریقہ سے نہ بیٹھ سکتے تھے اور نہ ہی لیٹ سکتے تھے اگر یہ کہا جائے کہ سوتے وقت ساتھیوں کو تہہ در تہہ ہو کر سونا پڑتا تھا تو بے جا نہ ہوگا، کیونکہ ساتھی ایک کروٹ پر سوتے تھے اور پھر پوری رات کروٹ بدل نہیں سکتے تھے کیونکہ کروٹ بدلنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی اور باہر برفباری اور تند و تیز ہواؤں کے چلنے کے باوجود جیل کے کمروں میں سردی کا نام ونشان تک نہیں ہوتا تھا، سردیوں کی برفباری کے موسم میں یہی ایک بہت بڑا فائدہ تھا جس کو فی الوقت دشمن ہم سے چھین نہیں سکتا تھے، لیکن وقتاً فوقتاً اس میں رخنہ اندازی مختلف بہانوں سے ضرور کرتے رہتے تھے، کبھی قیدیوں کی گنتی کے بہانے اور کبھی بین الاقوامی میڈیا والے ہمارے لئے دردسر بن جاتے تھے کیونکہ اکثر مختلف ممالک کے پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے صحافی جیل میں آتے رہتے تھے اور جب بھی میڈیا کے صحافیوں کا کوئی گروپ جیل میں آتا تو ہمیں گھنٹوں اور بعض اوقات پورا پورا دن کمروں سے باہر سردی میں گزارنا پڑتا تھا اور صحافیوں کے بے تکے اور بھونڈے قسم کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

شمالی اتحاد والے ہم قیدیوں کو تنگ اور پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے بلکہ وہ ایسے مواقع روزانہ خود ہی بناتے رہتے تھے، چنانچہ روزانہ وہ سخت سردی میں ساتھیوں کو بیگار پر لے جاتے اور لاتے ہوئے ساتھیوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرتے اور ایسے راستے سے ساتھیوں کو لے کر جاتے جہاں زیادہ برف پڑی ہوئی ہوتی (ہماری گرفتاری کے بعد پنجشیر میں برفباری کا موسم شروع ہو گیا تھا) چونکہ اکثر ساتھیوں کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے جس کی وجہ سے ساتھی برف سے بچ کر چلنے کی کوشش کرتے لیکن ان کی یہ کوشش ان کے لئے دردناک تکلیف کا باعث بنتی کیونکہ جونہی کوئی ساتھی برف سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرتا تو شمالی اتحاد کے بھیڑیئے اس پر ٹوٹ پڑتے اور اس کو مار مار کر نڈھال کر دیتے چنانچہ ساتھی ننگے پاؤں برف پر چلنے پر مجبور ہوتے جس سے ان کے پاؤں سوج جاتے تھے۔

روزانہ اس اذیت ناک پیدل سفر کا انجام کسی نہ کسی اسلحہ ڈپو پر ہوتا جہاں مضبوط پیٹیوں میں بند اسلحہ ساتھیوں کا منتظر ہوتا، جسے قیدی ساتھیوں سے اٹھوا کر ٹرکوں میں لوڈ کروایا جاتا اور کبھی ٹرکوں سے ان لوڈ کروایا جاتا، اس بیگار کے دوران پہرے دار ہاتھوں میں کیبل (کوڑا) لے کر قیدی ساتھیوں کے اردگرد منڈلاتے رہتے جو ساتھی تھک جاتا یا جو ساتھی اسلحہ کی پیٹیاں اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا تو اس پر کوڑے برسانے شروع کر دیتے تھے۔ ایسے میں صحت مند اور مضبوط بدن کے ساتھیوں نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کمزور ساتھیوں کیلئے قربانی دی، یعنی ہر صحت مند ساتھی بیگار میں ایک ایک کمزور ساتھی کو اپنے ساتھ رکھ لیتا (کیونکہ اسلحہ کی پیٹی کو دو قیدیوں نے مل کر اٹھانا ہوتا تھا) اور کمزور ساتھی کے حصہ کا اکثر بوجھ بھی خود اٹھاتا، کمزور ساتھی صرف ہاتھ لگاتا یا جتنا بوجھ اٹھا سکتا تھا اٹھاتا بقیہ سارا بوجھ انتہائی مشقت اور تکلیف کے ساتھ توانا قیدی خود اٹھاتا اس طرح کے ایثار سے کمزور ساتھی ان کے ظلم و ستم سے کسی حد تک محفوظ ہو جاتے تھے۔

قیدی ساتھیوں کو ناشتہ کے بعد بیگار پر لے جانا تو روزانہ کا معمول تھا اس کے علاوہ شمالی اتحادوالوں کا جب دل کرتا ساتھیوں کو بیگار پر لے جاتے اس کیلئے کسی وقت کی قید نہیں تھی، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ رات بارہ بجے ساتھیوں کو نیند سے اٹھا کر لے جایا جاتا اور دوپہر کے بعد

ساتھیوں کو واپس جیل میں لایا جاتا۔

بیگار پر بامقصد کام کم ہی ہوتا تھا لیکن اکثر اوقات روزانہ ایسا کام ساتھیوں سے لیا جاتا تھا جس کا کوئی مقصد یا فائدہ ان کو مقصود نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف اور صرف قیدیوں کو دردناک اذیت میں مبتلا کرنا ان کا مقصد ہوتا تھا، یعنی اکثر ایسے ہوتا کہ اسلحہ اور ایمونیشن کی وزنی پیٹیوں کو ایک عمارت سے اٹھوا کر دوسری عمارت میں رکھوا دیا جاتا اور پھر وہاں سے اٹھوا کر پہلے والی عمارت میں واپس رکھوا دیا جاتا۔

ہماری گرفتاری کے تقریباً تین مہینے بعد جب رمضان المبارک کا بابرکت اور رحمتوں والا مہینہ آیا تو ہم ساتھی یہ گمان کر رہے تھے کہ اس بابرکت مہینے میں ان کے دلوں میں کچھ نرمی آ جائے گی اور رحم پیدا ہو جائے گا لیکن جب ماہ رمضان شروع ہوا تو ہمارا یہ گمان غلط ثابت ہوا اور انہوں نے انتہائی سنگدل ہونے کا ثبوت دیا کیونکہ اس بابرکت مہینہ میں ان کا ظلم وستم اور شقاوت قلبی دو چند ہو کر مزید بڑھ گئی، وہ لوگ روزہ دار قیدیوں کو جنہوں نے سحری میں برائے نام کھانا کھایا ہوتا تھا کیونکہ ملتا ہی اتنا تھا، بیگار پر لے جاتے اور ان سے انتہائی مشقت کا کام لیتے تھے، اکثر اوقات افطاری سے گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ پہلے وہ لوگ قیدیوں کے ہاتھ میں آدھی آدھی خشک روٹی دے کر بیگار پر لے جاتے اور کام کے دوران جب افطاری کا وقت ہو جاتا اور ساتھی ان کی دی ہوئی آدھی آدھی روٹی سے افطاری کرنے کی کوشش کرتے تو روٹی سے تو اکثر ساتھیوں کو افطاری کرنا نصیب نہ ہوتی بلکہ ان بدبخت بھیڑیوں کے کوڑے، ٹھڈے اور مکے کھانے پڑتے اور اگر کوئی ساتھی کام کے دوران نماز پڑھنے کی کوشش کرتا تو وہ خونخوار اور بزدل درندے نماز ہی میں اس ساتھی کو کوڑوں اور ٹھڈوں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیتے۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا کہ قیدی ساتھیوں کو سکون کے ساتھ نماز پڑھنا اور رمضان میں کام کے دوران افطاری کرنا نصیب ہوتا، وگرنہ اکثر بیگار کے دوران جتنی نمازیں آتیں سب قضا ہو جاتی تھیں، چنانچہ تمام بیگار والے ساتھی جیل میں واپس آ کر قضا نمازیں پڑھتے تھے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

جیل میں جہاں ہر طرف بربریت اور چنگیزیت کا راج تھا، ظلم وستم جہاں کا دستور تھا

نہتے اور بے بس قیدیوں کو نت نئے طریقوں سے اذیتیں دینا جہاں اک دل پسند مشغلہ تھا، خون آشام بھیڑیئے جہاں مظلوم اسیروں کا شکار کرنے کیلئے ہر وقت تاک میں رہتے وہیں پر جیل کے عملہ میں ایک ایسا بندہ خدا بھی موجود تھا جو مظلوم و بے بس قیدیوں کا مونس و غمخوار تھا جس کا دل قیدیوں پر ہونے والے مظالم پر کڑھتا تھا لیکن اس بیچارے کے بس میں کچھ نہ تھا، وہ اگر چہ جیل کا کمانڈر تھا لیکن جہاں ایک عام سپاہی سے لے کر سپر ٹینڈنٹ تک سب سیکولر اور کیمونسٹ ہوں وہاں ایک ایمان والے افسر کی دال کہاں گلتی ہے، چنانچہ یہ بندۂ خدا جو ملاّ کماندان کے نام سے مشہور تھا ایک بے اختیار افسر کے طور پر وہاں موجود تھا لیکن پھر بھی جب کبھی اسے موقع ملتا قیدیوں کے ساتھ بھلائی ہی کا معاملہ کرتا، ہماری گرفتاری کے ابتدائی دنوں میں چند پاکستانی ساتھیوں کو سزا کے طور پر پاؤں میں زنجیر ڈال کر ایک پاؤں پر پوری رات کھڑا کیا جاتا یہ سزا تقریباً تین دن پر محیط تھی اور ان تین دنوں میں ساتھیوں کا کھانا بھی بند تھا ان ایام میں ان ساتھیوں کو صرف پانی ملتا تھا جو افغانی ساتھی آ کر ان کو پلاتا تھا۔ ان دنوں میں ملا کماندان پوری پوری رات جاگ کر ڈیوٹی پر موجود پہرہ داروں کو کہیں اور مصروف کر کے سزا یافتہ ساتھیوں کو کنٹینروں کے اندر بستروں میں بٹھا دیتا اور کہیں نہ کہیں سے ان ساتھیوں کیلئے کھانے کا بھی بندوبست کر دیتا تھا اور جب کافی دیر بعد ڈیوٹی والے پہرہ داروں کے آنے کا وقت ہو جاتا تو ملاّ کماندان جلدی جلدی ساتھیوں کو واپس اسی جگہ پر کھڑا کر دیتا تھا، تین راتیں ملا کماندان نے قیدی ساتھیوں کیلئے جاگ کر اور ان کو مقدور بھر آسائش پہنچا کر انسان دوستی اور بھائی چارے کا ثبوت دیا۔

جیل میں ہمارے ساتھ تحریک طالبان کے چند بڑے کمانڈر بھی قید تھے جن میں نمایاں اور مشہور دو کمانڈر ملاّ مجاہد اخوند اور ملاّ عبدالباقی اخوند تھے، جیل کے عملہ پر ان دونوں کمانڈروں کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا، بڑے بڑے گرگوں کا ان کو دیکھتے ہی پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ملا مجاہد اور ملا عبدالباقی روس دور میں جمعیت اسلامی جس کے سربراہ برہان الدین ربانی اور جنگی کمانڈر احمد شاہ مسعود تھا کے مایہ ناز جنگی کمانڈر تھے، احمد شاہ مسعود کے کیمونسٹوں اور اتحادی ٹولے کے ساتھ گٹھ جوڑ اور اسلام پسندوں کے ساتھ واضح دشمنی رکھنے کے سبب یہ دونوں جمعیت اسلامی

اور احمد شاہ مسعود سے سخت نالاں تھے اور یہ اس بات پر سخت صدمہ لئے ہوئے تھے کہ جن کیمونسٹوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں نے ۱۵ لاکھ جانوں کی قربانی دی آج پھر وہی لوگ نام نہاد جہادی لیڈروں کے کندھوں پر سوار ہو کر اسلام کو دیس نکالا دینا چاہتے ہیں ، چنانچہ جب امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد (حفظہ اللہ تعالیٰ) کی قیادت میں تحریک طالبان شروع ہوئی جن کا منشور ہی یہی تھا ''شریعت یا شہادت'' تو ان دونوں نے لبیک کہتے ہوئے تحریک طالبان میں شمولیت اختیار کر لی اور امیر المومنین ملا محمد عمر (حفظہ اللہ تعالیٰ) کے ہاتھ پر بیعت کی اور کابل ،صوبہ کاپیسا، صوبہ پروان کی فتح کے بعد کاپیسا میں ایک معرکے کے دوان جہاں پر بہت سے دوسرے طالبان ساتھی گرفتار ہوئے وہیں پر اسلام کے یہ شیدائی اور جاں نثار بھی گرفتار ہو کر ہمارے ساتھ پنجشیر جیل میں پہنچ گئے۔

ملا کماندان

ملا عبدالباقی اور ملا مجاہد چونکہ روس دور میں جمعیت اسلامی کے مشہور جہادی کمانڈر تھے اس لئے احمد شاہ مسعود کے اکثر لوگ ان سے واقف تھے اسی وجہ سے شمالی اتحاد کے لوگ یعنی جیل کے عملہ پر ان کا رعب و دبدبہ ایک فطری بات تھی اور پھر انہوں نے شمالی اتحاد کی قید میں ہونے کے باوجود کبھی بھی اپنی غیرت ایمانی پر حرف نہیں آنے دیا اور نہ کبھی شمالی اتحاد کے بڑے بڑے کمانڈروں کے سامنے لچک کا مظاہرہ کیا یہ لوگ یعنی ملا عبدالباقی اور ملا مجاہد، احمد شاہ مسعود سے لے کر جیل کے عملے تک کے سامنے بغیر لگی لپٹی رکھے اپنے موقف کو بیان کر دیتے، اسی ایمانی جذبے اور بے خوفی کی وجہ سے جیل کے عملے کا کوئی بھی آدمی ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

جیل کا کمانڈر ملا کماندان بھی کبھی ملا عبدالباقی کا ماتحت رہ چکا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ ملا عبدالباقی کا بہت احترام کرتا تھا جبکہ دوسرے طالبان کمانڈروں اور عام طالبان کا بھی وہ دل سے احترام کرتا تھا اور درپردہ وہ تحریک طالبان کا بھی بڑا حامی تھا، ان تمام باتوں سے شمالی اتحاد والے بے خبر نہیں تھے لیکن وہ ملا کماندان پر ڈائریکٹ ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے کیونکہ ملا کماندان کا بہت بڑا قبیلہ وادی پنجشیر میں آباد تھا اور ملا کماندان اپنے قبیلے کے چند بڑوں میں شمار ہوتا تھا،

اور اپنے قبیلہ میں ہر دلعزیز شخصیت کا مالک تھا لیکن اس کے باوجود ملا کمانداں شمالی اتحاد کی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا تھا۔

آخر کار اس مرد جری کو انہوں نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت وادی پنجشیر کے ایک درے میں گولیاں مار کر شہید کر دیا اور مشہور یہ کیا کہ ڈاکوؤں نے اسے مارا ہے حالانکہ وادی پنجشیر کے تمام لوگ اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے حتیٰ کہ جیل کے بعض پہریداروں کو بھی یہ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے سنا گیا کہ ملا کمانداں کو ڈاکوؤں نے نہیں مارا۔ قصہ مختصر یہ کہ اصحاب شمال نے اپنی آنکھوں میں کھٹکنے والے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا۔ اللہ تعالیٰ ملا کمانداں کو غریق رحمت فرمائے۔ آمین

مظلوم مجاہد

احمد شاہ مسعود کے بارے میں عام خیال یہی پایا جاتا تھا کہ وہ افغان جہاد کا ایک اہم کمانڈر رہا ہے اور افغان جہاد میں اس نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، گرفتار ہونے سے پہلے میرا اور تقریباً اکثر پاکستانی ساتھیوں کا بھی یہی گمان تھا کہ احمد شاہ مسعود غلط فہمی کی بناء پر طالبان کے ساتھ لڑ رہا ہے اور ہم ساتھی اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ جس دن احمد شاہ مسعود کو اصل حقائق معلوم ہو گئے تو وہ ضرور طالبان کے ساتھ مل جائے گا لیکن گرفتار ہونے کے بعد احمد شاہ مسعود کی قید کے دوران ہم نے جن حالات کا مشاہدہ اپنی جاگتی آنکھوں سے کیا وہ ہمارے گمان کے بالکل برعکس تھا کیونکہ احمد شاہ مسعود کے اردگرد جتنے بھی حکومتی لوگ تھے اور جتنے بھی اس کے معاون و مددگار تھے ان میں سے اکثر کٹر کیمونسٹ اور روس کی باقیات تھے بلکہ ایک دفع ایک بوڑھے پنجشیری جو دس کلومیٹر کا پہاڑی سفر کر کے جیل میں بچی کھچی روٹیاں لینے آتا تھا سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ "بابا آپ روزانہ یہاں آتے ہیں اور پہرے داروں کی بچی کھچی روٹیاں لے کر جاتے ہیں تو اس کا آپ کیا کرتے ہیں" اس پر بابا بہت زیادہ غمزدہ ہو گیا (یہ واقعہ پنجشیر کی ایک دوسری جیل دشتک کا ہے جہاں ہمیں دن کے وقت جیل کے کمروں کے باہر چلنے پھرنے کی قدرے اجازت تھی) اور انتہائی غمناک لہجہ میں کہنے لگا کہ "بیٹا یہ ٹکڑے اگرچہ ان پہرے داروں کے لئے بے کار ہیں لیکن میں اور میرے گھر

والے ان ٹکڑوں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں اور انہیں ٹکڑوں پر ہمارا گزر بسر ہوتا ہے، میں نے نہایت افسردگی کے ساتھ ساتھ بڑے میاں سے پوچھا کہ بابا آپ کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو آپ کی دیکھ بھال کرتا اور آپ کو کھلاتا پلاتا، اس پر اس نے کہا کہ میرے دو بیٹے تھے دونوں افغان جہاد میں روس کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور میری بھی ساری عمر روس کے خلاف لڑتے ہوئے گزری ہے، میں نے کریدتے ہوئے بڑے میاں سے پوچھا کہ بابا جی احمد شاہ مسعود اور اس کے لوگ تو بڑے مجاہد ہیں تو انہوں نے آپ جیسے قربانی والے مجاہدوں کو ایسی حالت میں بے یار و مددگار کیوں چھوڑا ہوا ہے، بابا نہایت افسردہ ہوئے اور بولے کہ احمد شاہ مسعود اور اس کے ساتھی نہ کل مجاہد تھے اور نہ آج مجاہد ہیں ، اگرچہ روس کے حملہ کے ابتدائی دنوں میں احمد شاہ مسعود حقیقتاً مجاہد تھا لیکن جلد ہی مصلحتوں اور اپنے ذاتی مفادات کا شکار ہو کر روسیوں کے ہاتھوں کھیلنے لگ گیا تھا اگرچہ آج تک جہاد ہی کا لبادہ اوڑھ کر عوام کو ورغلائے ہوئے ہے اور پنجشیر کے جن لوگوں نے حقیقی معنوں میں جہاد کیا تھا اور اسلام اور آزادی کیلئے قربانیاں دی تھیں آج وہ لوگ زبوں حالی کا شکار ہیں اور وہ کوئی حرف شکایت بھی زبان تک نہیں لا سکتے گویا کہ ہم نے روس سے تو آزادی حاصل کر لی لیکن روس نوازوں کی غلامی کا طوق آج بھی ہماری گردنوں میں ہے، اور پورے شمال کی عوام کو یہاں کے اکثر بے دین وار لارڈز نے یرغمال بنایا ہوا ہے۔

بڑے میاں نے جو دردِ دل بیان کیا اس کے بارہ میں، میں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ شمالی اتحاد کے ارد گرد رہنے والا ہر ذی شعور انسان جس کی آنکھوں پر قومیت کے تعصب کا پردہ نہ چڑھا ہوا ہو حق و باطل کے تمام حقائق سے آگاہ ہو چکا ہے لیکن احمد شاہ مسعود اور اس کے حواریوں کی اسلام دشمنی اور مسلمان کشی کی زندہ اور چلتی پھرتی مثال جیل میں ہمارے سامنے اسد اللہ سروری کی صورت میں موجود تھی۔

احمد شاہ مسعود کا چہیتا قیدی

روس کے خلاف افغان جہاد سے گہری دلچسپی رکھنے والا اور اس وقت کے حکومتی ڈھانچوں سے واقفیت رکھنے والا تقریباً ہر آدمی اسد اللہ سروری کے بارے میں جانتا ہے کیونکہ اسد اللہ

افغانستان کے اکثر کیمونسٹ حکمرانوں کا نجیب تک مملکت افغانستان کا نائب صدر رہا ہے، یہ افغانستان میں کنگ میکر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور جوڑ توڑ کا انتہائی ماہر تھا یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی کیمونسٹ حکمران پہلے حکمران کی حکومت گرا کر یا اسے قتل کر کے برسر اقتدار آتا تو اسداللہ سروری ہی اس حکمران کا نائب ہوتا اور اکثر حکومتوں کو گرانے میں اسداللہ سروری ہی کا ہاتھ ہوتا تھا۔

یہ تو حکومتی معاملات تھے جبکہ دوسری طرف یہ افغان مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا یہ چونکہ افغانستان کی خفیہ ایجنسی ''خاد'' کا بھی سربراہ تھا اور ''خاد'' کی ظلم وستم کی داستانیں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اسداللہ سروری بلا مبالغہ ہزاروں علماء کرام اور مجاہدین کا قاتل ہے اور یہ وہی ہے جس نے سینکڑوں مجاہدین کو ہاتھ پاؤں باندھ کر زندہ زمین میں درگور کیا اور یہی وہ خون آشام بھیڑیا ہے جس کے حکم سے افغانستان کی عزت مآب بہنوں کی عزتوں کو پامال کیا جاتا تھا اسی ملعون کی زیرنگرانی اور حکم سے شعائر اسلام کو پاؤں تلے روندا گیا اور اسلام اور اسلامیان افغانستان کو افغانستان سے مٹانے کی بہیمانہ کوشش کی گئی، غرض کہ اسداللہ سروری اسلام دشمنی میں اپنے روسی آقاؤں سے بھی دو ہاتھ آگے تھا اور تاریخ انسانی کا ایک سیاہ ترین باب تھا، لیکن مسلمانوں کا یہ بدترین دشمن ہزاروں مسلمانوں کا قاتل اسلام کی ناموس پر شب خون مارنے والا بھیڑیا اور خون خوار ایجنسی خاد کا سربراہ اگرچہ بظاہر احمد شاہ مسعود کی قید میں تھا لیکن جو شاہی ٹھاٹھ باٹھ احمد شاہ مسعود کی طرف سے اسے مہیا تھا وہ شاید احمد شاہ مسعود کے کسی بڑے سے بڑے آزاد کمانڈر کو بھی حاصل نہ ہوں۔

قصہ مختصر یہ کہ اسداللہ سروری کو احمد شاہ مسعود نے افغانستان کی عوام اور مجاہدین کے قہر و غضب سے بچانے کیلئے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا اور اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جنوب افغانستان کے شیر دل اور غیور جہادی کمانڈر حضرت مولانا جلال الدین حقانی صاحب نے طالبان حکومت سے پہلے کئی مرتبہ احمد شاہ مسعود سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسداللہ سروری کو مجاہدین کے بہیمانہ قتل کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دو یا ہمارے حوالے کردو تاکہ ہم اس کو کیفر کردار تک پہنچا دیں علاوہ ازیں یہی مطالبہ حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار اور دوسرے جہادی

کمانڈروں نے بھی متعدد بار کیا تھا اور پھر جب طالبان کی اسلامی حکومت آئی تو امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد حفظہ اللہ نے بھی کئی بار احمد شاہ مسعود کو یہ پیغام بھیجا کہ اسد اللہ سروری کو قتل کر دو یا ہمارے حوالے کر دو تاکہ عوام الناس کے سامنے اس کو اپنے انجام تک پہنچا دیں لیکن ان سب کے مطالبے صدا بصحرا ثابت ہوئے اور احمد شاہ مسعود اسد اللہ سروری کی حفاظت سے دستبردار نہ ہوا، بلکہ جب طالبان نے کابل، کاپیسا اور پروان فتح کر لیا تو احمد شاہ مسعود نے اسد اللہ کی دیکھ بھال اور حفاظت میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا، پہلے وہ تنہا جیل سے باہر گھومنے پھرنے چلا جاتا تھا لیکن اب وہ باہر جاتا تو اس کی حفاظت کیلئے احمد شاہ مسعود کے خصوصی کمانڈوز اس کے ساتھ جاتے کہ کہیں طالبان کا کوئی گوریلا مجاہد اسے قتل نہ کر دے اور اسی خوف کا سامنا غالباً مسعود کو بھی تھا کیونکہ بقول پہرہ داروں کے کہ آمر صاحب (احمد شاہ مسعود) کے ساتھ آج کل بہت سارے کمانڈوز ہوتے ہیں، حالانکہ پہلے احمد شاہ مسعود تنہا وادی پنجشیر میں پھرتا رہتا تھا۔ بحر کیف مسعود نے مجاہدین کے قاتل کو نہ صرف تحفظ فراہم کیا تھا بلکہ اس کو ہر آسائش پہنچائی ہوئی تھی اور اس کے آرام وسکون کا جیل میں ہر طرح سے خیال رکھا جاتا تھا اور جیل کا پورا عملہ اس کے ہر حکم کو ماننے کا پابند تھا، علاوہ ازیں روس کے مجاہدین کے ہاتھوں پٹ کر اور عظیم شکست سے دوچار ہو کر نکلنے کے بعد احمد شاہ مسعود نے نجیب جیسے آدمی کو جس نے ہزار مردوں ،عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ناقابل بیان اذیتیں دے دے کر شہید کروایا، صبغت اللہ مجددی جو کہ روس کے انخلاء کے بعد مجاہدین کا پہلا عبوری صدر تھا کی زبان سے معافی دینے کا اعلان کروانے میں اہم کردار ادا کیا اور روس کے شکست کھا کر افغانستان سے نکلنے کے بعد احمد شاہ مسعود نے کیمونسٹ جرنیلوں، جنرل بابا جان، جنرل باوا جالندھر، جنرل عبدالرشید دوستم، جنرل آصف دلاور، جنرل عبدالمومن اور جنرل نبی عظیمی وغیرہ کے ساتھ مل کر ایک نئی تنظیم ''شورائے نظار'' کے نام سے بنائی جس کا سربراہ خود احمد شاہ مسعود تھا، علاوہ ازیں شیعہ تنظیم حزب وحدت کو بھی مراعات دے کر اپنی تنظیم شورائے نظار میں شامل کر لیا، حالانکہ متذکرہ بالا تمام کیمونسٹ جرنیل افغانستان میں روس کے پشتی بان اور راہنما تھے اور بلا مبالغہ لاکھوں عوام اور مجاہدین کے قاتل تھے، انہی کیمونسٹوں اور روس کو نکالنے کے لئے مجاہدین نے ۱۴ سال جہاد کیا تھا اور تقریباً

۱۵ لاکھ انسانوں کی قربانی دی پھر کہیں جا کر کیمونزم سے چھٹکارہ حاصل ہوا لیکن احمد شاہ مسعود نے پھر انہیں کیمونسٹوں کو افغان عوام پر مسلط کرنے کی کوشش کی اور تمام مجاہدین کہ جنہوں نے روس کے خلاف افغان جہاد میں بڑی بڑی قربانیاں دیں کو پس پشت ڈال کر انہی کے خلاف کیمونسٹوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ احمد شاہ مسعود کے بارے میں گرفتاری سے پہلے جو گمان تھا نہ صرف سراسر غلط ثابت ہوا بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسعود کے بارے میں ہماری آنکھیں بھی کھول دیں۔

جیل میں چند ایسے پاکستانی ساتھی بھی موجود تھے جو طالبان کے ہاتھوں فتح کابل سے چند روز پہلے طیارہ ہائی جیکنگ کے نتیجے میں گرفتار ہوئے تھے، ان ساتھیوں میں قاری عمر فاروق ، بھائی حافظ محمد اقبال ، غلام رسول، سید مبارک علی شاہ، اور سید محمد علی شاہ جو مبارک علی شاہ کے پوتے تھے، مبارک علی شاہ چونکہ مریض اور سن رسیدہ تھے چنانچہ علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے گرفتاری کے چند ماہ بعد جیل میں وفات پا گئے اور وادی پنجشیر کے علاقہ بہارک میں دفن ہوئے۔ مبارک علی شاہ لکڑی کے تاجر تھے جنہیں قاری عمر فاروق طالبان کا نظام حکومت دکھانے (شاید شاہ صاحب طالبان کے علاقوں میں اپنی تجارت کے مواقع دیکھنے کے بھی خواہاں ہوں) کیلئے لائے تھے چنانچہ یہ پورا گروپ ہرات کا دورہ کرنے کے بعد طالبان کے طیارہ میں قندھار کی طرف گامزن تھا لیکن بدقسمتی سے طیارے کا پائلٹ شمالی اتحاد والوں کے ساتھ ساز باز کر چکا تھا اسی لئے طیارے کو قندھار لے جانے کی بجائے بگرام ائیر پورٹ لے گیا اور طیارے کو سواریوں سمیت شمالی اتحاد والوں کی تحویل میں دے دیا، اس میں طالبان کے چند پائلٹ اور انجینئر بھی سوار تھے چنانچہ ان سب کو بگرام میں قید کر دیا گیا اور بعد ازاں انہیں پنجشیر کی جیل بہارک میں منتقل کر دیا گیا۔

ریڈ کراس اور طالبان وفد کی جیل میں آمد

ہماری گرفتاری کے تین مہینے کے بعد ریڈ کراس والے جیل میں آئے اور جیل کے عملہ سے مل کر قیدیوں کیلئے لایا ہوا سامان جوتے اور کپڑے وغیرہ ان کی تحویل میں دے کر چلے گئے انہوں نے قیدیوں سے ملنا تک گوارہ نہ کیا یا انہیں قیدیوں سے ملنے نہیں دیا گیا، بہرحال جو

سامان وہ قیدیوں کیلئے دے گئے تھے اس میں چند جوڑے پلاسٹک کے جوتوں کے علاوہ قیدیوں کو کچھ بھی نہ ملا، بلکہ سارے سامان کو جیل کے عملے نے آپس میں تقسیم کرلیا۔

استاد حسان حبیب جن کو ہم سے علیحدہ رکھا ہوا تھا کوشش کر کے ہمارے ساتھ ہمارے کمرے میں منتقل ہو گئے تھے، استاد حسان اکثر پریشان رہتے اور ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ تمام ساتھی ان کی غفلت کی وجہ سے گرفتار ہوئے ہیں، اور جو ساتھی اس دوران شہید ہوئے ان کے بارے میں بھی یہی خیال کرتے کہ وہ بھی ان ہی کی غفلت کی وجہ سے شہید ہوئے، حالانکہ ان کی یہ تمام تر سوچ بے بنیاد تھی لیکن اکثر سمجھانے کے باوجود انہوں نے اس سوچ کو ایک روگ بنا لیا تھا اسی وجہ سے ان کی صحت دن بدن انتہائی تیزی سے گر رہی تھی اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے حالانکہ وہ اکثر ساتھیوں کے سامنے ہشاش بشاش رہنے کی کوشش کرتے لیکن روز بروز کمزور ہوتا ہوا ان کا چہرہ اور بدن تو ساتھیوں سے نہیں چھپ سکتا تھا، ساتھی اکثر حسان بھائی کو مصروف رکھنے کیلئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے تھے اور جاوید بھائی اکثر نظمیں اور لطیفے سنا کر ساتھیوں کو اور خاص طور پر حسان بھائی کو خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے، تمام ساتھی جاوید شہید کے مزاحیہ لب ولہجہ سے بہت خوش ہوتے۔

ایک دن مغرب کے بعد قیدیوں کی گنتی کے دوران پہریداروں کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے بعد بیٹھے ہوئے تھے، حسان بھائی حسب معمول سر جھکائے گہری سوچوں میں غرق تھے کہ دفعتاً جاوید بھائی نے استاد حسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، استاد جی! حسان بھائی نے جاوید کی طرف مسکراتے ہوئے کہا کہ جاوید بھائی لگتا ہے کہ آج کوئی نئی بات بتانے جا رہے ہو، اس پر جاوید بھائی نے کہا کہ لاہور میں ہمارا ایک ذمہ دار ابو عبیدہ ہوتا تھا جو بہت زیادہ صفائی پسند اور نفیس آدمی تھا، میں نے اور حامد بھائی نے لاہور دفتر میں اس کے ساتھ کافی وقت گزارا ہے میں سوچ رہا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ یہاں ہوتے تو کیسا لگتا، ہم اس کو تنگ کرتے اور چھیڑتے، یہ سب باتیں جاوید انتہائی مزاحیہ انداز میں کر رہا تھا اور سب ہنس رہے تھے، حسان بھائی نے ہنستے ہوئے کہا کہ ”دوست جو آزاد ہے اسے آزاد ہی رہنے دو کیوں اس کے بھی یہاں ہونے کی آرزو کرتے ہو“ جاوید نے کہا استاد جی میں تو مذاق میں ایسا کہہ گیا، اللہ کسی دشمن کو بھی ایسی

اذیت میں مبتلا نہ کرے جبکہ ابو عبیدہ تو نہایت ہی شفیق اور مہربان ساتھی ہیں۔

ہماری گرفتاری کے پانچ مہینے بعد طالبان کا ایک نمائندہ گروپ جیل میں آیا جسے اگرچہ قیدیوں کے ساتھ ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی لیکن ایک نمائندے کو جیل کی چھت پر چڑھ کر قیدیوں کو ایک نظر دیکھنے کا موقع دے دیا گیا اور جو رقم وہ قیدیوں کے لئے لائے تھے وہ ساری کی ساری قیدیوں کو دینے کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ صرف ۶۰، ۶۰ ہزار افغانی فی کس دینے کی اجازت دی، چنانچہ یہ روپے ملا مجاہد اخوند کے ہاتھ سے سب قیدی ساتھیوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔

طالبان کے نمائندے پیسوں کے علاوہ فی قیدی ایک ایک جوڑا کپڑوں کا بھی لائے تھے جو پیسوں کے ساتھ ہی قیدیوں میں تقسیم کر دیئے گئے، اس طرح ہماری حالت کافی بہتر ہو گئی۔ اسی دوران قیدیوں کے پاس پیسوں کے آنے کی وجہ سے جیل میں ایک پہرے دار نے چھوٹی سی دوکان بھی بنالی جہاں پر صرف چنے، خشک توت، تلخان (خشک توتوں کو پیس کر اور اس میں کچھ آٹا ملا کر بنایا جاتا ہے) دستیاب ہوتا تھا۔

شمالی اتحاد کی عوام میں تبدیلی کے آثار

ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شمالی اتحاد نے طالبان کے خلاف جو منفی پروپیگنڈا کر کے سادہ لوح شمالی عوام کو طالبان کے خلاف بھڑکایا ہوا تھا اب اس پروپیگنڈہ کا اثر آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہو گیا ہے اور شمال کی عوام کو حقیقت حال کافی حد تک سمجھ آنے لگ گئی ہے، واقعہ اس طرح ہے کہ ہمارے چند ساتھیوں کو ایک دن گاؤں کے ہسپتال لے جایا گیا جن میں میں بھی شامل تھا، چنانچہ ہسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹروں نے ہمارا معائنہ کیا اور ملیریا ٹیسٹ کیلئے ساتھیوں کے خون کے نمونے لئے اور آدھا گھنٹہ باہر انتظار کرنے کیلئے کہا تو پہرے داروں نے ہمیں باہر دھوپ میں بٹھا دیا، ہمیں بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دو برقعہ پوش بڑی عمر کی عورتیں ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں اور فارسی زبان میں کچھ پوچھنے لگیں، جس کی ہمیں کوئی سمجھ نہ آئی کیونکہ ابھی تک ہمیں فارسی بولنا نہیں آتی تھی، البتہ پاکستانی کے جملہ سے مجھے علم ہو گیا کہ یہ عورتیں پوچھ رہی ہیں کہ تم پاکستانی ہو، جس کا ہم نے سر ہلا کر

اثبات میں جواب دیا، وہ عورتیں ہمیں انتہائی غلیظ گالیاں دینے لگیں، ایک عورت نے اپنے پاؤں سے جوتا اتارا اور مارنے کیلئے ہماری طرف بڑھنے لگی اور جوتا ہمارے سروں پر برسانا ہی چاہا کہ دفعتاً دو تین نوجوان لڑکیاں جنہوں نے دوپٹوں سے نقاب کیا ہوا تھا آن پہنچیں اور آتے ہی ایک لڑکی نے جوتا بردار خاتون کے ہاتھ سے جوتا چھینا اور دور پھینک دیا، اور لڑکیاں ان بڑی عمر کی عورتوں سے بحث کرنے لگیں، لیکن متذکرہ عورتیں شاید جوتے مارنے کا عہد کر چکی تھیں اس لئے نوجوان لڑکیوں کے روکنے کے باوجود بار بار دونوں عورتیں مارنے کیلئے ہماری طرف بڑھ رہی تھیں لیکن ان لڑکیوں نے ان کو دھکے دے کر ہم سے دور کر دیا اور پھر ہماری طرف لوٹیں اور ہم سے معذرت کرنے لگیں اور بار بار یہ کہہ رہی تھیں کہ آپ ہمارے بھائی ہیں ،بہر حال وہ کچھ دیر ہم سے باتیں کرتی رہیں اور تسلی دیتی رہیں، ان کی زیادہ باتوں کی تو ہمیں سمجھ نہ لگی لیکن جن باتوں کی سمجھ لگی ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہہ رہی تھیں ''طالبان حافظ قرآن ہوتے ہیں انہوں نے اپنے علاقہ میں شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نفاذ کیا ہے، جس سے لوگوں کی عزتیں اور جان و مال محفوظ ہو گیا اور احمد شاہ مسعود کے علاقوں میں یہ سب کچھ نہیں ہے، پہلے ہم بھی طالبان کو ظالم سمجھتی تھیں لیکن ہمارے لوگ طالبان کے علاقوں میں آتے جاتے ہیں جن کی زبانی یہاں کی عوام کو بھی معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ طالبان کے علاقوں میں مکمل امن و امان ہے اور اسلامی قوانین کی بہاریں ان کے علاقوں میں سایہ فگن ہیں'' بعد ازیں یہ لڑکیاں اس دعا کے ساتھ کہ ''اللہ تعالیٰ ہمارے علاقوں میں بھی طالبان کو لے آئے کہ یہاں ظلم وزیادتی بہت بڑھ چکی ہے۔ اور پرنم آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ حق کے آگے جتنی بھی دیواریں کھڑی کر دو، حق کو چھپانے کیلئے جتنے بھی جتن کر لو لیکن حق اپنے آپ کو منوا کر ہی رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم گرفتار ہوئے تھے تو چاریکار سے لے کر درہ پنجشیر کے گاؤں (جہاں ہماری جیل تھی) تک کوئی ایک آنکھ ایسی نہیں تھی جو ہماری حالت زار دیکھ کر نم ہو۔ کوئی ایک زبان ایسی سننے کو نہ ملی جو تسلی کے دو لفظ ہمیں بول سکے، غرض چاریکار سے لے کر پنجشیر تک کیا مرد کیا عورتیں ہم طالبان کو انتہائی نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان علاقوں کا ہر مرد اور

ہر عورت جن سے ہمارا واسطہ پڑا تھا ہماری تکہ بوٹی کرنے کیلئے تیار نظر آتے تھے، لیکن چند ہی مہینوں کے اندر اندر یہ خوش کن تبدیلی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ شمالی اتحاد کے علاقوں میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو قیدیوں پر ہونے والے ظلم و ستم پر روتی ہیں اور ایسے دل رکھنے والے ہیں جو اسلام اور اسلام کے جاں نثاروں کی حمایت میں دھڑکتے ہیں۔

جیل میں جس طرح جاوید (شیر باز) بھائی نظمیں سنا کر اور اپنی مزاحیہ باتوں سے ساتھیوں کا دل بہلاتے رہتے تھے اسی طرح ایک اور ہر دلعزیز ساتھی قاری رحمت اللہ بھی ہمارے ساتھ قید میں موجود تھے وہ بھی اپنے مخصوص انداز میں گپ شپ لگا کر ساتھیوں کو مصروف رکھتے تھے، علاوہ ازیں بھائی رحمت اللہ بیمار ساتھیوں کے لئے اضافی کھانے اور قہوہ وغیرہ بھی جیل کے باورچی خانے سے حاصل کر کے لے آتے تھے چونکہ رحمت بھائی فارسی بہت جلد سیکھ گئے تھے، انہیں صلاحیتوں کے بل بوتے پر وہ اکثر ساتھیوں کے کام آتے رہتے تھے۔

قیدیوں کی احمد شاہ مسعود سے ملاقات

انہی دنوں احمد شاہ مسعود نے چند پاکستانی ساتھیوں کو اپنے پاس بازارک کے علاقے میں طلب کیا جہاں اس کا گھر تھا، جن ساتھیوں کو احمد شاہ مسعود کے پاس لے جایا گیا تھا ان میں بھائی خالد ایرانی، بھائی رحمت اللہ، بھائی عبید اللہ اور دیگر چند ساتھی شامل تھے، احمد شاہ مسعود نے بھی ان ساتھیوں سے وہی سوال کئے جو اب تک جیل کا عملہ کرتا آیا تھا، یعنی آپ لوگ افغانستان کیوں آئے؟ اور ہمارے خلاف کیوں لڑتے ہو؟ وغیرہ جبکہ خالد بھائی سے اس نے خصوصی ملاقات علیحدگی میں کی تھی اس ملاقات کے علاوہ بھی احمد شاہ مسعود نے تنہا خالد بھائی کو کئی مرتبہ اپنے گھر بازارک میں طلب کیا اور ہر دفعہ خالد بھائی سے اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا کہ ''طالبان ہر معرکہ میں کامیاب کس طرح ہو جاتے ہیں'' احمد شاہ مسعود خالد بھائی سے گفتگو کرتے ہوئے اکثر یہ بھی کہتا کہ میرے پاس بہت وسیع جنگی تجربہ موجود ہے اور پوری دنیا میری جنگی قابلیت کو مانتی ہے پھر بھی طالبان کے خلاف ہر معرکہ میں مجھے ہزیمت اٹھانا پڑتی ہے، حالانکہ میرے مدِ مقابل طالبان کے لشکر میں زیادہ تر مدارس کے نوجوان طالب علم ہیں جنہیں کوئی جنگی تجربہ نہیں ہے، اس کی کوئی وجہ مجھے بتاؤ کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟''

ان باتوں کا صاف جواب خالد بھائی کے پاس موجود تھا کہ وہ جس ذات باری کے راستہ میں لڑ رہے ہیں وہی ان کی مددگار ہے اور وہی ذات ان کمزور اور ناتجربہ کاروں مگر اللہ کیلئے مخلص بندوں طالبان کو فتح و کامرانی دیتی ہے، لیکن خالد بھائی کو پتہ تھا کہ "آئینہ اگر دکھایا تو برا مان جاؤ گے" اسی لئے خالد بھائی الٹی سیدھی منطق جھاڑ کر اور الٹے سیدھے جنگی نکتے بیان کر کے طالبان کا رعب احمد شاہ مسعود پر بٹھانے کی کوشش کرتے تھے، مسعود پر خالد بھائی کی منطق سے کوئی رعب پڑا یا نہیں لیکن مسعود کے خالد بھائی کو کئی بار اپنے پاس بلانے سے قیدیوں کو ضرور فائدہ ہو گیا کیونکہ ایک دن جیل کے سپریٹنڈنٹ نے خالد بھائی کو اپنے کمرے میں بلا کر بڑے راز دارانہ انداز سے پوچھا کہ آمر صاحب سے آپ کی کیا باتیں ہوتی ہیں، تو اس پر خالد بھائی نے بھی اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تیار کر لیا چنانچہ سپریٹنڈنٹ کے استفسار پر پہلے تو خالد بھائی نے اسے کہا کہ کچھ خفیہ باتیں ہیں جو وہ مجھ سے دریافت کرتے رہتے ہیں جن کی مجھے آپ کو یا کسی اور کو بتانے کی اجازت نہیں ہے، ان باتوں سے وہ اور متجسس ہو گیا اور خالد بھائی سے کہنے لگا کہ "آمر صاحب ہمارے متعلق تو کوئی پوچھ کچھ نہیں کرتے" اس پر خالد بھائی نے اپنی باتوں میں مزید وزن پیدا کرنے کیلئے کہا کہ "دیکھیں صاحب میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا ہوں کیونکہ میں آمر صاحب کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا" کچھ دیر تو سپریٹنڈنٹ حیران اور پریشان ہو کر خالد بھائی کی طرف دیکھتا رہا اور بعد ازاں خالد کو مخاطب کر کے کہنے لگا "یقیناً آمر صاحب ہمارے متعلق ہی پوچھتے ہوں گے، وگرنہ ان کو ایک قیدی سے کیا مطلب ہو سکتا ہے"۔

سپریٹنڈنٹ جیل بہت متاثر ہوا جس کا خاطر خواہ فائدہ تمام قیدیوں کو پہنچا، کیونکہ اسی دن قیدیوں کی روٹی کا وزن بھی بڑھ گیا، چاولوں کی مقدار بھی زیادہ ہو گئی، مریض ساتھیوں کو غسل کے لئے گرم پانی بھی ملنے لگ گیا، الغرض ساتھیوں کو کچھ ریلیف مل گیا جو اگرچہ تھوڑے ہی عرصہ پر محیط تھا۔ کیونکہ اس واقعہ کے دو تین مہینوں کے بعد نئے قیدیوں کے آنے کے بعد پھر حالات پہلے جیسے ہی ہو گئے تھے۔ (مندرہ بالا تمام خالد بھائی سے متعلقہ باتیں من وعن خالد بھائی کی ہی بیان کردہ ہیں جو انہوں نے بعد میں مجھے بتائی تھیں)۔

شہادت مجھ سے صرف دو انچ کے فاصلے پر تھی

میرے اس سرگزشت لکھنے کا مقصد چونکہ دعوتِ جہاد کو عام کرنا ہے اس لیے کچھ ساتھیوں کے خصوصی واقعات موقع کی مناسبت سے لکھوں گا، ان واقعات میں مجاہد ساتھیوں کے ساتھ اللہ رب العزت کی خصوصی مدد و نصرت کے مشاہدے یقیناً پڑھنے والوں کے جذبہ ایمان کو جلا بخشیں گے اور ان اوقعات سے یہ سبق بھی ملے گا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے، گولیوں اور بارود کی بارش میں موت نہیں ہے بلکہ موت اسی وقت آئے گی جو وقت اس کے لیے لکھا جا چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف یہ نعرہ لگایا کرتے تھے کہ ''موت زندگی کی محافظ ہے''۔

سب سے پہلا واقعہ استاد حسان حبیب کے متعلق ہے جو ان کے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ ''درہ سالنگ کی طرف سے جب پسپائی ہوئی تو ہم سڑک کے راستے کسی محفوظ مقام کی طرف جانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ درہ سالنگ کی تقریباً تمام چوٹیوں پر دشمن نے قبضہ کر لیا تھا، ہم تمام ساتھی بکھر کر جبل السراج کی طرف جا رہے تھے، کہیں کہیں شمالی اتحاد کے فوجیوں کے ساتھ چھوٹی موٹی جھڑپ بھی ہو جاتی تھی لیکن ہم تمام ساتھی شمالی اتحاد کے فوجیوں کی لگائی ہوئی کمینوں سے بچ کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے اور شمالی اتحاد کے فوجی بھی دانستہ ہمارے راستے میں نہیں آ رہے تھے جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ ہمیں اپنی پسند کی کسی جگہ پر گھیر کر زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں جبکہ ہماری یہ کوشش تھی کہ گرفتاری سے بچ کر آگے کی طرف کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں، ایک جگہ پر جب شمالی اتحاد کے فوجیوں نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی تو ہم نے ان کی طرف جوابی فائرنگ شروع کر دی، استاد حسان حبیب سڑک کے کنارے پوزیشن لئے ہوئے کھڑے تھے اور فائرنگ کر رہے تھے، دفعتاً دشمن کی جانب سے ایک راکٹ استاد حسان کی طرف فائر ہوا، ہم نے دیکھا کہ راکٹ کا گولہ استاد کے عین سر پر لگا ہم نے یہی گمان کیا کہ یقیناً وہ شہید ہو چکے ہیں لیکن جب گرد و غبار کچھ کم ہوا تو استاد اٹھ کر دوڑتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے، ہمیں یہ دیکھ کر بہت زیادہ حیرت ہوئی کہ راکٹ کا گولہ لگنے کے بعد یہ کیسے زندہ بچ گئے، اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب ہم نے استاد صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے اور آپ کیسے بچ گئے حالانکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ گولہ عین آپ

کے سر پر لگا ہے، اس پر استاد نے مسکرا کر جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''گولا صرف دو انچ نیچے ہوتا تو یقیناً میری کھوپڑی اڑا دیتا دو انچ اوپر ہونے کی وجہ سے صرف میری پگڑی اڑا کر لے گیا یعنی شہادت مجھ سے صرف دو انچ کے فاصلہ پر تھی۔ اس طرح کی صورتحال میں بڑے سے بڑے دل گردے والے کا بھی خوف سے پتہ پانی ہو جاتا ہے لیکن استاد حسان حبیب بلند و بالا چٹان کی طرح عظمت کا مینار بنے ہمارے سامنے کھڑے تھے اور گزشتہ خطرناک صورت حال کو اس انداز سے ساتھیوں کے سامنے بیان کر رہے تھے جس طرح کسی تفریح کا حال بیان کیا جاتا ہے، استاد کی بلند حوصلگی کو دیکھ کر ہم تمام ساتھیوں کے بھی حوصلے بڑھ گئے۔

یہی وہ چیز ہے جسے نصرت الٰہی کہتے ہیں، جس سے مسلمانوں کا ایمان اپنے خالق پر مزید پختہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی کس کس طرح حفاظت فرماتے ہیں لیکن جب موت کا وقت آن پہنچتا ہے تو استاد حسان جیسا کڑیل جوان جو گولہ بارود کی بارش، آتش و آہن کے مہیب سمندر پار کر کے گرفتار ہو کر جیل میں پہنچ گئے وہی کڑیل جوان دیارِ غیر میں جیل کے اندر بیمار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اور شہادت جیسے عظیم مرتبے پر پہنچ گیا، ''خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را''۔

ایک لمحے کی بھول سات سال کی قید

استاد حسان حبیب کی گرفتاری کے واقعہ کے بعد لگے ہاتھوں کراچی کے رہنے والے بھائی رحمت اللہ کی گرفتاری اور بہارک جیل تک پہنچنے کے واقعات بھی یہاں تحریر کروں گا تا کہ ترتیب کو برقرار رکھا جا سکے، اس کے بعد دوبارہ میں اپنی سرگزشت وہیں سے شروع کروں گا جہاں پر ان واقعات کو شروع کرنے سے پہلے چھوڑا تھا۔

بھائی قاری رحمت اللہ نے مجھے اپنی افغانستان محاذ جنگ پر آمد اور گرفتاری کی داستان سناتے ہوئے بتایا کہ ''میں کراچی میں اپنے مدرسے سے محاذ پر آنے کے لیے جب روانہ ہوا تو میرے ساتھ تقریباً 80 افراد تھے، طالبان کے کراچی دفتر کے ذمہ داروں نے مجھے ان 80 افراد کا ذمہ دار بنا دیا، ہم مسلسل سفر کرتے ہوئے جب کابل پہنچے تو وہاں پر ہماری ملاقات طالبان کے مایہ ناز اور شیر دل کمانڈر مولوی جمعہ خان (شہید) سے ہوگئی ہم نے ان کو کراچی کے طالبان

ذمہ دار کا رقعہ دیا چنانچہ کمانڈر جمعہ خان ہمیں اپنے ساتھ لے کر سیدھے ولایت کا پیسا جا پہنچے جہاں پر پنجشیر پہ حملے کے لیے بھر پور تیاریاں ہو رہی تھیں، کا پیسا پہنچنے کے دوسرے دن میرے تقریباً آدھے ساتھی ٹریننگ حاصل کرنے کی غرض سے واپسی کابل چلے گئے اب میرے ساتھ صرف میرے مدرسے کے ساتھی بقایا رہ گئے تھے، بقایا رہ جانے والے ہم لوگوں کو دوسرے دن کمانڈر جمعہ خان (شہید) نے اسلحہ وغیرہ دیا اور مولوی کمانڈر جمعہ خان کی کمان میں محاذ جنگ پر روانہ ہو گئے۔

کئی دن محاذ جنگ پر گزارنے کے بعد جب ہمارے وفاق کے تحت ہونے والے درجہ رابعہ کے امتحانوں کے دن قریب آ گئے تو ہم نے واپس کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔ کمانڈر جمعہ خان چونکہ یہاں قرارگاہ میں موجود نہیں تھے بلکہ وہ صوبہ کا پیسا ہی کے ایک علاقہ ''لیوا'' میں گئے ہوئے تھے جہاں پر ان کا جنگی مرکز تھا۔ اس لیے صبح سویرے ساتھیوں کے مشورہ سے میں نے کمانڈر جمعہ خان سے واپسی کی اجازت حاصل کرنے کے لیے ''لیوا'' جانے کا فیصلہ کیا اور قرارگاہ سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا، جہاں پر اتفاقاً کمانڈر جمعہ خان کا ایک چھوٹا کمانڈر مولوی یحیٰی اپنی ڈبل کیبن گاڑی میں ''لیوا'' جانے کے لیے تیار کھڑا تھا چنانچہ میں بھی کمانڈر یحیٰی کے تین ساتھیوں کے ساتھ پچھلی سیٹوں پر پھنس کر بیٹھ گیا، ہمارے بیٹھنے کے بعد گاڑی ''لیوا'' کی جانب روانہ ہو گئی، راستہ میں ناشتہ کرنے کی غرض سے کمانڈر یحیٰی نے گاڑی رکوا دی چنانچہ ہم سب گاڑی سے اتر کر اوپر ہوٹل میں چلے گئے۔

ناشتہ کرنے کے بعد جب ہم واپس اپنی گاڑی کے پاس پہنچے تو اسی وقت پیچھے سے طالبان کی ایک جیپ ہمارے قریب آ کر رکی جیپ سے ایک طالب نیچے اترا اور اس نے آکر بتایا کہ ''آگے احتیاط سے جانا کیونکہ راستے میں دشمن نے کمین لگا رکھی ہے، ہم بھی کچھ فاصلہ رکھ کر آپ لوگوں کے پیچھے آ رہے ہیں۔

میں چونکہ اپنی گن قرارگاہ میں چھوڑ آیا تھا اس لیے جیپ والے طالبان ساتھیوں سے میں نے راکٹ لانچر اور ایک راکٹ لے لیا اس بار میں اور کمانڈر یحیٰی کے تین ساتھی گاڑی کی سیٹوں پر بیٹھنے کی بجائے گاڑی کے ڈالے میں بیٹھ گئے تاکہ راستے میں اگر کہیں دشمن سے پالا

پڑ جائے تو آسانی سے مقابلہ کر سکیں۔

ابھی ہم ''لیوا'' کے راستہ میں پڑنے والی ''کوہستان'' نامی جگہ کے قریب ہی پہنچے تھے کہ پانچ چھ مسلح افراد آڑ سے نکل کر ہماری گاڑی پر ٹوٹ پڑے اور اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے جس سے ہماری گاڑی پر بارش کی طرح گولیاں برسنے لگیں۔ ہمارے سروں کے اوپر اور دائیں بائیں سے بھی شائیں شائیں کرتی ہوئی گولیاں گزرنے لگیں، ایک گولی کمانڈر یحییٰ کے ساتھی عبدالنافع کی پگڑی پر آکر لگی اور اس کی پگڑی کو ہوا میں اڑا کر لے گئے جبکہ کئی گولیوں نے ہمارے لباسوں میں بھی سوراخ کر ڈالے تھے اس کے باوجود اللہ رب العزت نے ہم سب ساتھیوں کے جسموں کو اب تک گولیوں سے محفوظ رکھا ہوا تھا۔

گاڑی کے ڈالے سے ہم نے حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، میں نے دور سے حملہ آوروں کی مدد کے لیے آتے ہوئے ایک گروہ پر راکٹ فائر کر ڈالا جس سے دشمن کی پیش قدمی رک گئی اور ہم پر حملہ کرنے والے لوگ بھی تتر بتر ہو کر بھاگ گئے اس دوران پیچھے آنے والے ہمارے طالبان ساتھیوں کی جیپ بھی آن پہنچی۔

جیپ کے ہمارے قریب آجانے اور حملہ آوروں کے بھاگ جانے کے بعد ہم لوگ گاڑی سے نیچے اتر آئے، گاڑی کا اگلہ حصہ گولیاں لگنے سے بالکل تباہ ہو چکا تھا، کمانڈر یحییٰ اور ڈرائیور گولیاں لگنے سے گاڑی کے اندر زخمی پڑے ہوئے تھے، ہم نے جلدی سے دونوں زخمیوں کو گاڑی سے نکالا، میں نے اپنی پگڑی پھاڑ کر دونوں زخمیوں کے زخموں پر باندھ دی اور زخمیوں کو جیپ پر سوار کرا دیا، جیپ میں موجود ایک طالبان کمانڈر نے ہم چاروں کو بھی جیپ میں سوار ہونے کے لیے کہا لیکن میں نے مصلحت کے پیش نظر جیپ میں سوار نہ ہونے کی بہت بڑی غلطی کر ڈالی۔''

یہاں تک اپنی داستان سنانے کے بعد بھائی رحمت اللہ نے انتہائی تاسف بھرے لہجے میں کہا ''اس ایک لمحے یعنی جیپ پر سوار نہ ہونے کے فیصلے نے ہمیں جیل کی کال کوٹھڑیوں میں پہنچا دیا جبکہ جیپ والے ساتھی آسانی سے کابل پہنچ گئے بہر حال جیپ کے روانہ ہونے کے بعد ہم چاروں نے سڑک کو چھوڑ کر کچے اور پہاڑی راستوں سے لیوا کی طرف سفر شروع کر دیا، ہم

تقریباً دوڑتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے، ہمارے راستے میں ایک دو بستیاں بھی آئیں بستیوں کے لوگ عجیب وغریب نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے، لوگوں کی نظروں کو بھانپتے ہوئے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم دشمن کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنستے جا رہے ہیں چنانچہ میں نے اپنا لانچر جو راکٹ نہ ہونے کی وجہ سے میرے کسی کام کا نہیں تھا ناکارہ کر کے جھاڑیوں میں پھینک دیا تا کہ گرفتار ہونے کی صورت میں دشمن کے ہاتھ نہ لگے، دریں اثناء میں نے دیکھا کہ دور سے بہت سے مسلح لوگ ایک خاص ترتیب میں ہماری طرف بڑھ رہے ہیں ان لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر ہم جلدی سے قریب ہی موجود کوچیوں (چرواہوں) کے خیموں میں جا گھسے، کوچیوں نے صورتحال سے آگاہ ہو کر ہمیں ایک خیمے کے اندر چھپا دیا اور ہمارے اوپر پرالی ڈال دی، تھوڑی ہی دیر بعد شمالی اتحاد کے لوگ بھی خیموں کی بستی میں آن پہنچے اور ہمیں خیموں میں تلاش کرنے لگے کیوں کہ وہ لوگ ہمیں خیموں کی اس بستی میں داخل ہوتے دیکھ چکے تھے چنانچہ تھوڑی سی کوشش کے بعد یہ لوگ ہمارے سروں پر آن پہنچے اور آتے ہی انہوں نے ہمیں خیمے سے باہر نکال لیا۔

خیمے سے باہر نکال کر یہ لوگ انتہائی بے دردی کے ساتھ ہمیں زدوکوب کرنے لگے، اسی دوران ہمارے ایک ساتھی سے مخابرہ (وائرلیس سیٹ) اور پسٹل برآمد ہو گیا، وائرلیس اور پسٹل چونکہ کمانڈر کی نشانی ہوتا ہے اس لیے یہ لوگ ہمیں چھوڑ کر جس ساتھی سے یہ چیزیں برآمد ہوئیں تھیں اس پر پل پڑے اور انتہائی ظالمانہ طریقے سے اسے تشدد کا نشانہ بنانے لگے۔

میرے ہاتھ کی انگلی میں ایک قیمتی پتھر کے نگ والی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی جس پر شمالی اتحاد کے ایک فرد کی نظر پڑ گئی اور وہ زبردستی میری انگوٹھی اتارنے کی کوشش کرنے لگا اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں یہ ظالم انگوٹھی حاصل کرنے کے لیے میری انگلی ہی نہ کاٹ ڈالے میں نے خود ہی کوشش کر کے اپنی انگوٹھی اتار کر اس کے حوالہ کر دی۔

انگوٹھی چھن جانے کے بعد میں اپنے پاس موجود پاکستانی دو تین ہزار روپوں کو محفوظ کرنے کے بارے میں سوچنے لگا اور ایک نتیجہ پر پہنچنے کے بعد میں نے شمالی اتحاد کے افراد سے قضائے حاجت کے لیے ایک طرف جانے کی اجازت چاہی، اجازت ملنے پر میں تھوڑی دور جا کر ایک

طرف جھاڑیوں کے قریب بیٹھ گیا، جہاں پر میں نے شلوار کی جیب سے پرس نکال کر اس سے پاکستانی ہزار ہزار والے دو تین نوٹ نکال لیے اور ان نوٹوں کو میں نے ازار بند کے سوراخ میں ڈال کر گرہ لگا دی اور ازار بند کو شلوار کے اندر لٹکا دیا جبکہ پرس کے اندر 25-30 ہزار افغانی رہنے دیے، ایک دومنٹ کے اندر میں اپنے کام سے فارغ ہو کر دوبارہ شمالی اتحاد کے افراد کے پاس جا کھڑا ہوا۔

ہمیں خیموں کی بستی سے کہیں اور لے جانے سے پہلے شمالی اتحاد والوں نے ہماری تلاشی لینا شروع کر دی، تلاشی میں ان لوگوں نے میرا پرس بھی نکال لیا جبکہ میری چھپائی ہوئی رقم محفوظ رہی، بعدازیں یہ لوگ ہمیں یہاں سے کچھ دور ایک ویران سی عمارت میں لے گئے۔

ہمارے ایک ساتھی کو فارسی اچھی طرح بولنی آتی تھی، میں نے چپکے سے اسے سمجھایا کہ وہ شمالی اتحاد کے ان افراد سے سودے بازی کرنے کی کوشش کرے چنانچہ ہمارے اس ساتھی نے شمالی اتحاد کے لوگوں سے محتاط طریقے سے بات کرنی شروع کی، کچھ اصرار کے بعد یہ لوگ ہمیں 5 کروڑ افغانی روپوں کے عوض چھوڑنے پر رضامند ہو گئے، روپوں کے حصول کے لیے شمالی اتحاد کے ان افراد نے ہمارے فارسی بولنے والے ساتھی کو طالبان کے زیر کنٹرول علاقہ تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ طالبان سے مطلوبہ رقم حاصل کر کے لا سکے، شمالی اتحاد کے ان افراد نے ہمیں یقین دلایا کہ جونہی تمہارا یہ ساتھی رقم لے کر پہنچے گا ہم اسی وقت آپ لوگوں کو طالبان کے علاقہ میں چھوڑ آئیں گے، اس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد ان لوگوں میں چند لوگ ہمارے فارسی بولنے والے ساتھی کو ''پکول'' (ایک خاص قسم کی ٹوپی) پہنا کر کسی دوسری جگہ لے گئے تاکہ مناسب موقع پر اسے طالبان کے علاقہ میں پہنچانے کا بندوبست کیا جا سکے لیکن بدقسمتی سے ان لوگوں کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد لال ٹماٹر جیسے چہرے والا ایک پنجشیری کمانڈر اپنے مسلح فوجیوں کے ساتھ دندناتا ہوا اس عمارت میں آ گھسا اور آتے ہی انہوں نے ہم تینوں ساتھیوں کو اپنی تحویل لیتے ہوئے ہمیں گرفتار کرنے والے لوگوں سے پوچھا کہ ''ان کا چوتھا ساتھی کہاں ہے، ہمیں گرفتار کرنے والوں نے پہلے تو ہم تینوں کے علاوہ کسی اور قیدی سے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن جب پنجشیری کمانڈر نے انہیں ڈرایا دھمکایا تو وہ لوگ ہمارے چوتھے ساتھی کو لے آئے۔

پنجشیری کمانڈر نے ہمیں یہاں سے لے جا کر پنجشیر کی بہارک جیل میں بند کر دیا جہاں پر تفتیش میں میں نے اپنے آپ کو افغانی ظاہر کیا، میرے افغانی بنتے ہی یہ لوگ مجھے پنجشیر ہی کے ایک چھوٹے سے درے درہ عبداللہ میں افغانی طالبان قیدیوں کے پاس لے گئے، درہ عبداللہ میں کوئی جیل وغیرہ نہیں تھی، درہ عبداللہ میں ہم قیدیوں کو پہاڑی غاروں میں بند کیا جاتا تھا۔

درہ عبداللہ کی پہاڑی غاروں میں پہنچنے کے کچھ دن بعد پنجشیریوں کو میری اصلیت کے بارے میں پتہ چل گیا کہ میں پاکستانی ہوں چنانچہ یہ لوگ مجھے دوبارہ بہارک جیل میں لے آئے جہاں پر مجھے تفتیش کرنے والے انسان نما درندوں کے حوالہ کر دیا گیا، یہ درندے دو دن تک مجھ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے رہے اور مجھ سے میری اصلیت معلوم کرتے رہے جب میں نے محسوس کیا کہ میں مزید تشدد برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں تو آخر کار میں نے اپنے پاکستانی ہونے کا اقرار کرلیا میرے اقرار کرنے کے بعد ایک تحقیق کرنے والے افسر نے مجھ سے پوچھا کہ ''تم اپنے آپ کو افغانی ظاہر کر کے اور اس پر بضد رہ کر مار کھا کھا کر مرنے کے قریب ہو گئے ہو...... میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم نے کیوں ایسا کیا......؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا چنانچہ میں نے مزید تشدد سے بچنے کے لیے بہانہ گھڑتے ہوئے تحقیق کرنے والے کو بتایا ''میرے اپنے آپ کو افغانی ظاہر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے راستے میں سنا تھا کہ پنجشیری لوگ پاکستانیوں کو دیکھتے ہی قتل کر دیتے ہیں میرے اس جواب پر تحقیق کرنے والا مجھے اپنے فوجیوں سے اٹھوا کر ایک کنٹینر میں لے گیا۔ فوجیوں نے کنٹینر کا دروازہ کھول کر مجھے کنٹینر کے اندر پٹخ دیا کنٹینر کے اندر موجود لوگوں نے مجھے احتیاط کے ساتھ پکڑ کر ایک جگہ پر لٹا دیا بعد ازیں تحقیق کرنے والا افسر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ''کنٹینر میں موجود یہ سب لوگ پاکستانی ہیں ان میں سے ہم نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا بلکہ زندہ سلامت تمہارے سامنے ہیں'' اتنا کہہ کہ یہ لوگ دروازہ بند کر کے واپس چلے گئے اور میں کئی دن تک صحیح طریقہ سے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔''

یہ تھی بھائی رحمت اللہ کی گرفتاری کی داستان کہ وہ کس طرح گرفتار ہو کر پنجشیر میں پہنچے

بھائی رحمت اللہ نے ٹھیک پاکستانیوں اور خصوصاً ہم زخمی پاکستانی قیدیوں کی خستہ حالی دیکھ کر ساتھیوں کی خدمت کرنا شروع کر دی۔ بھائی رحمت اللہ کے شمالی اتحاد والوں کے ہاتھوں سے بچائے ہوئے پیسے یہاں پر بہت کام آئے انہیں پیسوں سے بھائی رحمت اللہ اکثر ہم زخمیوں کو دوائی وغیرہ منگوا دیتا تھا، علاوہ ازیں بھائی رحمت اللہ ہم زخمیوں کے لیے کسی نہ کسی طریقے سے افغانی روٹی اور قہوے وغیرہ کا بھی انتظام کرتا رہتا تھا، چند ہی دنوں کے بعد جیل انتظامیہ نے بھائی رحمت اللہ کو باقاعدہ طور پر ہم پاکستانی قیدیوں کا باشی (ذمہ دار) مقرر کر دیا۔

خالد بھائی کی سپریٹنڈنٹ جیل کے ساتھ خصوصی ملاقات کا احوال پیچھے گزر چکا ہے، اس کے بعد عموماً تمام قیدیوں اور خصوصاً ہم زخمی قیدیوں کی حالت زار کسی حد تک بہتر ہو گئی، ہم زخمی ساتھیوں کو غسل کے لیے گرم پانی مہیا ہو گیا جو گرفتاری سے لے کر آج تک ہم زخمیوں کو نصیب نہیں ہوا تھا کیونکہ پنجشیر کے یخ بستہ اور ٹھٹھرے ہوئے ماحول میں زخمیوں کا برف سے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا تقریباً ناممکن تھا، حالات کی یہ تبدیلی جو اگرچہ معمولی سی تھی لیکن ہمارے لئے یہ تھوڑی سی بہتری بھی غنیمت تھی لیکن یہ تبدیلی بھی زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہی۔

نئے قیدی

مئی ۱۹۹۷ء کی ایک دوپہر کو میں اور خالد بھائی جیل کے احاطے میں پڑے ہوئے ایک کنٹینر کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے، پانی بھرنے والے قیدی ساتھی دریا سے پانی بھر بھر کر لا رہے تھے جبکہ بقایا تمام قیدی بھی خلاف معمول جیل ہی میں موجود تھے اور ان کو بیگار پر نہیں لے جایا گیا تھا کہ دفعتاً جیل کی چھتوں اور برجوں پر کھڑے ہوئے پہریدار گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے لگے اور ایک دوسرے کو مبارک مبارک کہنے لگے جبکہ نیچے بیرکوں میں موجود شمالی اتحاد کے فوجی بھی باہر نکل آئے اور انہوں نے جیل کے احاطے میں پھرنے والے قیدیوں کو انتہائی ذلت آمیز طریقے سے بھیڑ بکریوں کی طرح کمروں میں دھکیلنا شروع کر دیا، حالات کے پیش نظر میں اور خالد بھائی بھی اپنے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے کمروں کی طرف جاتے ہوئے خالد بھائی نے ایک پہریدار کو مخاطب ہو کر پوچھا کہ ''کماندان'' یہ کیسی ہل چل ہے'' (عام پہریدار کو ''کماندان'' کہنا ایک قسم کا مکھن لگانا تھا کیونکہ پہرے دار قیدیوں کے منہ سے اپنے

لیے کمانداں کا لفظ سن کر پھولے نہیں سماتے تھے اور اپنے آپ کو سچ مچ کوئی بڑا کمانڈر سمجھنے لگ جاتے تھے) پہرے دار نے انتہائی متکبرانہ لہجے میں خالد بھائی کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ "آمر صاحب نے کابل فتح کر لیا ہے اور طالبان بھاگ کر قندھار چلے گئے ہیں اور بہت سارے طالبان کو ہم نے گرفتار کر لیا ہے" مزید شیخی بھگارتے ہوئے اس پہرے دار نے کہا کہ عن قریب ہم قندھار سے بھی طالبان کی جڑیں اکھاڑ دیں گے۔اب تم اپنے کمروں میں جاؤ کیونکہ نئے گرفتار شدہ قیدی پہنچنے والے ہیں، پہرے دار کی باتیں جہاں ہم دونوں نے سنیں وہاں دوسرے بہت سارے قیدیوں کے کانوں میں بھی یہ باتیں پہنچ چکی تھیں، کیونکہ متذکرہ پہرے دار تقریر کرنے کے انداز میں ہم سے مخاطب تھا، غالباً اس کا ارادہ بھی یہی تھا کہ یہ باتیں دوسرے قیدی بھی سن لیں۔

خالد بھائی اپنے کمرے میں چلے گئے جبکہ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو میرے دل و دماغ میں اندیشوں اور وسوسوں کی آندھیاں چل رہی تھیں، اگرچہ میرے دماغ میں یہی خیالات گردش کر رہے تھے کہ پہرے دار یقیناً جھوٹ بول رہے ہیں لیکن پھر بھی ان کی باتوں نے تقریباً تمام قیدیوں کے دلوں کو اندیشوں سے بھر دیا، فی الحال ہمارے پاس ان خبروں کی تصدیق یا تکذیب کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

شام کے قریب جب نئے گرفتار شدہ طالبان قیدیوں کو بہارک جیل میں لایا گیا تو ایک بار پھر جیل کے در و دیوار مظلوم قیدیوں پر ظلم و ستم کے نتیجہ میں قیدیوں کی آہ و بقا اور چیخ و پکار سے گونج اٹھے، شمالی اتحاد کے خونخوار درندوں کو ایک بار پھر اپنی درندگی کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا، جس سے وہ پورا پورا لطف اٹھا رہے تھے اور قیدیوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے، گویا کہ ان کی شقاوت قلبی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔شام سے لے کر اگلی صبح تک نو گرفتار شدہ قیدیوں پر تشدد کا سلسلہ بغیر کسی وقفہ کے جاری رہا اور پوری رات قیدی ساتھیوں کی چیخ و پکار دلوں کو دہلاتی اور آنکھوں کو رلاتی رہی، پرانے ساتھی ساری رات نئے ساتھیوں کی خلاصی کے لیے دعا گو رہے۔

ظلم وستم میں ڈوبی ہوئی اس اندھیری رات کی صبح ہم پرانے قیدیوں کے لیے بھی ایک

تکلیف دہ تبدیلی لے کر طلوع ہوئی یعنی صبح ہوتے ہی جیل میں فوجی ٹرک آ گئے اور اکثر پرانے قیدیوں کو دوسری نا معلوم جگہوں کی طرف روانہ کر دیا گیا، اب جیل میں پرانے ساتھیوں میں سے ہم زخمی ساتھی، کچھ بیمار ساتھی اور چند صحت مند ساتھی بقایا رہ گئے تھے اور باقی رہ جانے والے ساتھیوں کو بھی کمرے سے ایک کنٹینر میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جہاں نئے آنے والے ساتھیوں کی زبانی ہمیں صبح یہ حوصلہ افزا خبر مل گئی کہ طالبان نہ صرف اپنے ٹھکانوں پر مضبوطی کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں بلکہ طالبان نے شمالی اتحاد کے بہت سارے علاقے بھی فتح کر لیے ہیں، وہیں پر ہمیں پرانے ساتھیوں کے بارے میں بھی تشویش لاحق تھی، جنہیں کہیں اور لے جایا گیا تھا، کیونکہ جس دشمن کے ہاتھوں ہم قید تھے اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا کیونکہ ان کے ہاں کوئی آئین و قانون تھا اور نہ ہی کوئی انسانی قدروں کا لحاظ ان کے ہاں تھا، بے بس قیدی ایک مکھی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ جس کی ادنیٰ سی مثال ایک افغانی طالب ساتھی جمعہ خان اور ایک پاگل فارسی بان کی شکل میں ہمارے سامنے موجود تھی، ویسے تو اور بھی بہت ساری مثالیں موجود ہیں جن کا اب تک ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے اور جن کو اگر لکھنے بیٹھیں تو ایک مکمل کتاب بن جائے۔

جمعہ خان کی مظلومانہ شہادت

جمعہ خان ایک افغانی طالب تھا جو قیدی ساتھیوں میں ہر دلعزیز تھا جس کا ایک بازو افغان جہاد میں شہید ہو گیا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے راکٹ چلانے کا بہت ماہر تھا اور ہمارے ساتھ ہی گرفتار ہوا تھا، جمعہ خان اکثر ساتھیوں کو خوش کرنے کے لیے طالبان کی خبریں اپنے پاس سے ہی سناتا رہتا تھا (کئی دفعہ تو وہ پہرے داروں کے ریڈیو سے خبریں سن بھی لیتا) اسی طرح اس نے ایک مرتبہ ساتھیوں میں یہ خبر چلا دی کہ طالبان نے صوبہ کاپیسا اور صوبہ پروان دوبارہ فتح کر لیا ہے اور پنجشیر کی طرف ان کی پیش قدمی جاری ہے، جمعہ خان کی یہ خبر کسی طرح جیل حکام کے پاس پہنچ گئی تو انہوں نے جمعہ خان سے تفتیش شروع کر دی اور تفتیش کے نام پر کئی دن اس معذور ساتھی کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی رہیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شمالی اتحاد کے گرو طالبان کے ہاتھوں اپنی شکست کا بدلہ اس معذور سے لے رہے ہوں۔ اب اتنی درندگی

اور ظلم کے بعد بھی ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا تو ایک رات جیل کا بڑا عملہ جمعہ خان کو جیل کے پیچھے والے پہاڑ کے اوپر لے گیا جہاں پر اس کو گولیوں سے چھلنی کر کے شہید کر دیا گیا۔

جمعہ خان شہید کا جرم صرف اتنا تھا کہ اس نے کسی طرح سنتریوں کے ریڈیو سے حقیقت پر مبنی خبر سن کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے سنائی تھی اور اس چھوٹی سی بات کی پاداش میں کئی دن دردناک عذاب جیسی اذیتوں سے گزار کر آخر کار شہید کر دیا۔

پاگل قیدی کی دہائی اور شمالی فوجیوں کی بے حسی

دوسری مثال اس نیم پاگل شخص کی داستان ہے جسے شمالی اتحاد والے بہارک جیل کے آس پاس سے پکڑ کر لائے تھے، اس پر طالبان کا جاسوس ہونے کی فرد جرم عائد تھی، حالانکہ یہ نیم پاگل ان کا ہم زبان اور پنجشیر ہی کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا، اس شخص پر بھی شمالی اتحاد والوں نے کئی دن تک تشدد کیا اور آخر کار تھک ہار کر اس نیم پاگل شخص کو پہریداروں نے اٹھا کر جیل سے باہر پھینک دیا، رات کے وقت جب برفباری شروع ہوئی تو متذکرہ شخص جیل کے گیٹ پر آ کر شور کرنے لگا کہ مجھے اندر آنے دو، مجھے بہت سردی لگ رہی ہے اور میں بھوکا ہوں، اس فریاد کے جواب میں پہریداروں نے اسے پتھر مار مار کر بھگا دیا لیکن اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں، آخر میں جو اس کی آواز آئی وہ یہ تھی "اگر اندر نہیں آنے دیتے تو ایک روٹی ہی دے دو، میں بھوک سے مر جاؤں گا تمہیں خدا کا واسطہ" اس کے جواب میں انہوں نے اس کو گالیاں نکالیں اور کہا مرتا ہے تو مر ہمارا دماغ نہ چاٹ، دو دن تک اس مظلوم کی صدائیں بلند ہوتی رہیں لیکن جیل کے عملہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اثر ہوتا بھی کیسے...... اثر تو انسانوں پر ہوتا ہے مگر وہاں تو انسان موجود ہی نہیں تھے کہ جن کے دل ایک بے بس مظلوم کی فریاد پر پگھلتے، یہاں تو انسانوں کے روپ میں خونخوار بھیڑیے اور سنگ دل درندے تھے جن پر ایسی فریادوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، بہرحال تیسرے دن جب قیدیوں کو صبح کے وضو کے لیے دریا پر لے جایا گیا تو قیدی ساتھیوں نے دیکھا کہ اس نیم پاگل شخص کی اکڑی ہوئی لاش دریا کے کنارے پڑی ہوئی تھی۔

ابوعبیدہ

گزشتہ اوراق میں جو دو واقعات تحریر کیے تھے ایسے کئی دوسرے واقعات چونکہ ہمارے ذہنوں میں تھے اور ہمارے مشاہدے سے گزر چکے تھے اس لئے ہم نامعلوم مقام کی طرف لے جائے گئے ساتھیوں کے بارے میں فکرمند تھے کہ نامعلوم شمالی اتحاد والے جو ہمارے ساتھیوں کو لے کر گئے ہیں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، ہم یہاں پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں کے دلوں سے بے ساختہ دعائیں نکلتی تھیں کہ یا الٰہی ہمارے ساتھیوں کی حفاظت فرما۔ ہمیں کنٹینر میں منتقل ہوئے تیسرا دن تھا، ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد جاوید بھائی بیت الخلاء کی طرف گئے اور جب واپس آئے تو آتے ہی انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "حامد بھائی باہر ایک نیا قیدی آیا ہے جسے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کیا گیا ہے، میں صحیح طرح تو نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ابوعبیدہ ہے" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا کہ جاوید بھائی آپ کیوں ابوعبیدہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، حامد بھائی آپ خود بیت الخلاء جانے کے بہانے دیکھ لیں مجھے پکا یقین ہے کہ وہ ابوعبیدہ ہے، جاوید بھائی نے زور دیتے ہوئے کہا، میرا متجسس ہونا ایک فطری بات تھی چنانچہ میں نے بھائی عبیداللہ سے کہا کہ مجھے آپ باہر لے چلیں، بھائی عبیداللہ نے مجھے اٹھایا اور ہم بیت الخلاء کی طرف چل پڑے، جاتے ہوئے تو میں نہ دیکھ سکا البتہ واپسی پر میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی وہ ابوعبیدہ ہی ہے جو دیوار کی طرف منہ کئے کھڑا ہے، ہم جب کنٹینر کے پاس پہنچے تو وہاں پر مدیر تحقیق مل گیا اس نے ہمیں روکتے ہوئے کہا کہ تمہارا ایک اور پاکستانی آج ہم لائے ہیں ذرا اس کی طرف دیکھو اور بتاؤ کہ تم اسے پہچانتے ہو؟ میں نے اچھی طرح ابوعبیدہ کی طرف دیکھا اور مدیر تحقیق کو جواب دیا کہ میں اسے نہیں جانتا، میں نے یہ انکار اس لئے کیا کہ ہماری جان پہچان کو جواز بنا کر مدیر تحقیق کوئی نیا بکھیڑا نہ کھڑا کر دے، اور ابوعبیدہ کیلئے کوئی نیا مسئلہ نہ بن جائے۔

☆☆☆☆

تیسرا حصہ:

ملاسپا دریائی جزیرہ

مدیر تحقیق یہ پوچھ کر اپنے دفتر کی طرف چلا گیا جبکہ میں اور عبیداللہ کنٹینر میں واپس آ گئے اور میں نے آتے ہی جاوید بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ قیدی واقعی ابو عبیدہ ہے، جاوید نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ہم خوامخواہ ابو عبیدہ کو روزانہ یاد کرتے تھے ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کنٹینر کے ماحول پر ایک افسردگی سی چھا گئی اور بالکل خاموشی ہو گئی، اس خاموشی کو استاد حسان حبیب نے توڑا، استاد نے جاوید کو مخاطب کر کے مذاق کرنے والے انداز میں کہا ''جاوید بھائی! پریشان کیوں ہوتے ہو......؟ اور ڈرتے کیوں ہو......؟ آنے والے تمہارا دوست ہے......کوئی ڈریکولا تو نہیں۔'' حسان حبیب اگرچہ اس وقت بہت زیادہ بیمار تھے اور کافی زیادہ نحیف بھی ہو چکے تھے لیکن اس حالت میں بھی ساتھیوں کی دلجوئی کر رہے تھے۔

وزیرستان (صوبہ پختونخواہ پاکستان) کے رہنے والے ایک کمسن قیدی ساتھی مرزا عالم کے جسم کی تمام جلد بے پناہ تشدد کی وجہ سے مکمل طور پر خراب ہو چکی تھی اور وہ انتہائی اذیت میں مبتلا تھا، ان بیمار ساتھیوں کے علاج معالجہ کی جیل میں کوئی سہولت موجود نہیں تھی، جیل کے عملہ کو تو ان اذیت میں مبتلا قیدیوں کی کیا فکر ہوتی، ریڈ کراس جو دنیا میں ایسے کاموں کی ٹھیکیدار بنی ہوئی ہے اس نے بھی ان قریب المرگ قیدیوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ ہی ایسے جاں بلب مریضوں کے لیے علاج معالجہ کی کوئی خاطر خواہ سہولت مہیا کی حالانکہ بین الاقوامی قوانین کی رو سے ریڈ کراس جنگی قیدیوں کی دیکھ بھال اور ان کے علاج معالجہ کی پابند ہوتی ہے، اگرچہ ریڈ کراس والے ہم قیدیوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے ضرور تھے لیکن صرف خانہ پری اور کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لیے۔''اب تک کا مشاہدہ تو یہی بتاتا تھا۔''

سانپوں کی آماجگاہ......قیدیوں کا مسکن

ابو عبیدہ کے بہارک جیل میں پہنچنے کے دوسرے دن ہم پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں اور نئے گرفتار شدہ ساتھیوں کو بھی ٹرکوں میں بٹھا کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیا گیا اور

آخر کار پنجشیر ہی کے ایک گاؤں ''ملاسپا'' میں ہمیں پہنچا دیا گیا اور ایک پہاڑی ٹیکری کے اوپر بنی ہوئی عمارت کے ایک کمرے میں ہمیں لے جا کر بند کر دیا گیا، یہ کمرہ گندگی کا ایک ڈھیر تھا، ہم قیدیوں سے پہلے غالباً یہ کمرہ بھیڑ بکریوں اور گدھوں وغیرہ کے استعمال میں تھا، بہر حال ساتھیوں نے جتنا ہو سکتا تھا صفائی کی اور جگہ برابر کر دی۔

اگلے دن جن پاکستانی ساتھیوں کو ہم سے جدا کر دیا گیا تھا ان سب کو بھی یہاں ''ملاسپا'' میں ہمارے ساتھ منتقل کر دیا گیا، جن کو دیکھ کر ہم بہت زیادہ خوش ہوئے، کئی دن تک اسی کمرے میں ہم کو رکھا گیا، ان دنوں نئے گرفتار شدہ ساتھیوں کی تحقیق ہوتی رہی، اور اس دوران جیل کے در و دیوار تحقیق کے مرحلے سے گزرنے والے ساتھیوں کی آہ و بقا اور چیخ و پکار سے گونجتے رہے، تحقیق کا دورانیہ ختم ہوا تو تمام ساتھیوں کو اس متعفن کمرے سے نجات مل گئی کیونکہ تحقیق ختم ہونے کے بعد ہم قیدیوں کو جیل کے صدر دروازے کے بالکل سامنے صحن کے آخری سرے اور عمارت کی اختتامی دیوار کے ساتھ ایک بڑے سے چبوترے پر رہنے کی اجازت دے دی گئی، جس سے ہمیں قدرے سکون میسر آیا، البتہ یہ ساری عمارت خطرناک بچھوؤں اور سانپوں کی آماجگاہ تھی، ہمارے بستروں میں اکثر بچھو پھرتے رہتے تھے، اور کئی دفعہ بڑے بڑے سانپ دیواروں سے ہمارے اوپر آ گرتے تھے، لیکن الحمدللہ کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی ساتھی کو بچھو یا سانپ نے ڈسا ہو، جبکہ ''ملاسپا'' میں ہمارے تین مہینے کے دوران پہرے داروں کو کئی دفعہ بچھوؤں کے کاٹنے کے واقعات پیش آئے، حالانکہ پہرے داروں کے پاس صاف ستھرے بستر اور رہنے کیلئے صاف جگہ تھی۔

جیل کی جس عمارت میں ہمیں رکھا ہوا تھا اس کی ساخت کچھ یوں تھی، یہ عمارت سڑک کے بالکل ساتھ تقریباً بیس پچیس فٹ بلند پہاڑی ٹیلے کے اوپر بنی ہوئی تھی اور اوپر چڑھنے کیلئے ٹیلے ہی کو تراش کر سیڑھیاں بنائی ہوئی تھیں، جن کے اختتام پر ایک چھوٹا سا میدان بنا ہوا تھا، جس کے ابتدائی کونے پر عمارت کا صدر دروازہ تھا، دروازے میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف ایک کمرہ تھا جس میں ابتدائی دنوں میں ہمیں رکھا گیا تھا، جبکہ بائیں طرف دو کمرے تھے جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے تھے، دائیں بائیں دونوں طرف کے کمروں ۔ ک ۔۔۔ ''

چھوٹا سا صحن تھا جس کے اختتام پر ایک بڑا سا چبوترہ بنا ہوا تھا، جو کہ اکثر قیدی ساتھیوں کی جائے قیام تھی، جبکہ کچھ ساتھی جن میں بھائی شوکت اور کچھ سواتی ساتھی تھے بائیں ہاتھ ایک کمرے میں تھے جو دراصل سیڑھیوں کی طرف جانے والی ایک گزرگاہ تھی، جبکہ اس عمارت کے بالکل سامنے یعنی سڑک کی دوسری جانب چند فٹ کی گہرائی پر دریائے پنجشیر بہہ رہا تھا، سڑک کے ساتھ والے کنارے پر شہتوت کے بہت سارے درخت لگے ہوئے تھے یہیں پر سڑک کے ساتھ والے کنارے پر ایک ٹینک کھڑا ہوا تھا جو روس کی باقیات میں سے تھا اور یہ روس دور کے مجاہدین کا شکار کیا ہوا تھا۔

اس جیل کا سارا عملہ ہمارے لئے نیا تھا، لیکن جسے جیل کا سربراہ بنا کر یہاں بھیجا گیا تھا وہ بہارک جیل کا مدیر تحقیق تھا جس نے میری تحقیق کی تھی، اس کا نام عبدالقیوم تھا، یہ یہاں بہت بڑا دانش ور بنا ہوا تھا، جس کا اظہار وہ اکثر اپنی زبان سے بھی کرتا رہتا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ ”پنجشیر میں ایک آمر صاحب یعنی احمد شاہ مسعود عقل مند اور دانشور ہیں اور دوسرا میں ہوں“ وہ اپنی ”دانش مندی“ کا عملی اظہار بھی وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا، یعنی جب کبھی ہیلی کاپٹر جیل کے اوپر سے گزرتا تو یہ ہاتھ ہلا ہلا کر احمد شاہ مسعود سے علیک سلیک کرنا شروع کر دیتا، اور پھر قیدیوں سے مخاطب ہو کر شیخی بھگارتے ہوئے کہتا کہ آمر صاحب جا رہے تھے جو یہاں سے گزرتے ہوئے میری ہی طرف متوجہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہمارے یہاں منتقل ہونے کے ابتدائی دنوں میں ہم قیدیوں کو جمع کر کے تقریر شروع کر دیتا اور اوٹ پٹانگ اور بے سروپا باتیں شروع کر دیتا جن کا لب لباب ہمیشہ یہ ہوتا کہ ”پنجشیری قوم دنیا کی بہادر ترین قوم ہے اور جو عقل پنجشیریوں میں ہے خصوصاً آمر صاحب میں اور مجھ میں وہ دنیا کے کسی انسان میں نہیں ہے“ اسی طرح کی اور کافی باتیں اور طالبان کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا قصہ مختصر یہ کہ انتہائی احمقانہ اور من گھڑت باتوں سے یہ قیدیوں کی ذہن سازی کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

جہاں ایک طرف ہماری ذہن سازی کی کوشش کی جا رہی تھی وہیں پر دوسری طرف حالت یہ تھی ہم قیدیوں کو کئی کئی دن تک کھانا نہیں دیا جاتا تھا اور جب کبھی ملتا تو اس طرح کہ ایک ایک

روٹی سات سات قیدیوں کے لئے دی جاتی اور پہرہ داروں کا رویہ بھی قیدیوں کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز ہوتا تھا، انہیں پہرہ داروں میں دو پہرے داروں کا رویہ ہمارے ساتھ سب سے زیادہ توہین آمیز تھا یہ دونوں جب بھی جیل میں داخل ہوتے اپنے منہ اور ناک لپیٹ کر آتے اور قیدیوں کو بلا اشتعال انتہائی غلیظ گالیاں بکتے رہتے تھے، یہاں تک کہ یہ دونوں قیدیوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے، ان میں سے ایک کو تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے ہی عبرت کا نشان بنا دیا، واقعہ اس طرح ہوا کہ اس پہرہ دار کا دائیاں بازو کسی چیز سے جل گیا جس کا وہ کئی دن تک علاج کرواتا رہا لیکن جلا ہوا بازو ٹھیک ہونے کی بجائے خراب ہو رہا تھا، اسے کسی نے مشورہ دیا کہ جن لوگوں کے جسم میں بارود کے اثرات ہوں یعنی جو گولیوں اور بموں وغیرہ سے زخمی ہوئے ہوں ان کا تھوک بازو کے زخم پر لگاؤ تو بہت جلدی ٹھیک ہو جائے گا، چنانچہ پہرے دار جو انتہائی متکبر تھا اللہ تعالیٰ نے اس کا غرور ایسا خاک میں ملایا کہ وہ کئی روز تک مسلسل روزانہ کئی کئی مرتبہ ہم زخمی قیدوں کے پاس آتا تھا اور اپنا صحیح ہاتھ ہمارے آگے کرتا کہ اس پر تھوک ڈالو اور وہ ہم زخمیوں کا تھوک لے کر اپنے زخم پر ملتا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا عجیب بات یہ ہوئی کہ جس دن وہ تھوک لے کر زخم پر نہیں لگاتا تھا تو زخم بگڑ جاتا تھا جبکہ ہم زخمیوں کا تھوک لگنے سے زخم ٹھیک ہو جاتا تھا اس لئے جب تک اس کا زخم ٹھیک نہیں ہو گیا وہ اسی طرح ہم سے تھوک کی بھیک مانگتا رہا، گویا اس کی حالت زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی......

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پنجشیری لڑکی کے ایمانی جذبات

قید و بند کی اس داستان میں میں اپنے ساتھ پیش آنے والے ایک اور واقعہ کو لکھنا ضروری سمجھتا ہوں اگر چہ ظاہراً یہ واقعہ کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے لیکن اس واقعہ کو لکھنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ نظام شریعت اسلامی کے نفاذ کی جو تحریک حضرت امیر المومنین اور ان کے ساتھیوں نے شروع کی تھی اس کے اثرات ہر قسم کے منفی پروپیگنڈے، طرح طرح کی رکاوٹوں اور تمام باطل قوتوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود کہاں کہاں تک جا پہنچے تھے۔

واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ میں قضائے حاجت کیلئے دریا کے کنارے پر جایا کرتا تھا اور

یہاں کھڑے متروک اور خراب ٹینک کو بطور بیت الخلاء استعمال کرتا تھا چونکہ جیل کا بیت الخلاء ایک چھوٹی سی چھت پر بنا ہوا تھا جس پر جانے کیلئے لکڑی کی سیڑھی لگی ہوئی تھی اور میں اس سیڑھی پر ایک ٹانگ کے ساتھ نہیں چڑھ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ پہرہ داروں کی اجازت سے ایک ساتھی مجھے ہر روز دریا کے کنارے کھڑے ٹینک میں داخل کر کے واپس اوپر چلا جاتا تھا اور کچھ دیر بعد آ کر لے جاتا تھا، میں اکثر فارغ ہو کر ٹینک کے باہر نکل کر دریا کے کنارے بیٹھ جاتا تھا اور درختوں سے گرے ہوئے توت اٹھا اٹھا کر دریا کے پانی سے دھو کر کھاتا تھا اسی طرح ایک دن میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ کوئی توت گرے اور میں اٹھا کر کھاؤں، یہ دن چونکہ بھوک کے دن تھے کھانا بھی کبھی کبھار ملتا تھا اور وہ بھی چند نوالے بہر حال میں روزانہ کی طرح بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ فاصلہ سے سڑک پر ایک نوجوان لڑکی اور ایک برقعہ پوش خاتون آتی ہوئی نظر آئیں، خاتون نے بڑا سا ٹوکرا سر پر اٹھایا ہوا تھا، جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگیں تو مجھے دیکھ کر رک گئیں اور آپس میں کچھ باتیں کرنے لگیں، ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ مجھے دیکھ کر کیوں کھڑی ہوگئی ہیں وہ سڑک سے نیچے اتر کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں اور لڑکی جس نے کمانڈو جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور نقاب وغیرہ نہیں کیا ہوا تھا مجھ سے مخاطب ہو کر بولی ''بندی استی'' یعنی قیدی ہو (مجھے چونکہ اب فارسی کافی حد تک بولنی اور سمجھنی آ گئی تھی) میں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا ''ہاں'' پھر اس نے کہا کہ پاکستانی ہو؟ میں نے پھر ہاں میں جواب دیا، پھر اس نے پوچھا کیا آپ بھوکے ہو، توت کھاؤ گے؟ میں اس کے جواب میں صرف اثبات میں سر ہلا سکا تو لڑکی نے عورت کے سر سے ٹوکرا نیچے اتروایا اور توتوں کا ایک کاسہ بھر کر کہا یہ لو، تو میں نے اپنا دامن پھیلاتے ہوئے کہا کہ اس میں ڈال دو، اس پر لڑکی نے کہا کہ تمہارے کپڑے خراب ہو جائیں گے، میں نے کہا کوئی حرج نہیں آپ ڈال دیں اس پر لڑکی نے توتوں سے بھرا ہوا کاسہ میری جھولی میں انڈیل دیا تو میں اپنا دامن اکٹھا کر کے بیٹھ گیا اور ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ کھڑی رہیں اور پھر لڑکی نے کہا کھاؤ...... کیوں نہیں کھاتے؟ لیکن میں پھر ویسے ہی بیٹھا رہا اس پر لڑکی نے میری جھولی سے کچھ توت اٹھائے اور کھانے لگی اور پھر کہا دیکھو میں کھا رہی ہوں ان میں زہر نہیں ملا ہوا میں کچھ شرمندہ سا

ہو گیا، حالانکہ میرے ذہن میں دور دور تک ایسی کوئی بات نہ تھی۔

اور پھر بھوک کی شدت میں، ایسی باتیں سوچی بھی نہیں جاسکتی تھیں، میرا ارادہ تو صرف یہ تھا کہ یہ چلی جائیں تو میں کسی ساتھی کو آواز دوں اور اوپر جا کر دوسرے ساتھیوں کو بھی اس دعوت میں شامل کروں، لیکن اس لڑکی نے عجیب بات کہہ دی تو میں تھوڑے توت کھانے لگا، پھر میں نے لڑکی کو کہا کہ دراصل میں یہ توت اوپر اپنے ساتھیوں کے پاس لے کر جانا چاہتا ہوں تاکہ میرے سب ساتھی ان میں سے کچھ کچھ کھالیں، کیونکہ سب ہی بھوکے ہیں، میری اس بات کے جواب میں لڑکی اور برقعہ پوش خاتون نے جو گفتگو کی وہی دراصل واقعہ کا لب لباب اور نچوڑ ہے اور یہی باتیں نقل کرنے کیلئے یہ پورا واقعہ تحریر کرنا پڑا۔

لڑکی کہہ رہی تھی کہ ہمیں پتہ ہے کہ یہاں جنگی قیدیوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے، قیدیوں کو بھوکا رکھ کر ان سے مشقت لی جاتی ہے، لیکن حالات بدل رہے ہیں طالبان کے خلاف جو منفی پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے اور کیا جا رہا ہے اب اس کا پول کھلتا جا رہا ہے، لڑکی نے مزید کہا کہ اگرچہ میرا باپ احمد شاہ مسعود کے کمانڈروں میں سے ہے لیکن حقیقت سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں، روشنی کو اندھیروں میں قید نہیں کیا جاسکتا، ہمارے لوگ روس، انڈیا اور ایران کے کندھوں پر سوار ہو کر طالبان کے نافذ کردہ اسلامی نظام کی دھجیاں بکھیرنا چاہتے ہیں، اسلام کے مقابلہ میں باطل کا نظام چاہتے ہیں، ہمارے بڑے پکے ہوئے پھل کی طرح باطل کی جھولی میں گر چکے ہیں اور جن کیمونسٹوں کے خلاف مسلمانوں نے لاکھوں جانیں قربان کیں آج وہی کیمونسٹ نام نہاد مجاہدوں کے سر کا تاج بنے ہوئے ہیں، لڑکی نے رندھی ہوئی آواز میں مزید بات کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے بڑے اندھیروں کے راہی ہیں، جو اپنے اقتدار کیلئے روشنی سے منہ موڑ کر کفر کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور اسلام کے نام پر اسلام کشی کی تحریک برپا کئے ہوئے اس چیز سے بے خبر ہیں کہ آج وہ روشنی جو موجودہ دور میں قندھار سے اٹھی تھی ان گھروں تک پہنچ چکی ہے اور حق تو اپنے آپ کو منوا کر رہتا ہے۔"

بعد ازیں لڑکی اور برقعہ پوش خاتون نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ اور آپ کے ساتھی حوصلہ نہ ہاریں، خندہ پیشانی سے ان مصائب کو برداشت کریں اور یاد اللہ سے اپنے

دلوں کو مہکائیں، جہاں آپ کے ماں باپ اور عزیز و اقارب آپ کے لئے دعائیں کرتے ہونگے وہیں پر آپ کے دشمن کے گھر یعنی پنجشیر میں بھی اب بہت سی زبانیں طالبان قیدیوں کیلئے اور تحریک طالبان کے لئے دعا گو رہتی ہیں بعدازیں اس لڑکی نے کہا کہ آپ کے دھونے والے کپڑے ہوں تو مجھے لادو میں دھو کر لادوں گی بلکہ میں روزانہ یہاں سے اپنی والدہ کے ساتھ گزرتی ہوں تو آپ روزانہ یہاں ہمیں ملا کریں اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے کپڑے لا دیا کریں جنہیں ہم اگلے دن دھو کر آپ تک پہنچا دیا کریں گے، اس کے علاوہ اور بھی کوئی کام ہو جو ہمارے اختیار میں ہو تو بلا جھجک بتا دیا کریں، ہمیں آپ قیدی بھائیوں کا کام کر کے دلی مسرت ہوگی۔

یہ باتیں کر کے لڑکی اور اس کی والدہ رخصت ہوگئیں اور جاتے جاتے پھر یہ کہہ گئیں کہ کل اسی وقت اپنے دھونے والے کپڑے لا کر رکھنا، اور ہم کل آپ کے لیے اور توت بھی لائیں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جب وہ چلی گئیں تو میں نے آواز دے کر عبیداللہ سندھی کو بلایا جو مجھے سہارا دے کر اوپر لے گیا، میں نے جب یہ باتیں اپنے قریبی ساتھیوں کو بتائیں تو سب بہت خوش ہوئے کہ احمد شاہ مسعود نے جہاں طالبان کا نام تک زبان پر لانے کی پابندی لگا رکھی ہے وہیں پر طالبان کے ہمدرد بھی موجود ہیں۔

ساتھیوں کے مشورہ سے میں نے دریا پر جانے کا وقت تبدیل کر لیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری وجہ سے ان خواتین پر کوئی مصیبت آئے اور پھر نامحرموں کے ساتھ گفتگو کرنا بھی مناسب نہیں تھا، اور اگر کوئی پہریدار دیکھ لیتا تو اس نے بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا تھا جو کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔

تقریباً دو تین ہفتوں بعد ہمیں اس عمارت سے شفٹ کر کے اسی عمارت کے بالکل سامنے ایک دریائی جزیرے میں منتقل کر دیا گیا، یہ جزیرہ تقریباً دو مربع زمین پر مشتمل تھا جس کے چاروں طرف دریا تھا، یہاں پر جون جولائی کے مہینے میں بھی بہت زیادہ سردی پڑتی تھی، ایک تو پنجشیر سمت شمال کا سرد ترین منطقہ تھا دوسرا چاروں طرف یخ بستہ دریا تھا جس میں سخت دھوپ میں بھی کچھ دیر کھڑا ہونا انتہائی مشکل تھا کیونکہ یہ دریا سارا سال ہی سرد رہتا تھا، ایسی

حالت میں سردی اور زمین کی نمی سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، سات سات قیدیوں کیلئے صرف ایک ایک سنگل کمبل تھا جس سے سردی سے بچاؤ تقریباً ناممکن تھا، جبکہ خوراک نام کی کوئی چیز یہاں کئی کئی دن تک نہیں ملتی تھی، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے خودرو پودوں کے پتے پانی میں ابال کو ہم قیدیوں کو کھانے پڑتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ہم تمام قیدی دن بدن لاغر ہوتے جا رہے تھے، بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ قیدی دن بدن موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رحمت کا فرشتہ

جزیرے میں نمی کی وجہ سے اکثر ساتھی مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، ایک بیماری ''روما تیزم'' کی وجہ سے پاؤں سوج جاتے ہیں اور جسم کے تمام جوڑوں میں درد شروع ہو جاتا، پاؤں والی بیماری تو انتہائی ناقابل برداشت تھی کیونکہ اس بیماری کی وجہ سے اکثر ساتھی چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہو گئے تھے اور جو چل پھر سکتے تھے وہ بھی زیادہ دور تک نہیں چل سکتے تھے اس پر مستزاد یہ کہ علاقے کے لوگ ساتھیوں کو جیل کے عملے سے مانگ کر بیگار پر لے جاتے تھے اور بیمار اور جاں بلب قیدیوں سے انتہائی سخت کام کرواتے، ان بیگار پر لے جانے والوں میں ایک آدمی قیدیوں کے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا، کیونکہ متذکرہ شخص صبح سویرے آتا اور دس پندرہ قیدیوں کو بیگار کے نام پر لے جاتا لیکن یہ شخص ساتھیوں سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ لے جا کر انہیں اپنی حویلی میں بٹھا دیتا تھا اور بیگار والے ساتھیوں کی خوب خاطر مدارات کرتا اور جب عصر کے قریب قیدیوں کو واپس جیل میں لاتا تو ایک دو ٹوکرے توتوں کے اور کچھ روٹیاں جزیرے والے قیدیوں کیلئے بھی لے آتا اور جس کام کیلئے قیدیوں کو لے جاتا تھا عصر تک وہ سارا کام وہ اکیلا ہی کرتا تھا تاکہ پہرہ داروں کو دکھا سکے کہ قیدیوں سے یہ کام لیا ہے۔

اس تھوڑی سی آسانی اور نعمت کی عمر بھی صرف چند روزہ ہی ثابت ہوئی کیونکہ جیل کے عملہ کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ بیگار پر لے جانے والا شخص قیدیوں سے کام نہیں کرواتا بلکہ ان کی مہمانداری کرتا ہے، علاوہ ازیں جزیرے والے قیدیوں کیلئے اس شخص کا توت وغیرہ لانا بھی جیل کے عملے کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، چنانچہ متذکرہ شخص کو جیل کے عملہ نے آئندہ قیدی دینے

سے انکار کر دیا۔

عرب قیدیوں کی آمد

ہمارے دریائی جزیرے میں منتقل ہونے کے تقریباً ایک مہینے بعد چند اور نئے قیدیوں کو جزیرے میں لایا گیا جن میں تین تو عرب تھے بقایا پاکستانی، دو عرب قیدی شدید زخمی تھے جبکہ جو نئے قیدی زخمی نہیں تھے ان کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ وہ سخت قسم کے ظلم و ستم اور تشدد سہنے کے بعد یہاں پہنچے ہیں، کیونکہ غیر زخمی قیدی ٹھیک طرح سے چل پھر سکتے تھے اور نہ ہی بیٹھ سکتے تھے، عرب قیدیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ان دونوں زخمیوں کو گرفتار کرنے کے بعد ایک ایک ٹانگ میں گولیاں ماری گئی تھیں علاوہ ازیں احمد شاہ مسعود نے اپنے ہاتھوں سے ان پر تشدد کیا۔

جیل میں استاد حسان حبیب کی شہادت

انہی دنوں استاد حسان حبیب اور مرزا عالم کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی جنہیں ساتھی جیل کے عملہ کی اجازت سے پہرہ داروں کے پہرہ میں ہسپتال اٹھا کر لے گئے کچھ اور بیمار ساتھیوں کو بھی انہیں کے ساتھ ہسپتال جانے کی اجازت مل گئی، ہسپتال ایک اور نزدیکی جگہ ''چنگرام'' میں واقع تھا، جب ساتھی پہرہ داروں کی معیت میں چنگرام ہسپتال پہنچے تو وہاں ایک خطرناک واقعہ پیش آ گیا، یعنی قیدی ساتھی جیسے ہی ہسپتال کے صحن میں پہنچے تو شمالی اتحاد کا ایک فوجی ایل ایم جی گن اٹھا کر آ گیا اور ساتھیوں کی طرف گن سیدھی کر لی اور کہنے لگا ''آج تم لوگ یہاں علاج کیلئے آئے ہو تو میں تمہارا ایسا علاج کروں گا کہ تمہیں اس کے بعد کسی علاج کی ضرورت نہیں رہے گی'' یہ کہہ کر اس نے بلٹ چڑھایا اور فائرنگ پوزیشن میں ساتھیوں کی طرف ہوا ہی تھا کہ دفعتاً ایک سینئر ڈاکٹر دوڑتا ہوا آیا اور آتے ہی اس نے گن بردار آدمی کو ایک طرف دھکا دیا جس سے وہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا اور گن بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، ڈاکٹر نے اس فوجی کو مخاطب کر کے کہا بزدلی اور بے غیرتی کی انتہا ہوتی ہے ان نہتے، بے بس اور قریب المرگ قیدیوں کے اوپر تم اپنی بہادری دکھا رہے ہو، اگر تم اتنے غیرت مند ہوتے تو میدان جنگ سے بھاگ کر گھر میں نہ بیٹھے ہوتے، میدان جنگ میں اگر تم انہی لوگوں کے آگے اسلحہ سیدھا کرتے تو یقیناً یہی لوگ تجھے بتا دیتے کہ لڑا کس طرح جاتا ہے، آج یہ لوگ

تمہارے رحم و کرم پر ہیں جنہیں تم نے بھوکا رکھ کر پہلے ہی مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، تمہیں شرم کرنا چاہیے، اور یہاں سے دفع ہو جاؤ اور اگر اب دوبارہ ہسپتال کے نزدیک نظر آئے تو اپنے ذمہ دار تم خود ہو گے، وہ فوجی گن اٹھا کر کپڑے جھاڑتا ہوا بستی کی طرف چلا گیا۔

مسعودی فوجی کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر تمام ساتھیوں کو اپنے کمرے میں لے گیا جہاں پر اس نے سب سے پہلے استاد حسان کا معائنہ کیا جن کی حالت بہت ہی تشویشناک تھی، چنانچہ معائنہ وغیرہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے خالد بھائی کو بتایا کہ اس مریض کو ٹی بی ہے جو اپنی آخر سٹیج پر پہنچ چکی ہے، اور اسکے جسم میں خون تقریباً ختم ہو چکا ہے، اس لئے اس مریض کو خون کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک دوسرے ساتھیوں کے معائنہ سے ڈاکٹر صاحب فارغ ہوئے تو قریب ہی موجود لیبارٹری میں بھیجے گئے حسان بھائی کے خون کے ٹیسٹ بھی آ گئے، خالد بھائی کے خون کا جو گروپ تھا وہی حسن بھائی کا تھا چنانچہ خالد بھائی نے خون کی ایک بوتل دی جو اسی وقت بھائی حسان کو لگا دی گئی، ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر ڈاکٹر نے ایک پرچہ احمد شاہ مسعود کے نام لکھ کر قیدیوں کے ساتھ آئے ہوئے پہرہ داروں کے سرخیل کو دیا اور تاکید کرتے ہوئے کہا کہ یہ پرچہ ان کو پہنچا دو کیونکہ ان دو قیدیوں حسان حبیب اور مرزا عالم کی حالت انتہائی نازک ہے اور ان کی بیماری شدت اختیار کر چکی ہے، اس لئے انہیں فوراً آزاد کر کے ریڈ کراس کے حوالے کر دیں تا کہ وہ انہیں پاکستان پہنچا دیں، ان دونوں کو جو خطرناک بیماری لاحق ہے وہ پھیل بھی سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے پرچہ وصول کرنے اور تاکید سننے کے بعد پہرے دار بیمار ساتھیوں کو واپس جزیرے میں لے آئے، پہریداروں کے سرخیل نے آتے ہی جیل کے کماندان کو ڈاکٹر کا دیا ہوا پرچہ دیا اور ڈاکٹر کی کہی ہوئی تاکید بڑھا چڑھا کر اس کے سامنے بیان کر دی، چنانچہ جیل کا کماندان اسی دن احمد شاہ مسعود کی طرف روانہ ہو گیا اور ایک دن بعد دونوں قیدیوں حسان حبیب اور مرزا عالم کی آزادی کا پروانہ لے کر واپس آ گیا اور آتے ہی اس نے ہم قیدیوں کو بتایا کہ آمر صاحب نے ان بیمار قیدیوں کو آزاد کرنے کا حکم دے دیا ہے اور میرے سامنے انہوں نے ریڈ کراس والوں سے رابطہ کر کے ان دونوں قیدیوں کو پاکستان پہنچانے کی تاکید کر دی

ہے، چنانچہ کل ریڈ کراس والے آئیں گے اور دونوں کو لے جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا یعنی ریڈ کراس والوں نے غفلت کی اور تین چار دن تک مریضوں کو وصول کرنے نہ آئے اور انہی دنوں میں استاد حسان حبیب انتہائی کسمپرسی کی حالت میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے شہید ہو گئے جنہیں ''ملاسپا'' کے گاؤں میں دفن کر دیا گیا۔ حسان حبیب کی شہادت کے دو دن بعد ریڈ کراس والے آئے اور مرزا عالم کو لے کر چلے گئے، حسان حبیب کی شہادت سے بھی ریڈ کراس والوں کو آگاہ کر دیا گیا جس کا انہوں نے اپنے پاس اندراج کر لیا۔

جزیرے میں منتقل ہونے کے بعد قیدیوں کے انتظامی امور مدیر تحقیق جمال کے سپرد کر دیئے گئے تھے جس نے اگرچہ قیدیوں کیلئے جزیرے میں فٹ بال وغیرہ کھیلنے کا انتظام کیا تھا اور تفریح مہیا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسی جمال نے جزیرے میں نئے آنے والے قیدیوں جن کا ذکر پیچھے گزرا ہے پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی، قیدیوں کو گھنٹہ گھنٹہ یخ بستہ دریا میں کھڑا کر کے ان کا نظارہ کرنا اور ان کی تکلیف سے لطف اندوز ہونا یہاں پر جمال کا خاص اور محبوب مشغلہ تھا، لیکن اسی جمال نے ایک دن جزیرے میں ایک ایسا کام کیا جو اگرچہ قیدیوں کیلئے وقتی فائدے کا حامل تھا اور بعد میں اسی فائدہ کے نتیجہ میں ہم قیدیوں کو بہت غلیظ گالیاں بھی سننا پڑیں لیکن جمال کے اس کام نے جاں بلب اور بہت دنوں کے بھوکے قیدیوں کے جسموں میں تازگی اور نئی زندگی پیدا کر دی۔

واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک دن جمال کئی دنوں کے بعد چرس کے نشہ میں دھت قیدیوں کے پاس آیا اور حال احوال پوچھنے لگا، جمال کا نرم رویہ دیکھ کر ایک قیدی ساتھی نے جمال کو مخاطب کر کے کہا کہ مدیر صاحب! ہم سب قیدی کئی دنوں سے بھوکے ہیں اور اب قیدیوں میں بھوک کی وجہ سے چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہیں، جمال نے بڑے تحمل سے قیدی ساتھی کی بات سنی اور جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''میرے اختیار میں اور تو کچھ نہیں ہے لیکن میں تمام قیدیوں کو اجازت دیتا ہوں کہ دریا کے پار جاؤ اور وہاں پر لگے ہوئے توت کے درختوں سے توت توڑ و اور کھاؤ تا کہ فی الحال تم اپنی بھوک مٹا سکو لیکن یاد رکھو یہ اجازت صرف دس منٹ کیلئے ہے دس منٹ کے اندر اندر واپس آ جاؤ'' جمال یہ باتیں کر کے دریا کے پار اوپر والی عمارت میں چلا گیا

جبکہ ان قیدیوں نے جو چل پھر سکتے تھے لکڑی کے شہتیر کے ذریعے دریا پار کیا اور دس منٹ کے اندر اندر جزیرے کے نزدیک والے تمام درختوں سے توتوں کا صفایا کر دیا اور توت لے کر واپس جزیرے میں آ گئے اور وہاں پر موجود زخمیوں اور بیماروں کو بھی توت کھلائے۔

سب قیدیوں نے پیٹ بھر کر توت کھائے اور توت کھا کر ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ گاؤں کے چند لوگ آ گئے اور قیدیوں کو گالیاں بکنے لگے اور واویلا کرنے لگے کہ قیدی ہمارے سارے توت کھا گئے ہیں، ان کا شور سن کر پہرے دار بھی آ گئے جو اوپر کھانا کھانے گئے ہوئے تھے، انہیں جب معاملے کا پتہ چلا تو وہ قیدیوں سے باز پرس کرنے لگ گئے کہ تم نے توت کیوں اور کس کی اجازت سے کھائے ہیں؟ اس پر قیدیوں نے بتایا کہ ہمیں مدیر جمال نے اجازت دی تھی، چنانچہ گاؤں والوں نے مدیر جمال کو بلایا، جب جمال آ گیا تو گاؤں والوں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے قیدیوں کو ہمارے توت کھانے کی اجازت کیوں دی؟ مدیر جمال صاف مکر گیا کہ میں نے انہیں کوئی اجازت وغیرہ نہیں دی بلکہ بھوک کے ہاتھوں تنگ ہو کر قیدیوں نے خود ہی یہ کام کیا ہے، تھوڑی سی تو تکرار کے بعد جمال نے گاؤں والوں کو ڈرا دھمکا کر واپس بھیج دیا۔

☆☆☆☆

چوتھا حصہ:

دشتک جیل

انہی ایام میں ایک دن جزیرے میں احمد شاہ مسعود کی طرف سے ہم قیدیوں کی ذہن سازی کرنے کے لیے ایک مولوی آیا جس نے ہم قیدیوں کے سامنے لمبی چوڑی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ احمد شاہ مسعود اور شمالی اتحاد والے ٹھیک ہیں اور حق پہ ہیں، اور طالبان حق پر نہیں ہیں، قصہ مختصر یہ کہ اس نے پوری تقریر میں احمد شاہ مسعود اور شمالی اتحاد کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے، جبکہ تحریک طالبان کے اوپر خوب کیچڑ اچھالا، متذکرہ مولوی صاحب جب تقریر کر چکے تو قیدیوں نے مسعودی مولوی صاحب سے کہا کہ ''آپ نے بہت اچھا قرآن پاک پڑھا اور بہت اچھی حدیثیں ہمیں سنائیں، لیکن ہمیں یہ تو بتائیں کہ ہم قیدیوں کو دو تین ماہ سے جو اس جزیرے میں بھوکے رکھا ہوا ہے یہ کہاں کی مسلمانی اور انسانیت ہے'' اس پر مولوی صاحب نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ ہماری حالت بھی آپ جیسی ہی ہے کیونکہ اب طالبان نے پنجشیر میں داخلے کے تمام راستے بند کئے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے باہر سے مواد غذائی یہاں نہیں پہنچ رہا، اس کے بعد ہم قیدیوں میں سے کسی نے مسعودی مولوی صاحب سے مزید کوئی بات نہیں کی کیونکہ وہ اپنے ظلم وستم اور ناروا سلوک پر پردہ ڈالنے کیلئے اتنا بڑا جھوٹ بول چکا تھا جس کے بعد کسی اور بات کی گنجائش ہی باقی نہیں بچی تھی، حالانکہ پہرہ داروں اور جیل کے عملہ کو اچھی سے اچھی غذا کھاتے روزانہ ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔

''ملاسپا'' کے اس دریائی جزیرے سے تین مہینے بعد ہمیں دشتک جیل میں منتقل کر دیا گیا، یہ جیل دراصل فوجی ٹریننگ سنٹر تھا، جہاں پر روسی، انڈین، ایرانی اور فرانسیسی فوجی آفیسر مسعودی عساکر کو جنگی تربیت دیا کرتے تھے، لیکن ہم قیدیوں کے یہاں پر پہنچنے سے پہلے ہی یہ ٹریننگ سنٹر کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا۔

دشتک جیل میں منتقل ہونے سے ہم سب قیدیوں کو بھوک اور پنجشیر کے موسم کی سختیوں سے نجات مل گئی، یہاں پر کھانا تین وقت ملنا شروع ہو گیا جس سے ساتھیوں کی بگڑی ہوئی

صحت اور بھوک سے گھلتا ہوا جسم ٹھیک ہونا شروع ہو گیا۔

اس جیل میں باقاعدگی سے تین وقت کھانا ملنے کی وجہ یہ تھی کہ مسعودی حکام نے یہاں پر قیدیوں سے دن رات سخت ترین کام لینا شروع کر دیا تھا، قیدیوں سے تقریباً پورے پنجشیر کی سڑکیں بنوائی گئیں، کبھی قیدیوں سے سخت پتھریلی زمین میں بڑے بڑے گڑھے کھدوائے جاتے، ٹرک لوڈ کروائے جاتے اور کبھی ٹوٹی ہوئی عمارتیں تعمیر کروائی جاتیں، مسلح پہرے دار قیدیوں کو صبح منہ اندھیرے کام کیلئے لے جاتے اور سورج غروب ہوتے ہی واپس لاکر جیل میں بند کر دیتے، کام کے دوران کئی مسلح پہرے دار مسلسل قیدیوں کی نگرانی پر مامور رہتے، درہ پنجشیر سے کسی قیدی کا اور خاص طور کسی پاکستان قیدی کا فرار ہونا ناممکن تھا کیونکہ درے کے دونوں جانب بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیاں پورا سال برف سے ڈھکی رہتی تھیں، جنہیں عبور کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی، اس طویل درے میں ایک ہی سڑک تھی جو دریا کے کنارے کنارے آخر تک جاتی تھی، اور اس سڑک پہ جا بجا حفاظتی چوکیاں تھیں جن سے فرار کے لئے گزرنا تقریباً ناممکن تھا۔

پنجشیری بوڑھا

دشتک جیل میں اکثر پہرے دار ''ملا سپا'' والے ہی تھے لیکن چند نئے پہرے دار بھی ان میں شامل تھے جبکہ جیل کا سربراہ مرزا نامی ایک شخص تھا جو نہایت ہی متکبر تھا اسی وجہ سے وہ قیدیوں کے پاس بہت ہی کم آتا تھا، جیل کے داخلی امور بدستور جمال ہی کے پاس تھے جو جیل کا مدیر تحقیق بھی تھا، دشتک جیل میں ایک نیا بوڑھا پہرے دار تھا جو ہم قیدیوں سے سخت نفرت کرتا تھا، اور اس کا رویہ بھی قیدیوں کے ساتھ نہایت ہی ہتک آمیز ہوتا تھا، تحریک طالبان کے خلاف بھی وہ اکثر زہر اگلتا رہتا تھا، ایک مرتبہ بوڑھا پہریدار رخصت پر چلا گیا، کئی دن بعد ڈیوٹی پر واپس آیا تو اس کا رویہ یکسر بدلا ہوا تھا، اب وہ پہلے جیسا کینہ پرور بوڑھا نہ رہا تھا، بلکہ وہ طالبان حکومت کی بڑی تعریفیں کرتا تھا، وہ قیدیوں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز پابندی سے پڑھنے لگا۔ ہم حیران تھے کہ یہ ظالم قسم کا بوڑھا یکدم قیدیوں پر اتنا مہربان کیسے ہو گیا، چنانچہ ہمارے استفسار پر بوڑھے نے بتایا کہ میں گزشتہ دنوں اپنے مکان کی دیکھ بھال کیلئے کابل گیا

تھا جہاں پر میرا مکان بالکل محفوظ تھا، انہیں دنوں طالبان نے اپنی روٹین کے مطابق آٹا تقسیم کیا تو انہوں نے ایک تھیلا مجھے بھی دیا، حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ میں پنجشیر سے صرف اپنا مکان دیکھنے کیلئے آیا ہوں، جبکہ پنجشیر میں مجھے کوئی پوچھتا تک نہیں تھا، طالبان کے علاقہ میں سفر کے دوران مجھے کسی نے تنگ نہیں کیا، کابل میں جلال آباد اڈے پر اترا تو وہاں پر موجود طالبان نے مجھ سے پوچھا کہ گاڑی والے نے زیادہ کرایہ تو نہیں لیا؟ میرا جواب نفی میں تھا کیونکہ گاڑی والے نے نہایت ہی مناسب کرایہ وصول کیا تھا، بوڑھے پہرے دار نے مزید بتایا کہ ''طالبان کے ہاں گاڑیوں کے کرائے شمالی اتحاد کے زیر کنٹرول علاقوں کی نسبت تین گنا کم تھے، طالبان کا جذبہ خدمت اور ان کا شرعی نظام حکومت مجھے بہت پسند آیا، اب یہ بوڑھا پہریدار طالبان کا نام بڑے احترام سے لیتا اور ان کی تعریف کرتے وقت بخل سے ہرگز کام نہیں لیتا تھا۔

برف باری کا موسم شروع ہونے سے پہلے جہاں ریڈ کراس والوں نے قیدیوں کو کمبل اور گرم چادریں مہیا کر دیں وہیں پر مدیر جمال نے قیدیوں کے ہال کی کھڑکیاں لکڑی کے تختے لگا کر بند کر دیں تاکہ شمال کی برفانی ہواؤں سے قیدی محفوظ ہو جائیں، علاوہ ازیں کمرہ گرم کرنے والی دو بخاریاں بھی ہال میں نصب کرا دیں، اس طرح قیدی پنجشیر کے برفانی موسم سے یہاں پر کسی حد تک محفوظ ہو گئے۔

ظلم کی انتہا

دشتک جیل میں مزید تین قیدیوں کو لایا گیا جن میں دو قیدی قاری جاوید اختر اور محمد یوسف تو پاکستانی تھے جبکہ ایک قیدی مصری گل افغانی تھا لیکن گھر اور اس کا کاروبار میران شاہ میں تھا، یہ قیدی بھی تقریباً مئی ۱۹۹۷ء ہی میں گرفتار ہوئے تھے لیکن کسی مسعودی کمانداں نے انہیں نجی جیل میں رکھا ہوا تھا، دشتک جیل پہنچنے پر قاری جاوید اور مصری گل کو بے دردی سے زدو کوب کیا گیا، کئی دن تک ان دونوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے، جس کی وجہ سے یہ دونوں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، حتیٰ کہ تھوڑی سی حرکت کرنا بھی ان کیلئے تکلیف دہ تھی، کئی ماہ تک ساتھی ان کی ٹکوریں اور مالشیں کرتے رہے جس سے وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے، جبکہ تیسرے قیدی یعنی یوسف کو مدیر مرزا نے یہ کہتے ہوئے تشدد سے بچا لیا کہ ''یہ

میرے بیٹے جیسا ہے'' چنانچہ یوسف کو نیچے جیل کے دفتر میں مرزا نے خدمت کیلئے رکھ لیا۔ بھائی یوسف نے ایک دن ساتھیوں کو بتایا کہ ہم دو ساتھی گرفتار ہوئے تھے ہمیں میدان جنگ میں ہی احمد شاہ مسعود کے سامنے پیش کر دیا گیا، مسعود نے ہم دونوں پر بہت تشدد کیا، بعد ازیں مسعود نے میرے دوسرے ساتھی کے اوپر اپنے ہاتھوں سے پٹرول چھڑک کر زندہ جلا دیا اور جب تک وہ ساتھی مکمل طور پر جل کر شہید نہ ہو گیا احمد شاہ مسعود اور اس کے چیلے اس درد ناک منظر کا نظارہ کرتے رہے اور جلنے والے ساتھی کی دردناک اور دلوں کو دہلانے والی چیخوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ دشتک جیل میں بھی قیدیوں کے کھانے میں کمی ہونے لگی جس کی وجہ یہ تھی کہ جیل کے رئیس اور مدیر لاجسٹک نے قیدیوں کے حصہ کی خوراک پر شب خون مارنا شروع کر دیا تھا، وہ خام خوراک کو جیل میں پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں اتار لیتے تھے اور بہت کم قیدیوں کیلئے چھوڑتے تھے، ہم قیدیوں کا کھانا ہمارے اپنے ساتھی بھائی قاری رحمت اللہ اور قاری اقبال وغیرہ بناتے تھے جو ہمیں بتایا کرتے تھے کہ مدیر موادِ غذائی کی مقدار کم کرتا جا رہا ہے اور عذر یہ پیش کرتا ہے کہ پیچھے سے ہی ہمیں موادِ غذائی کم ملتا ہے۔

مدیر عبدالواحد سے کئی بار قاری رحمت اللہ نے مواد غذائی کے بارے میں جھگڑا کیا کہ وہ قیدیوں کے حساب سے راشن کم دیتا ہے اور کئی بار تو بھائی رحمت اللہ نے عبدالواحد کو کھلے لفظوں میں یہ بھی کہا کہ پیچھے سے تمہیں پورا راشن ملتا ہے لیکن تم لوگ ہمیں پورا راشن نہیں دیتے ہو، لیکن وہ یہ بات ماننے پر تیار نہیں ہوا بلکہ قسمیں اٹھا کر کہتا کہ جو کچھ ہمیں ملتا ہے وہ سارے کا سارا ہم آپ کو دیدیتے ہیں۔

عبرت ناک انجام

کچھ ہی دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے مدیر عبدالواحد کو ایسا پکڑا جس سے وہ بہت تکلیف دہ مصیبت میں مبتلا ہو گیا، ایک دن مدیر عبدالواحد نیچے جیل کے دفتر کے پاس ایرانی کلاشنکوف سے کسی چیز کا نشانہ لے رہا تھا اس نے نشانہ لے کر جیسے ہی ٹریگر دبایا تو کلاشن کا سپرنگ پورے پریشر کے ساتھ نکلا اور اس کی آنکھ میں جا لگا جس سے اس کی آنکھ ضائع ہو گئی، آنکھ اور آنکھ سے

نیچے گہرا گڑھا بن گیا اور خون کے فوارے چھوٹنے لگے چنانچہ وہ تکلیف کی شدت سے چلانے لگا، وہ مسلسل چلاتے ہوئے زور زور سے قیدیوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا ''قیدیو! مجھے معاف کر دو، میں تمہارے حق پہ ڈاکہ ڈالتا رہا ہوں، تمہارا حق کھاتا رہا ہوں، آج میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ گیا ہوں، مجھے معاف کر دو۔

جیل میں فوجی ٹرک موجود تھا لیکن اس وقت کوئی ایسا آدمی جیل کے عملہ میں موجود نہیں تھا جو زخمی مدیر کو ٹرک میں ڈال کر ہسپتال لے جا سکتا کیونکہ ہسپتال جیل سے کافی دور تھا، اس مشکل وقت میں وہ قیدی ہی اس کے کام آئے جن کا آج تک یہ مدیر حق کھاتا رہا تھا، ہوا اس طرح کہ مدیر کی آہ و بکا سن کر ہمارے کچھ قیدی ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے اور جب قیدیوں نے یہ صورتحال دیکھی کہ جیل میں موجود عملہ میں کوئی ڈرائیور نہیں ہے اور زخمی کی حالت بھی خون بہنے سے لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی تو قیدیوں میں سے ایک قیدی ساتھی نے رضا کارانہ طور پر ڈرائیونگ کیلئے خود کو پیش کر دیا جس کو پہریداروں نے قبول کر لیا چنانچہ دو تین قیدی زخمی کو اٹھا کر ٹرک میں بیٹھ گئے اور وہ ہسپتال روانہ ہو گئے، کئی دنوں بعد پتہ چلا کہ مدیر عبدالواحد کی دائیں آنکھ مکمل طور پر ختم ہو گئی ہے اور چہرے کے دائیں طرف آنکھ کے نیچے والا حصہ بھی کافی متاثر ہوا ہے۔

پنجشیر کے مفتی عالم کا فتویٰ

پنجشیر میں بازارک قصبہ کی حیثیت دارالحکومت کی سی تھی کیونکہ احمد شاہ مسعود کا گھر بازارک میں تھا جس وقت قید کی حالت میں ہم نے بازارک کو دیکھا تھا تو یہ کوئی بندرگاہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہاں ہر طرف بڑے بڑے کنٹینر ہی کنٹینر اور بڑی گاڑیاں کھڑی ہوئیں تھیں، دراصل احمد شاہ مسعود جب کابل سے شکست کھا کر بھاگا تھا تو قیمتی اشیاء، بھاری مشینری، فوجی آلات حرب، اسلحہ اور خوراک ان کنٹینروں میں بھر کر پنجشیر لے آیا تھا، مسعود کے اسی مرکز یعنی بازارک کی جامع مسجد کے ایک مولوی صاحب نے جمعہ کے خطبہ میں علی الاعلان یہ فتویٰ صادر کیا کہ ''طالبان کا نظام حکومت شرعی نظام حکومت ہے جبکہ ہمارے اوپر فساق و فجار مسلط ہیں ہمارا ہر کمانڈر بے دین اور بد کردار ہے، ہمارے سپاہی چرس و افیون کے نشہ کے رسیہ ہیں اور

ہمارے ہاں کوئی بھی خیر کا پہلو نہیں ہے، مولوی صاحب کو حق گوئی کے جرم میں پابند سلاسل کر دیا گیا اور ہماری جیل میں لا کر انہیں بند کر دیا گیا، جیل میں مولوی صاحب نے احمد شاہ مسعود کے بڑے بڑے افسروں کے سامنے چیلنج کرتے ہوئے کئی بار کہا کہ ''میں مسعود کو مناظرہ کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئے اور جو کچھ میں نے کہا ہے اگر غلط ہے تو ثابت کرے اگر وہ میری بیان کردہ باتوں کو کہ جس کی پاداش میں اس نے مجھے قید کیا غلط ثابت کر دے تو میرا خون اس پر مباح ہے'' مولوی صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ مجھے یقین ہے کہ احمد شاہ مسعود کبھی بھی میرے سامنے نہیں آئے گا کیونکہ وہ میری باتوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔

پنجشیر میں ایسے جرم کی کم سے کم سزا موت تھی لیکن مولوی صاحب کا قبیلہ چونکہ کافی طاقتور اور بڑا تھا جس نے احمد شاہ مسعود کے اوپر کافی دباؤ ڈالا جس کی وجہ سے احمد شاہ مسعود چاہتے ہوئے بھی مندرجہ بالا سزا کے اوپر عمل درآمد نہ کر سکا، بلکہ مولوی صاحب کو جیل سے رہا کر کے صرف علاقہ بدر کرنے پر مجبور ہو گیا، بعد ازیں ہمیں مسعودیوں ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کابل میں طالبان کے پاس چلے گئے ہیں۔

9 قیدیوں کی رہائی
اور میرے بڑے بھائی محمد ارشد کی ملاقات کے لیے آمد

انہی دنوں احمد شاہ مسعود نے اعلان کیا کہ پاکستانی قیدیوں کے ورثاء آ کر اگر یہ یقین دہانی کرائیں کہ یہ آئندہ ہمارے خلاف لڑنے نہیں آئیں گے تو میں انہیں رہا کر دوں گا، چنانچہ پہلی دفعہ ۹ ساتھیوں کے رشتہ دار پنجشیر پہنچ گئے تو احمد شاہ مسعود نے اپنے قول کے مطابق ۹ قیدی جن میں قاری عمر فاروق، بھائی قربان، بھائی معاویہ، بھائی شوکت علی اور دیگر سواتی ساتھی شامل تھے کو جیل سے رہا کر کے ان کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا، اس دوران پشاور اور اسلام آباد وغیرہ میں مقیم شمالی اتحاد کے ایجنٹوں نے بے تحاشا روپے کمائے، وہ بھاری رقوم کے عوض قیدیوں کے رشتہ داروں کو پنجشیر لے جاتے اور کچھ قیدیوں کے رشتہ داروں سے روپے لے کر اور سبز باغ دکھا کر رفو چکر ہو جاتے۔ میرے بڑے بھائی محمد ارشد صاحب میری ملاقات کیلئے دوسرے گروپ میں آئے، ملاقات کے وقت میرے بڑے بھائی نے چند ایسی باتیں

کہیں جن سے میرا حوصلہ بہت زیادہ بڑھ گیا، یعنی حال احوال پوچھنے کے بعد میرے بڑے بھائی نے کہا کہ" کچھ کیتا وی سی؟ یعنی لڑائی میں کچھ کیا بھی تھا؟ تو میں نے بھائی جان کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ" الحمدللہ میں بہت سارے مسعودی فوجیوں کو مارنے اور ان کا کافی نقصان کرنے کے بعد زخمی ہونے اور ایمونیشن ختم ہونے کی وجہ سے گرفتار ہوا تھا، اس پر میرے بڑے بھائی نے کہا کہ: پھر خیر ہے، کیونکہ اونٹوں والوں سے یاری رکھنے کیلئے دروازے بھی بڑے رکھنے پڑتے ہیں، یعنی عظیم مقصد اور عظیم کام کیلئے آزمائشیں بھی بڑی ہی آتی ہیں اس لئے حوصلے بلند رکھنے چاہئیں اور ہمت سے کام لینا چاہیے۔

میرے بڑے بھائی محمد ارشد صاحب نے یہاں تک پہنچنے کی روئیداد سناتے ہوئے بتایا کہ سفر میں جب تک ہم طالبان کے علاقہ میں رہے تو ہر جگہ طالبان نے ہمارے ساتھ معزز مہمانوں جیسا سلوک کیا اور ہمیں انہوں نے کسی قسم کی تنگی محسوس نہیں ہونے دی لیکن جیسے ہی ہم احمد شاہ مسعود کے زیر کنٹرول علاقہ میں پہنچے تو یوں محسوس ہوا کہ یہاں چورا چکوں کا راج ہے، ہر جگہ پر ہمیں ڈرایا دھمکایا گیا، کئی جگہ ہمارے قافلہ کے ساتھیوں کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی، ایک مرتبہ تو پیچھے رہ جانے والے ہمارے دو ساتھیوں کو اغواء کر بھی لیا گیا، جنہیں کئی گھنٹوں کے بعد استاد سیاف کے ایک کمانڈر نے بڑی تگ ودو کے بعد بازیاب کرایا، بھائی نے مزید بتاتے ہوئے کہا کہ ہم قافلے والے جو کچھ قیدیوں کیلئے لائے تھے اس کا صرف تیس فیصد حصہ آپ لوگوں کیلئے بچا کر لا سکے ہیں جبکہ ستّر فیصد مسعودی فوجیوں نے راستے ہی میں ہم سے چھین لیا تھا۔

پنجشیر میں طالبان کے ایک حامی سے ملاقات

قیدیوں کے رشتہ دار جیل میں اس امید سے آئے تھے کہ ان کے قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے گا، لیکن احمد شاہ مسعود اپنے قول سے مکر گیا اور پہلے ۹ قیدیوں کو آزاد کرنے کے بعد کسی اور قیدی کو آزاد نہیں کیا، ایک گروپ میں ایک ایسے ساتھی کا رشتہ دار آیا جو کچھ دنوں بعد ویسے ہی رہا ہونے والا تھا لیکن اس کے رشتہ دار کے آنے کی وجہ سے اس کی رہائی کا حکم منسوخ کر دیا گیا، اس ساتھی کا واقعہ دراصل اس طرح ہے کہ یہ ساتھی جس کا نام رمضان تھا اور بہاولپور کا رہنے

والا تھا، میرے ساتھ ہی چاریکار سے گرفتار ہوا تھا، وقت گرفتاری رمضان بھائی نے اپنے آپ کو گونگا اور بہرہ ظاہر کیا تھا، بعداز گرفتاری مسعودی فوجیوں نے رمضان بھائی پر بے پناہ تشدد کیا اور اسے بلوانے کی کوشش کی لیکن رمضان بھائی استقامت کے ساتھ اپنے بہروپ پر ڈٹے رہے، آخرکار شمالی فوجیوں نے ہار مانتے ہوئے رمضان بھائی کو پنجشیر پہنچا دیا۔

پنجشیر میں کئی ہفتے رمضان پر طرح طرح کے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے اور بلوانے کی کوشش کی جاتی رہی، پنجشیر میں جتنے بھی بڑے بڑے مدبر اور محقق تحقیق کرنے والے تھے سب نے رمضان بھائی کو بلوانے کیلئے اپنا اپنا تجربہ استعمال کیا اور ہر طرح سے ظلم وستم کر کے دیکھ لیا لیکن پھر بھی وہ رمضان کو نہ بلوا سکے، اور نہ کچھ سنوا سکے، آخرکار جیل کا عملہ رمضان بھائی کو میڈیکل چیک اپ کے لیے ہسپتال لے گیا جہاں پر کئی بڑے ڈاکٹروں نے رمضان کا معائنہ کیا اور متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ ”میڈیکل کی رو سے یہ قیدی نہ تو گونگا ہے اور نہ ہی بہرہ ہے“ جب جیل کے حکام نے ڈاکٹروں کو بتایا کہ ہم ایک مہینے سے اس قیدی پر تشدد کر رہے ہیں اور ہم اس پر ہر حربہ استعمال کر چکے ہیں لیکن یہ قیدی اب تک نہ کچھ بولا ہے اور نہ اس نے سننے کا کوئی تاثر دیا ہے، آخرکار ڈاکٹروں نے بھی معذرت کرتے ہوئے کہا، یہ معاملہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

آخری حربے کے طور پر جیل حکام رمضان کو ایک کھلے میدان میں لے گئے اور چلتے چلتے اچانک رمضان بھائی کے بالکل کان کے قریب پلاننگ کے مطابق ایک پہرہ دار نے کلاشنکوف کا پورا برسٹ چلا دیا، اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے رمضان بھائی کی مدد کی اور وہ اپنے گونگے بہرے ہونے کے بہروپ پر استقامت کے ساتھ ڈٹا رہا، یعنی بالکل کان کے قریب گولیاں چلنے کے باوجود بھی رمضان نے ایسا تاثر دیا کہ گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو، چنانچہ تحقیق کرنے والوں نے رمضان بھائی کو متفقہ طور پر گونگا اور بہرہ قرار دے دیا اور تحقیق کی فائل پر لکھ دیا۔

رمضان کے گونگا ہونے کی وجہ سے شہنشاہ نامی ایک مدیر تحقیق کی کوشش سے رمضان کی رہائی کے امکانات پیدا ہو گئے علاوہ ازیں رمضان نے اپنے آپ کو افغانی ظاہر کیا ہوا تھا لیکن رمضان بھائی کے ایک ملاقاتی کے آنے کی وجہ سے رمضان کے اس بہروپ کا پول کھل گیا اور رمضان بھائی کی رہائی جو عنقریب ہونے والی تھی وہ معطل ہو گئی اور رمضان کو ایک سال سے

زائد عرصہ کامیابی کے ساتھ گونگا بہرہ رہنے کے بعد آخر کار بولنا پڑ گیا، اس طرح اس کا یہ بہروپ اس کے رشتہ داروں کے آنے سے اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

دشتک اور بہارک جیل کا تمام عملہ رمضان بھائی کی اس استقامت کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا، جیل کے بڑے بڑے افسر بعد میں اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ ''یہ پاکستانی پہلا قیدی ہے جس نے ہمارے تمام تحقیق کرنے والوں اور ڈاکٹروں کو کامیابی کے ساتھ دھوکا دیا اور ایک سال تک اس پر قائم رہا اور اب بھی اس کے رشتہ دار آ کر اس کا پول نہ کھولتے تو ہم اس دھوکہ میں رہتے ہوئے اس پاکستانی کو آزاد کر دیتے۔

دشتک جیل سے قیدی ساتھیوں کو جب بیگار کے لیے لے جایا جاتا تو راستے میں اکثر ایک پنجشیری قیدیوں کے انتظار میں کھڑا ہوتا تھا جو تمام قیدیوں میں پراٹھے تقسیم کرتا تھا اور کبھی کبھار ابلے ہوئے انڈے اور بھنا ہوا گوشت بھی قیدیوں کو کھانے کیلئے دیتا، علاوہ ازیں قیدیوں کے ساتھ حوصلہ افزا باتیں کرتا اور خوب دعائیں بھی دیتا تھا، جبکہ حیرت کی بات یہ تھی کہ خلاف توقع پہرہ دار بھی اس آدمی کے اس کام میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے، اس معاملہ میں قیدیوں کا متجسس ہونا فطری بات تھی، چنانچہ ایک دن ایک قیدی ساتھی نے کام کے دوران موقع پا کر اس آدمی سے پوچھ ہی لیا کہ وہ قیدیوں سے اس قدر ہمدردی کیوں کرتا ہے؟ اور پہرہ دار اس کے کام میں دخل اندازی کیوں نہیں کرتے؟ اس پر پنجشیری نے جواب دیا کہ ''جہاں تک پہرہداروں کا معاملہ ہے تو وہ ایسے ہی چپ نہیں رہتے بلکہ وقتاً فوقتاً پیسے دے کر میں ان کا منہ بند کرتا رہتا ہوں، علاوہ ازیں ہمارا خاندان پنجشیر کے چند مالدار خاندانوں میں سے ایک خاندان ہے اس لئے بھی یہ لوگ کچھ کہتے نہیں۔ اور رہا طالبان قیدیوں سے ہمدردی کا معاملہ تو پہلے میں بھی شمالی اتحاد کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے کے زیر اثر طالبان اور تحریک طالبان کا سخت مخالف تھا نہ صرف مخالف تھا بلکہ طالبان کے خلاف شمالی اتحاد کو مالی معاونت بھی فراہم کرتا تھا اور طالبان کو شمالی اتحاد کی تبلیغات کے مطابق میں بھی امریکہ ہی کی پیداوار سمجھتا تھا حالانکہ میں اکثر کابل جاتا تھا، جہاں پر مثالی امن و امان، لوگوں کی خوشحالی اور طالبان کی انصاف پروری کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، لیکن میری آنکھوں پر اس وقت تعصب کی پٹی چڑھی ہوئی

تھی اس لئے سب کچھ مجھے الٹا ہی نظر آتا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ کابل میں میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس سے میرا واسطہ براہ راست طالبان سے پڑ گیا، جس سے میری آنکھیں کھل گئیں، اور حق روز روشن کی طرح مجھ پر واضح ہو گیا اور باطل کے دبیز پردے جو پہلے میری آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے اتر گئے۔ کابل میں میری کچھ کمرشل جائیداد تھی جس پر ایک کابلی شخص نے طالبان کے کابل فتح کرنے سے پہلے کا قبضہ کر رکھا تھا، ربانی کی حکومت کے آخری دور میں میں نے اپنی جائیداد واگزار کرانے کیلئے بڑی بھاگ دوڑ کی، متعلقہ محکموں کے چکر کاٹے، منت ساجت کی لیکن میری بات کہیں نہ سنی گئی، کیونکہ میری جائیداد کا قابض انتہائی چرب زبان اور شاطر آدمی تھا اور پھر جب طالبان کی حکومت آئی تو میں اپنی جائیداد سے بالکل ہی مایوس ہو گیا، کیونکہ طالبان کے بارے میں میرا نظریہ اس وقت ٹھیک نہیں تھا، اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرا مخالف چرب زبانی کی وجہ سے کابل میں طالبان کے بڑوں تک رسائی حاصل کرتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے کابل میں میرا وقت انتہائی پریشانی میں گزرتا کہ کہیں یہ شخص کوئی چکر چلا کر مجھے طالبان کے ہاتھوں پکڑوا نہ دے۔

پھر وہی ہوا یعنی ایک دن میرے مخالف نے مجھے جاسوسی کے الزام میں طالبان کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا، طالبان کے سپاہیوں نے بدتمیزی کئے بغیر مجھے ایک عمارت میں لے جا کر بند کر دیا، اب میں پچھتا رہا تھا جائیداد تو گئی ہی گئی تھی اب جان بھی جائے گی، کیونکہ ہمارے ہاں یہی افواہ باقاعدہ پھیلائی گئی تھی کہ "طالبان پنجشیریوں کے جانی دشمن ہیں اور اگر کوئی پنجشیری ان کی گرفت میں آ جائے تو بغیر پوچھ گچھ کئے ہی جان سے مار دیتے ہیں، اس لئے طالبان کی قید میں میں نے انتہائی خوف ودہشت زدہ ہو کر رات گزاری، حالانکہ طالبان کی طرف سے مجھے بالکل تنگ نہیں کیا گیا تھا، اور نہ ہی مجھے بیڑیاں وغیرہ لگائی گئیں تھی، جبکہ کھانا بھی مجھے بہت اچھا دیا گیا تھا، لیکن یہ سب چیزیں میرے خوف اور دہشت کو کم نہ کر سکیں، اگلی صبح جب مجھے طالبان کی ایجنسی کے ایک ملا صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ان ملا صاحب نے میری تحقیق اس انداز میں کی جس طرح کوئی آنے والے

معزز مہمان سے حال چال پوچھتا ہے، انہوں نے میری صفائی میں گفتگو انتہائی تحمل اور وقار کے ساتھ سنی جس سے مجھے کافی حوصلہ ملا اور خوف مجھ سے دور ہو گیا، چنانچہ تحقیق کرنے والے ملا صاحب کو میں نے صاف صاف بتا دیا کہ جس شخص نے میری مخبری کی ہے اس نے میری کمرشل جائیداد پر کئی سالوں سے قبضہ کیا ہوا ہے۔

میری جائیداد کے قضیہ کو سن کر میرے مخالف کو بھی طلب کیا گیا قصہ مختصر تین چار دن کی تحقیق کے بعد جہاں میرے اوپر جاسوسی کا الزام غلط ثابت ہوا وہیں مجھے میری جائیداد بھی واپس مل گئی۔ جائیداد کے ساتھ ساتھ مجھے میرا ایمان بھی واپس مل گیا، جو شمالی اتحاد کے پھیلائے ہوئے اندھیروں میں کہیں گم ہو گیا تھا، غرض یہ کہ ان تین چار دنوں میں حق اور باطل کے درمیان فرق مجھ پر آشکار ہو گیا، پنجشیری نے قیدی ساتھی سے مزید کہا کہ یہی وجہ ہے جو میں آپ لوگوں سے ہمدردی رکھتا ہوں اور جتنا ہو سکتا ہے آپ لوگوں کی خدمت کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیونکہ میں جان چکا ہوں کہ آپ لوگ ہی (طالبان) مسلمانوں کے بلکہ پوری انسانیت کے نجات دہندہ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت، صبر اور حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین

دوسرے قیدی ساتھیوں کو جب اس گفتگو کا پتہ چلا تو سب بہت خوش ہوئے، اور سب نے اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا کہ جس نے ظلمتوں کے گڑھ میں روشنیوں کے مسافر پیدا کئے اور ان سے دین مبین کا کام لیا۔

ایک دن دشتک جیل میں ایک قیدی ساتھی بھائی کشمیری کو پہریدار نے تشدد کا نشانہ بنایا اور وجہ یہ بتائی کہ یہ قیدی یعنی بھائی کشمیری میرا انداق اڑاتا ہے اور میری طرف دیکھ کر ہنستا رہتا ہے، حالانکہ کشمیری بھائی کا چہرہ ہی ایسا تھا کہ ہر وقت ہنستا ہوا نظر آتا تھا، مار کھانے کے بعد کشمیری اداس بیٹھا ہوا تھا، میں نے کشمیری بھائی کو تسلی دی اور صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا کشمیری حوصلہ نہیں ہارتے، ان سب تکلیفوں کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے، بشرطیکہ ہم صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، ہم کب تک ان ظالموں کا ظلم وستم برداشت کرتے رہیں گے؟ کشمیری نے کہا: میں نے کشمیری کی اس واقعہ سے توجہ ہٹانے کیلئے کہا کہ کشمیری آپ ہم سے تقریباً ایک سال بعد گرفتار ہوئے ہیں، آپ مجھے اپنی گرفتاری کے حالات

تو بتائیں کہ آپ کس طرح اور کن حالات میں گرفتار ہوئے ہیں، میری کوشش کارگر ثابت ہوئی کیونکہ جب کشمیری مجھے اپنی گرفتاری کے واقعات سنانے لگا تو اس کا اداس چہرہ نارمل ہو چکا تھا۔

نیر بھائی اور...... برفانی قبر

ایک رات دشتک جیل کے پہرہ داروں نے جب حسب معمول قیدیوں کو عشاء کے وضو وغیرہ کیلئے باہر نکالا تو شدید قسم کی برفباری ہو رہی تھی، ہر چیز برف کی سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھی، ایسے میں تمام قیدی ساتھی جلدی جلدی وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر رگوں میں خون منجمد کر دینے والی سردی سے بچنے کیلئے کمرے میں چلے گئے، جب تمام قیدی کمرے میں آ چکے تو پہرہ دار معمول کے مطابق دروازہ مقفل کرنے سے پہلے قیدیوں کی گنتی کرنے لگے تو گنتی میں ایک قیدی کم تھا اس لئے انہوں نے دو تین مرتبہ گنتی کی لیکن ایک قیدی بدستور کم ہی تھا، چنانچہ پہریداروں نے قیدیوں کو حکم دیا کہ اپنے ارد گرد دیکھو کہ تمہارا کون سا ساتھی موجود نہیں ہے؟ ساتھیوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ منیر بھائی نہیں ہے، پہریداروں میں ایک شور بپا ہو گیا کہ ایک قیدی فرار ہو گیا ہے، پہرہ دار ساتھیوں کو مغلظات بکنے لگے اور دھمکیاں دینے لگے۔

خالد بھائی نے ان کو سمجھایا کہ پنجشیر کے اس برفانی موسم میں کوئی صحت مند اور طاقتور آدمی بھی فرار نہیں ہو سکتا جبکہ منیر بھائی مریض اور انتہائی کمزور آدمی ہے، جو عام موسم میں بھی چند میل سفر نہیں کر سکتا، اس شدید برفباری میں جب ہر چیز کو برف نے ڈھانپ رکھا ہے منیر بھائی جیسا آدمی فرار کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جیل کے ارد گرد ہر جگہ پہریداروں نے دیکھا مگر منیر بھائی کا کہیں نام و نشان نہیں ملا، خالد بھائی نے پھر ان کو کہا کہ منیر بھائی یقیناً کسی برفانی کھائی میں گرے پڑے ہوں گے اس لئے ہم قیدی آپ لوگوں کے ساتھ اس کی تلاش میں مدد کرتے ہیں، پہرے داروں کو بھی شاید اس بات کا یقین آ گیا تھا، چنانچہ انہوں نے خالد بھائی کی بات مانتے ہوئے کچھ قیدیوں کو ساتھ لے کر منیر کی تلاش شروع کر دی، رات گئے تک سب لوگ منیر کو تلاش کرتے رہے، لیکن منیر بھائی نہ ملے، تمام قیدی منیر بھائی کے بارے میں فکرمند تھے کہ آخر منیر بھائی کہاں گئے، آخر کار تھک ہار کر پہریداروں نے تمام قیدیوں کو بند کیا اور خود

اپنے بڑوں سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

صبح جب ساتھیوں کو وضو وغیرہ کے لیے نکالا تو ایک ساتھی استنجا وغیرہ کرنے کیلئے قیدیوں کے مطبخ کے پیچھے والی کھائی میں گیا جہاں اس نے دیکھا کہ کوئی چیز برف میں پڑی ہوئی ہے جو صبح تڑکے اندھیرے میں دور سے صاف نظر نہیں آ رہی تھی، قریب جا کر دیکھنے پر اس ساتھی کو پتہ چلا کہ منیر بھائی برف میں اکڑے ہوئے بے ہوش پڑے ہیں، چنانچہ اس ساتھی نے وہیں سے شور شروع کر دیا، چنانچہ اس ساتھی کا شور سن کر پہریدار اور قیدی جو قریب موجود تھے وہ کھائی میں پہنچ گئے، قیدیوں نے جلدی جلدی منیر بھائی کو اٹھایا اور کمرے میں لے گئے، ساری رات برف میں پڑا رہنے کی وجہ سے منیر بھائی تختے کی طرح اکڑ چکے تھے۔ پہریداروں نے منیر کی حالت کو دیکھتے ہوئے کہا کہ اس کا زندہ بچنا مشکل ہے، منیر کی حالت کے پیش نظر قیدیوں کا بھی تقریباً یہی خیال تھا لیکن سب ساتھیوں نے ہمت نہیں ہاری اور مایوس بھی نہیں ہوئے، منیر بھائی کو گرم بخاری کے نزدیک لٹا دیا اور ساتھی اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے تلوؤں کی مالش کرنے لگے اور یہ عمل ساتھیوں نے مسلسل ڈیڑھ دو گھنٹوں تک جاری رکھا، پھر کہیں جا کر منیر بھائی کو کچھ ہوش آیا۔ برف اور سردی کے اثر سے منیر بھائی کا جسم کئی روز تک شل رہا، ساتھی اس وقت تک منیر بھائی کی دیکھ بھال اور خدمت کرتے رہے جب تک وہ ٹھیک طرح سے چلنے پھرنے نہیں لگ گیا، اس واقعہ کے بعد قیدی ساتھیوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کوئی بھی ساتھی تقاضے اور وضو کے لئے اکیلا نہیں جائے گا، تاکہ پھر کسی ساتھی کو ایسا واقعہ پیش نہ آئے۔

☆☆☆☆

پانچواں حصہ:

بہارک جیل پنجشیر

ایک سال سے کچھ کم عرصہ ہمیں دشتک جیل میں قید رکھنے کے بعد مارچ 1998ء میں پھر دوبارہ بہارک جیل میں منتقل کر دیا گیا، بہارک جیل میں اگرچہ پانچ چھ کمرے نئے تعمیر ہو چکے تھے لیکن قیدیوں کی یہاں پر تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے پھر وہی پہلی والی مشکلات سے قیدی دوچار تھے، یعنی لیٹنے کی جگہ نہ ہونے کے برابر تھی، بہارک جیل میں اب ایک کلینک ڈسپنسری بھی کھل چکی تھی، جہاں پر ایک افغانی طالب ساتھی ڈاکٹر مطلب ڈاکٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، ہمارے بہارک جیل میں پہنچنے پر ڈاکٹر ولی محمد سواتی کو بھی ڈاکٹر مطلب کے ساتھ ساتھیوں کی طبی خدمت کے لیے لگا دیا گیا۔

یہاں جیل میں عبدالقادر نامی ایک افغانی قیدی تھا جسے ٹی بی کا مرض تھا، جیل میں اس کا علاج نہ ہونے کی وجہ سے عبدالقادر کی بیماری اپنی آخری سٹیج پر پہنچ چکی تھی، خالد بھائی اور ڈاکٹر مطلب نے کئی بار اس ساتھی کی تشویش ناک حالت کے بارے میں جیل حکام کو مطلع کیا لیکن کسی نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہ لیا، بلکہ مزید یہ ہوا کہ اس قیدی کو ہمارے کمرے سے نکال کر ایک علیحدہ بدبودار کمرے میں ڈال دیا گیا اور دوسرے قیدیوں پر یہ پابندی عائد کر دی کہ کوئی بھی اس مریض کے کمرے میں نہ جائے، سوائے کھانا دینے والے کے، وہ بھی کھانا رکھ کر فوراً باہر آ جائے، یہ مریض ہمارے ساتھ رہتا تھا تو ساتھی اس کی صفائی ستھرائی کا خیال کیا کرتے تھے تو اس کا دل لگا رہتا تھا اور وہ حوصلہ نہیں ہارتا تھا، جب اسے علیحدہ متعفن کمرے میں ڈال دیا گیا تو چند روز بعد وہ قیدی قید تنہائی ہی میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے شہید ہو گیا۔

طالبان کا قیدیوں کے ساتھ رویہ...... مسعودی افسر کی زبانی

بہارک جیل میں ایک چھوٹے درجے کا افسر تھا جس کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن ہم قیدی اس کی بھوری رنگت کی وجہ سے اسے ''چھوٹا بلا'' کہتے تھے، پہلے جب ہم بہارک جیل میں تھے تو یہ افسر قیدیوں کیلئے خونخوار آدمی بنا ہوا تھا اور قیدیوں پر ظلم وستم کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ

سے نہیں جانے دیتا تھا لیکن جب ہم قیدیوں کو دوسری بار بہارک جیل میں لایا گیا تو یہ افسر بہارک جیل میں موجود تھا لیکن اب وہ پہلے کی طرح خونخوار قسم کا آدمی نہیں تھا بلکہ ایک بدلا ہوا انسان نظر آیا، جو قیدیوں کا ہمدرد تھا، ہم اس خوشگوار تبدیلی پر حیران تھے چنانچہ ایک دن میں نے اور خالد بھائی نے اس سے مذاق کرنے والے انداز میں پوچھ ہی لیا کہ ''کماندان'' آج کل بڑے دھیمے ہو گئے ہو، کہیں طبیعت تو ناساز نہیں رہتی'' افسر نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ طبیعت تو میری پہلے خراب رہتی تھی، جب سے میں طالبان کے پاس قید اپنے قیدیوں کے پاس سے ہو کر آیا ہوں اس وقت سے میری طبیعت بالکل ہشاش بشاش ہو گئی ہے کیونکہ وہاں جا کر مجھے پتہ چلا کہ انسانیت اور مسلمانی کیا چیز ہے'' ہمارے استفسار پر اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا'' کچھ مہینے پہلے میں اپنے حکومتی وفد کے ساتھ طالبان کے پاس قید اپنے قیدیوں سے ملاقات کرنے قندھار گیا تو وہاں قیدیوں کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کیونکہ وہ ساتھی ہمیں قیدی معلوم ہی نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ طالبان کے خاص مہمان لگتے تھے، خوشحالی ان کے چہروں سے ٹپک رہی تھی، وہاں پر ہمارے قیدی بھائیوں نے بتایا کہ طالبان کی قید میں ہمیں جو آسائش اور سہولتیں میسر ہیں وہ تو ہمارے گھروں میں بھی میسر نہیں ہیں، انہوں نے مزید بتایا کہ ہر ہفتہ طالبان کے ایک ملا صاحب جیل میں آتے ہیں اور جو قیدی انہیں پریشان نظر آتا ہے اسے گاڑی میں بٹھا کر شہر لے جاتے ہیں اور خوب سیر وغیرہ کروانے کے بعد کئی گھنٹوں کے بعد واپس جیل میں لے آتے ہیں جس سے پریشان قیدی کی پریشانی جاتی رہتی ہے'' پھر اس نے انتہائی درد بھرے لہجے میں بولتے ہوئے کہا کہ اگر انسانیت ہے تو طالبان کے ہاں، ہمارے ہاں تو حیوانیت ہی حیوانیت ہے، لیکن سب کچھ جان چکنے کے باوجود بھی ہم مجبور ہیں، ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، ہماری آنکھوں پر تعصب کی سیاہ پٹی چڑھا دی گئی ہے جس نے ہماری قوم کو اندھا کر رکھا ہے، ہم لوگ حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس سے نظریں چرانے کی کوشش کرتے ہیں، افسر اپنے تبدیل شدہ خیالات و جذبات کا اظہار کر کے ایک طرف چلا گیا جبکہ میں اور خالد بھائی خوشگوار احساس کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔

انہی دنوں طالبان اور شمالی اتحاد کے مابین قیدیوں کے تبادلہ کے بارے میں مذاکرات

شروع ہوئے جس کے نتیجہ میں طالبان کے نمائندے پنجشیر میں اپنے قیدیوں سے ملنے آئے، طالبان کے نمائندوں نے اپنے ہر قیدی کو دو دو کپڑوں کے جوڑے اور نقد رقم دی جس سے تمام قیدی خوش حال ہو گئے، گوشت خرید کر کھانے لگے، گوشت کیلئے قیدی مل کر رقم قصاب کو دیتے جو بکرا وغیرہ جیل میں لا کر ذبح کر کے اور گوشت بنا کر دے جاتا علاوہ ازیں جیل میں ایک بڑی کینٹین بھی کھل گئی جہاں ضرورت کی ہر چیز ملنے لگی، تبادلہ کے مذاکرات کے دوران جیل حکام اور پہرہ دار ہم سے کوئی تعرض نہ کرتے۔

نمائندوں کے چلے جانے کے بعد جیل میں امیر المومنین کی طرف سے مقرر کردہ تمام طالبان قیدیوں کے امیر کمانڈر ملا مجاہد اخوند نے اپنے ذاتی مال سے مریض پاکستانی قیدیوں کو خصوصی طور پر نوازا، یہی نہیں کہ انہوں نے یہاں بہارک جیل میں پاکستانی قیدیوں کا خاص خیال رکھا بلکہ جب ہم دشتک جیل میں تھے تو اس وقت بھی کمانڈر ملا مجاہد نے خالد بھائی کو وہاں سے بلوا کر مریض قیدیوں کیلئے خاصی رقم بھجوائی تھی، یعنی جیل کی مشکلات کے باوجود اور دور رہتے ہوئے بھی وہ پاکستانی قیدیوں کو نہیں بھولے، غرضیکہ وہ ہر وقت پاکستانی قیدیوں کی دلجوئی کرتے رہتے اور جب بھی کوئی پاکستانی قیدی ان سے ملتا تو وہ خندہ پیشانی سے پیش آتے، اور تسلی دیتے کہ ہم جلدی آزاد ہونے والے ہیں۔

انہی دنوں دو مزید پاکستانیوں عبدالولی اور عبدالمالک کو گرفتار کر کے بہارک جیل میں لایا گیا، ان میں پہلا بلوچستان اور دوسرا کراچی کا رہنے والا تھا۔

پنجشیر کی مختلف جیلوں میں ساتھیوں نے تقریباً دو سال کا عرصہ نہایت وقار اور حوصلے کے ساتھ شیر وشکر رہتے ہوئے گزارا، تمام ساتھیوں میں ایثار، ہمدردی اور قربانی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، جبکہ ان میں سے چند ساتھی جذبۂ خدمت، ایثار اور ہمدردی کے اعتبار سے سب سے نمایاں تھے، ان ساتھیوں میں بھائی عبید اللہ شاہین، بھائی عبید اللہ سندھی، بھائی ابو عبیدہ، بھائی خالد ایرانی، بھائی رحمت اللہ اور بھائی بنیامین وغیرہ شامل ہیں، ان ساتھیوں نے اپنے اپنے طور پر قیدی ساتھیوں کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، میں چونکہ ایک ٹانگ کٹنے کی وجہ سے معذور ہو چکا تھا لیکن ساتھیوں نے خاص طور پر بھائی عبید اللہ

شاہین، عبید اللہ سندھی اور ابو عبیدہ نے کبھی بھی مجھے معذور ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا، بلکہ ان تینوں ساتھیوں نے ایک شفیق اور مہربان ماں کی طرح میری نگہداشت کی، اللہ تعالیٰ ان ساتھیوں اور دوسرے تمام ساتھیوں کو اجر عظیم عطا فرمائے، ایمان کی حلاوت نصیب فرمائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

آزادی کی عارضی خوشی

۱۵راگست ۱۹۹۸ء کی ایک صبح میں اور خالد بھائی دوکان والے کنٹینر کے ساتھ گپ شپ میں مصروف بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک افسر اپنے دفتر سے نکل کر ہماری طرف آیا اور کہنے لگا ''میں آپ کو خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ آپ لوگ آج آزاد ہو رہے ہیں'' خالد بھائی نے افسر سے کہا کہ کمانداان صاحب کیوں مذاق کرتے ہو۔اس نے قسم اٹھاتے ہوئے کہا قسم بخدا آپ لوگ آزاد ہو رہے ہیں، جاؤ اپنے ساتھیوں کو بھی یہ خوشخبری سناؤ اور جلدی جلدی تیاری کر لو کیونکہ کچھ ہی دیر بعد گاڑیاں آنے والی ہیں جن پر بٹھا کر آپ لوگوں کو کابل بھیج دیا جائے گا۔میں اور خالد بھائی انتہائی سرعت کے ساتھ کمرے میں پہنچے اور جاتے ہی ساتھیوں کو آزادی کی خوشخبری سنا دی لیکن کوئی بھی ساتھی ہماری اس بات کا اعتبار نہیں کر رہا تھا، دراصل اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی میں نے اپنی طرف سے ایک خبر ساتھیوں میں نشر کی تھی کہ ہم یوم آزادی پاکستان یعنی ۱۴راگست کو آزاد ہو رہے ہیں تو ساتھیوں نے آج کی اس خوشخبری کو بھی میری پھیلائی ہوئی خبر کا حصہ سمجھتے ہوئے مذاق کرنا شروع کر دیا، ساتھیوں کو یقین اس وقت آیا جب کچھ ہی دیر بعد جیل کے ایک مدیر نے آ کر قیدیوں کو آزادی کی خبر سناتے ہوئے کہا کہ جلدی جلدی تیار کر لو اور نئے کپڑے پہن لو۔

جیل میں پاکستانی قیدیوں کے ہال میں عید کا سا سماں پیدا ہو گیا، تمام قیدیوں نے نئے کپڑے پہن لئے، اپنا تمام فالتو سامان افغانی طالبان قیدیوں میں تقسیم کر دیا، ریڈ کراس کے دیئے ہوئے شناختی کارڈ جیل عملہ نے اپنے پاس جمع کر لیے، کچھ دیر بعد دو فوجی ٹرک ایک جیپ اور ایک ڈبل کیبن ڈالہ جیل میں پہنچ گیا، تمام پاکستانی قیدیوں کو ٹرکوں میں سوار کر دیا گیا جبکہ مجھے تین عرب ساتھیوں سمیت ڈبل کیبن گاڑی کے ڈالے میں بٹھا دیا گیا ہم سب

ساتھیوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی اور اس خوشی سے ہم سب پھولے نہیں سما رہے تھے۔

بہارک جیل سے جب قیدیوں کی گاڑیاں روانہ ہوئیں تو ساتھی راستے میں نظمیں پڑھتے ہوئے جا رہے تھے، ہمارے منہ اور ہاتھ کھلے ہوئے تھے ہر گاڑی میں صرف ایک ایک ہی پہرہ دار تھا، ہماری گاڑی جب چاریکار شہر میں پہنچی تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے کمانداان کے حکم سے گاڑی کو بازار میں روک دیا گیا جہاں سے غالباً اس نے کچھ خریدنا تھا، گاڑی کا رکنا تھا کہ چاریکار کے لوگ گاڑی کے گرد جمع ہو گئے اور ہمیں مغلظات بکنے لگے اور ہمیں گنوں کے بٹوں سے مارنے لگے، ایک بدبخت نے اتنی زور سے گن کا بٹ میرے کندھے پر مارا کہ میرا کندھا تڑختا ہوا محسوس ہونے لگا، صورتحال دیکھتے ہوئے گاڑی کا ڈرائیور کمانداان کے حکم سے گاڑی تیزی کے ساتھ وہاں سے نکال کر کابل روڈ پر لے آیا جہاں پر شمالی اتحاد کے جنرل بسم اللہ خان نے ہماری گاڑی والے کمانداان کو گاڑی سے نکال کر دو تین تھپڑ لگائے اور گالیاں دے کر بھگا دیا، ہماری گاڑیوں کا قافلہ تھوڑی دیر کے تعطل کے بعد کابل کی طرف محو سفر ہو گیا، جوں جوں گاڑیاں کابل کی طرف بڑھ رہی تھیں فرحت اور شادمانی کی عجیب سی کیفیت ہمارے اوپر طاری ہوتی جا رہی تھی، میں اپنے ذہن میں طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکاتا رہا، میں سوچ رہا تھا کہ جب ہم کابل میں پہنچیں گے تو ہمارے ساتھی ہمارے استقبال کیلئے کھڑے ہوں گے، ہمارے عزیز واقارب بھی کابل میں آ کر ہمارے منتظر ہوں گے، میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کابل پہنچ کر سب سے پہلے بہت زیادہ کھانا اور گوشت کھاؤں گا جسے ہم دو سال تک پنجشیر کی جیلوں میں ترستے رہے ہیں، مجھے خیالی دنیا سے حقیقی دنیا میں اس وقت واپس آنا پڑا جب ہماری گاڑی کابل روڈ چھوڑ کر بگرام کی طرف مڑی، پیچھے آنے والی دوسرے قیدی ساتھیوں کی گاڑیاں بھی ہماری گاڑی کی تقلید میں تھیں، ہم تمام ساتھی تشویش میں مبتلا ہو گئے کہ یہ کیا چکر ہے، آخر گاڑیاں بگرام ہوائی اڈے کی طرف کیوں جا رہی ہیں جبکہ کابل بگرام چوک سے صرف آدھے پونے گھنٹے کے فاصلہ پر تھا، ایسے میں ہمارا تشویش میں مبتلا ہونا ایک فطری سی بات تھی لیکن ہم ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے اور مختلف بہانوں سے خود کو بہلانے کی کوشش میں مصروف تھے، لیکن جلد ہی ہماری یہ خوش فہمی بھی اس وقت دور ہو گئی جب ہماری گاڑیاں بگرام ہوائی اڈے

میں داخل ہوئیں کیونکہ جیسے ہی گاڑیاں ہوائی اڈے میں داخل ہوئیں ہر طرف ہنگامی صورتحال کا سا سماں پیدا ہو گیا، ہر طرف کھٹک کھٹک کی آوازوں کے ساتھ گنوں کے بلٹ چڑھائے جانے لگے، ہوئی اڈے کی عمارتوں کے اوپر شمالی فوجیوں نے ہمیں نشانے پر لے کر پوزیشنیں سنبھال لیں اور مسلح فوجیوں نے ہماری گاڑیوں کو محاصرے میں لے لیا، ہمیں ایسے لگ رہا تھا جیسے ہر طرف سے ہمارے اوپر گولیاں برسا کر ہمیں بھون دیا جائے گا ایسی حالت میں ہر ساتھی قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا کہ دفعتاً شمالی اتحاد کے فوجی باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ مردار خور گِدھوں کی طرح گاڑیوں میں سہمے بیٹھے ہم قیدیوں پر جھپٹ پڑے اور زدو کوب کرنے لگے بعد ازاں ایک ایک قیدی کو اٹھا کر گاڑی سے نیچے پھینکنے لگے، نیچے کھڑے شمالی فوجی پھینکے گئے ساتھیوں کو ٹھڈوں اور مکوں سے مارتے ہوئے قریب موجود عمارت کی تنگ سی گیلری میں لے جا کر نائلون کی رسی سے ہاتھ پشت پر باندھ کر دوسری طرف کھڑے فوجی ٹرک میں ڈال دیتے، آزادی کی طرف جاتے جاتے اچانک جس افتاد میں ہم پڑ گئے تھے اس نے ہم تمام قیدیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا، مجھ سمیت تمام قیدیوں پر جس طرح کی غم و یاس کی کیفیت طاری تھی اسے نہ تو زبان بیان کر سکتی ہے اور نہ ہی قلم اس کیفیت کا نقشہ کھینچ سکتا ہے۔

میں اس امید پر بیٹھا ہوا تھا کہ شاید معذور ہونے کی وجہ سے شمالی فوجی میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ کر رہے ہیں، لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ ایسے بدبختوں سے بھلائی کی امید رکھنا ہی بیوقوفی ہے کیونکہ ایک شمالی فوجی نے میری بیساکھیاں چھین کر دور پھینک دیں اور مجھے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا، ایک ٹانگ کے ساتھ میں سنبھل نہ سکا اور منہ کے بل جا کر زمین پر گرا لیکن پھر بھی میں نے ہمت کر کے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کی کوشش کی اسی اثناء میں دو شمالی فوجیوں نے ٹھڈوں اور مکوں سے مجھے مارنا شروع کر دیا اور اسی طرح ٹھڈے مار مار کر فٹ بال کی طرح مجھے گیلری میں لے گئے جہاں پر میرے دونوں ہاتھ رسی کے ساتھ سختی سے باندھ دیئے اور ٹھوکریں لگاتے ہوئے گیلری کی دوسری طرف لے گئے اور اٹھا کر ٹرک میں پھینک دیا۔

طیارہ ہائی جیکنگ کا پلان

جس وقت شمالی اتحاد کے فوجی انتہائی بوکھلاہٹ اور افراتفری کے عالم میں قیدیوں کے ہاتھ باندھ کر ٹرک میں ٹھونس رہے تھے اس وقت ایک C130 طرز کا فوجی جہاز ہوائی اڈے پر اترا اور رن وے پر دوڑنے لگا اور بغیر رکے اسلحہ کی پیٹیاں جہاز سے نیچے پھینکی جانے لگیں، جہاز بغیر رکے سامان پھینک کر اسی رخ پر دوبارہ ہوا میں بلند ہونے لگا، جہاز انتہائی ایمر جنسی حالت میں اتارا گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ طالبان کے مورچے یہاں سے قریب تھے جو یہاں پر اترنے والے فوجی جہازوں کو نشانہ بناتے تھے، طالبان کی طرف سے داغے گئے توپوں کے گولے اکثر بگرام ہوائی اڈے پر گرتے رہتے تھے، اسی طرح ایک مرتبہ ایران سے گولہ بارود اور اسلحہ لے کر ایک جہاز جیسے ہی بگرام ہوئی اڈے پر اترا تو طالبان کی طرف سے پھینکے گئے گولے کا نشانہ بن گیا جس سے تمام اسلحہ اور گولہ بارود جہاز سمیت جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

اس وقت جو جہاز ہنگامی حالت میں اترا تھا اس میں دراصل شمالی اتحاد والوں نے ہمیں سوار کرانا تھا لیکن یہ جہاز اشارہ دینے کے باوجود بھی نہیں رکا، جہاز کو رکوانے کیلئے ایک کمانڈر نے ایک انتہائی احمقانہ حرکت بھی کی جس سے اکثر قیدی تکلیف میں ہونے کے باوجود بھی ہنس پڑے یعنی شمالی کمانڈر نے جہاز کو اشارہ دینے کیلئے پسٹل سے فائر کرنے شروع کر دیئے یہ سوچے بغیر کہ جہاز کی بہت زیادہ پر شور آواز میں پائلٹ پسٹل کے فائر کی آواز کیسے سن سکتا ہے؟ جہاز تو رکے بغیر چلا گیا لیکن ہم قیدیوں کو آدھی رات تک شمالی اتحاد والوں نے یہاں پر ٹرک میں بٹھائے رکھا، رات گئے ہمیں واپس جبل سراج میں لے جا کر زمین دوز جیل میں بند کر دیا گیا، جبل سراج کی جیل میں پہنچ کر خالد بھائی نے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ لوگ یقیناً قیدیوں کو ایران کے حوالے کر رہے ہیں اور یہ لوگ ہمیں ایران لے جانا چاہتے ہیں، چنانچہ قیدی ساتھیوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے آپس میں مشورہ کیا کہ موقع ملتے ہی طیارہ اغواء کر لیں گے، ایک تیز طرار ساتھی کو مقرر کر دیا گیا کہ پرواز کے دوران مناسب موقع پر وہ جیسے ہی اشارہ کرے تمام قیدی جہاز کے عملہ پر ٹوٹ پڑیں اور جہاز ہائی جیک کر کے کابل لے جائیں۔ان دنوں شمالی جنگجوؤں کی نقل و حرکت اور ان کے رویے سے ان کی بوکھلاہٹ صاف نظر آ رہی تھی،

جس کی وجہ یہ تھی کہ طالبان سبک رفتار پیش قدمی کرتے ہوئے شمالی افغانستان کے ایک بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لے چکے تھے، شبرغان، بلخ، مزار شریف، بامیان اور طالقان کو فتح کرنے کے بعد طالبان کے دستے طوفانی یلغار کرتے ہوئے پل خمری کے قریب اندراب سے گزر کر درہ پنجشیر کے عین وسط میں اترنے کیلیئے اس کے شمالی پہاڑوں پر اتر چکے تھے اور ان پہاڑوں کی آخری چوٹی پر معرکہ حق و باطل جاری تھا، ان پہاڑوں پر خطرناک سردی کا یہ عالم تھا کہ محض ایک رات میں ٹھنڈ لگنے سے ۱۰ کے قریب طالبان شہید ہو گئے۔ طالبان کی حیران کن فتوحات کی خبریں سن سن کر مسعودی فوجیوں میں مایوسی اور بددلی پھیل چکی تھی اور ان کا مورال تباہ ہو چکا تھا، پنجشیر کے کمانڈروں اور بڑے لوگوں نے طالبان کے خوف سے اپنے بیوی بچے اور مال واسباب تاجکستان اور ایران منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جس سے عوام میں بھی بددلی پھیل گئی اور ان کے حوصلے پست ہو گئے، خصوصاً جب طالبان نے وادی پنجشیر پر دباؤ بڑھانے کیلیئے تازہ کمک پہنچا دی اور اندراب سے گزر کر پنجشیر کی آخری چوٹی پر قبضہ کرنے کیلیئے فیصلہ کن معرکہ شروع کیا تو پنجشیر میں بھگدڑ مچ گئی اور پنجشیر پر خوف و ہراس کے بادل چھا گئے اور احمد شاہ مسعود قیدیوں کو ملک سے باہر کہیں منتقل کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ پنجشیر ہی آخری پناہ گاہ تھی جسے وہ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے اب وہ انہیں ہاتھ سے جاتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

پنجشیر میں ہماری ان اطلاعات اور خبروں کا ذریعہ جیل کے وہ افسر اور پہرے دار تھے جو ہر وقت چرس کے نشہ میں دھت رہتے تھے، نشے میں یہ لوگ اپنی حالت زار اور طالبان کی فتوحات کے بارے میں بھی ہمیں بتا دیتے تھے جس سے ہمیں بہت زیادہ خوشی اور طمانیت محسوس ہوتی۔

اگلے دن عصر سے کچھ پہلے ہماری مشکیں کس دی گئیں اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ہمیں دوبارہ بگرام کے ہوائی اڈے پر پہنچا دیا گیا جہاں ایک کی بجائے دو جہاز ہمارے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد اترے اور ہمیں جہازوں میں سوار کرایا جانے لگا، اگر یہ کہیں کہ ہم قیدیوں کو جہاز میں پھینکا جانے لگا تو زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ ہر قیدی کو ہاتھ اور پاؤں سے پکڑ کر شمالی فوجی اس طرح جہاز میں پھینکتے جیسے لکڑیاں پھینکی جاتی ہیں، ان جہازوں میں عورتوں اور بچوں کی بھی کچھ

تعداد سوار ہوئی تھی، غالباً یہ پنجشیری کمانڈروں اور اہل ثروت لوگوں کے اہل خانہ تھے، جو وادی پنجشیر پر جنگ کے بادل منڈلاتے دیکھ کر نقل مکانی کر رہے تھے، جہازوں نے اڑان بھری اور ہمیں لے کر فضا میں بلند ہو گئے، قیدیوں کے دو جہازوں میں تقسیم ہو جانے کی وجہ سے طیارہ ہائی جیکنگ کا ہمارا پلان دھرا کا دھرا رہ گیا اور ہم کچھ بھی نہ کر سکے، شمالی اتحاد کے حکام نے نادانستہ طور پر یا ہمارے جہاز اغواء کرنے کے پلان کی سن گن لینے کے بعد ہمیں دو جہازوں میں تقسیم کر دیا وگرنہ ہم 87 قیدی ایک ہی جہاز میں سما سکتے تھے۔ بھائی خالد ایرانی کو ہمارے ساتھ روانہ نہیں کیا گیا بلکہ اسے بگرام سے واپس پنجشیر جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز قیدیوں کو لے کر تاجکستان کے شہر دوشنبہ کے ہوائی اڈے پر اترے، ہم دو تین گھنٹے یہاں پر کھڑے جہازوں میں بند پڑے رہے پھر کہیں جا کر ہمیں ایک ایک کر کے جہاز سے اتارا گیا اور دور کھڑے ایک بڑے جہاز والوں کے سپرد کر دیا گیا، میں اپنی باری آنے تک انہی سوچوں میں گم تھا کہ اب پھر مجھے ٹھوکریں مار کر کسی فٹ بال کی طرح لے جایا جائے گا، کیونکہ بیساکھیوں کے بغیر تو میں چل ہی نہیں سکتا تھا اور پھر بگرام ہوائی اڈے پر پڑنے والی ٹھوکروں اور پٹائی نے مجھے ایک ٹانگ پر بھی کھڑا ہونے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، چنانچہ اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ رہی تھی لیکن جب مجھے گھسیٹ کر جہاز سے نیچے اتارا اور نئے میزبانوں کے سپرد کیا تو مجھے کچھ تسلی ہوئی کیونکہ نئے میزبانوں کے دو آدمی مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیتے ہوئے اپنے جہاز میں لے گئے اور آرام سے مجھے جہاز کے صاف ستھرے فرش پر بٹھا دیا، جب تمام قیدی اس جہاز میں سوار کرائے جا چکے تو تمام قیدیوں کو جہاز کے فرش کے ساتھ منسلک زنجیروں سے جکڑ دیا گیا اور ہماری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹیوں کو اتارے بغیر مخصوص قسم کی کپڑے کی بنی ہوئی عینکیں چڑھا دی گئیں، اس جہاز کا عملہ زبان سے بات بالکل نہیں کر رہا تھا بلکہ تالیاں بجا کر اور اشاروں سے ایک دوسرے کو مخاطب کر رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے ہم گونگوں کے ہتھے چڑھ گئے ہوں، کیونکہ ہم جتنا بھی ان کو مخاطب کرتے وہ زبان سے بالکل جواب نہیں دیتے تھے بلکہ مخاطب کرنے والے کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے اور اسے کندھے سے پکڑ کر متوجہ کرتے۔

چھٹا حصہ:

بند کرج جیل تہران ایران

جہاز والوں نے ہمارے ہاتھ جکڑے ہونے کی وجہ سے اپنے ہی ہاتھوں سے تمام قیدیوں کو بسکٹ کھلائے اور پانی پلایا، اس کے بعد جہاز میں مکمل خاموشی چھا گئی کیونکہ نشہ آور بسکٹوں کے زیر اثر تمام قیدی بے ہوشی کی گہری نیند سو چکے تھے حالانکہ رات سرد تھی اور سفر بھی لمبا تھا لیکن بے ہوشی کی وجہ سے نہ سفر کا پتہ چلا اور نہ ہی ہمیں ٹھنڈک کا احساس ہوا، تقریباً صبح کاذب کے وقت میزبانوں نے ہمیں جھنجھوڑ کے اٹھایا اور پانی پلایا ۔ بعد ازیں ایک ایک قیدی کو جہاز سے اتار کر قریب ہی کھڑی گاڑیوں میں لیجا کر بٹھا دیا، جس گاڑی میں قیدی پورے ہو جاتے وہ گاڑی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتی، آخر میں مجھے دو آدمیوں نے پکڑ کر جہاز سے اتارا اور تقریباً اٹھاتے ہوئے مجھے لے جا کر گاڑی میں بٹھا دیا، میرے علاوہ آخر میں بچ جانے والے دو تین مزید ساتھی بھی اس گاڑی میں سوار کرائے گئے تھے، گاڑی ہمیں لے کر روانہ ہوئی اور تقریباً نصف گھنٹہ بعد ایک عمارت میں جا داخل ہوئی، ہمیں گاڑی سے اتار کر نیچے زمین پر بٹھا دیا گے، میری آنکھوں پر چڑھی ہوئی پٹیاں چونکہ ڈھیلی ہو چکی تھیں اور کچھ نیچے سرک آئی تھیں اس لئے اوپر سے دیکھنے کی کچھ جگہ بن گئی تھی، چنانچہ میں نے کوشش کر کے اپنے سامنے دیکھا تو مجھے ایک نیلے رنگ کا لینڈ کروزر ڈالہ کھڑا نظر آیا جس پر تہران کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارے نئے میزبان ایرانی ہیں اور ہم اس وقت ایران کے دارالحکومت تہران میں موجود ہیں، کچھ دیر بعد ہمیں مختلف راہداریوں سے گزارتے ہوئے لے جا کر دو دو ساتھیوں کو 7/4 فٹ کی چھوٹی چھوٹی مگر صاف ستھری کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا، بند کرنے سے پہلے ہر قیدی کی جامہ تلاشی لی گئی اور جو کچھ ہماری جیبوں میں تھا نکال لیا گیا اور ہر قیدی کا سامان علیحدہ علیحدہ پیکٹوں میں ڈال کر اور اس پر قیدی کے کمرے کا نمبر لکھ کر انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا، کمروں میں بند کرنے سے پہلے تمام قیدیوں کے ہاتھ کھول دیئے گئے ،آنکھوں سے پٹیاں اتار کر کمروں سے باہر لٹکا دی گئیں، قضائے حاجت اور وضو کیلئے جب

کمروں سے باہر نکالا جاتا تو آنکھوں پر پٹیاں چڑھا دی جاتی تھیں۔

جب ایران جیل میں مجاہدین کی ڈاڑھیاں شہید کی گئیں

میرے ساتھ بھائی تاج الدین کو بند کیا گیا تھا جو رحیم یار خان کے رہنے والے تھے ہم کمرے میں پہنچتے ہی لمبی تان کر سو گئے اور نہ جانے کتنی دیر تک سوتے رہے، ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب پہریدار نے دروازہ کھٹکھٹایا، اس نے ہمیں کمرے سے باہر نکالا، آنکھوں پر کپڑے کے چشمے چڑھائے اور ہمیں لے کر ایک طرف چل پڑا اور ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا جہاں پہلے سے بھی کچھ قیدی ساتھی موجود تھے۔اس کمرے میں ہمارے احتجاج کرنے کے باوجود ہماری ڈاڑھیاں شہید کر دی گئیں اور سر گنجے کر دیئے گئے، کئی ساتھیوں نے ہاتھ پاؤں چلا کر ڈاڑھیاں بچانے کی کوشش کی، ایسے ساتھیوں کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر ان کی ڈاڑھیاں شہید کی گئیں، بعد ازیں پہریدار ہمیں واپس ہماری گیلری میں لے آیا اور وہاں پر موجود غسل خانوں میں ہمیں داخل کر دیا اور جیل کا لباس جو شرٹ اور ٹراؤزر پر مشتمل تھا دیتے ہوئے حکم دیا کہ اپنا اپنا لباس اتار کر غسل خانوں سے باہر پھینک دیں اور نہا کر جیل کا لباس پہن لیں۔

غسل خانوں میں شاور لگے ہوئے تھے، تولیے، صابن اور شیمپو بھی موجود تھے، میں نے یہاں پر دو سال بعد کھل کر گرم پانی کے ساتھ غسل کیا جس سے جسم تر و تازہ ہو گیا، جب میں اور تاج الدین اپنی بیرک میں پہنچے تو ایک دوسرے کی شکلوں کی طرف دیکھ کر بہت ہنسے اور پھر ڈاڑھیوں کے شہید ہو جانے کی وجہ سے زار و قطار رو دیئے۔

ایرانی جیل کے عملے نے پہلے چند روز ہمارے ساتھ زبان سے کوئی بات نہ کی، ہمارے سامنے وہ آپس میں بھی بات چیت نہیں کرتے تھے بلکہ اشاروں اور تالیوں سے کام چلاتے تھے اور جب بولنا شروع کیا تو اپنے آپ کو ایرانی ظاہر نہیں کرتے تھے، جب کبھی ہم ان سے پوچھتے کہ یہ کونسی جگہ ہے تو وہ ہمیں جواب میں کبھی کہتے کہ "یہ افغانستان ہی کا کوئی علاقہ ہے اور کبھی کہتے کہ یہ اسلام آباد ہے، ایرانیوں کی اس بیوقوفیوں پر ہمیں بڑی ہنسی آتی کیونکہ جیل میں جو چیزیں ہمیں استعمال کیلئے دی جاتیں چمچ، پلیٹیں، پانی کا جگ اور گلاس وغیرہ ان پر ساخت ایران

پاس دارانِ انقلاب لکھا ہوتا، علاوہ ازیں بیت الخلا اور غسل خانوں کی ٹونٹیوں، شیمپو اور صابنوں پر بھی ساخت ایران لکھا ہوتا تھا، غرضیکہ اس جیل کی ہر چیز یہ ظاہر کرتی تھی کہ یہ ایران ہے، لیکن جیل کا عملہ بہت دنوں تک یہی کہتا رہا کہ یہ ایران نہیں ہے۔

اس جیل میں کھانے پینے اور وضو وغیرہ کے معمولات کچھ اس طرح تھے کہ صبح فجر کے پہلے وقت میں ہمیں وضو کے لئے نکالا جاتا، کمروں سے نکالتے وقت آنکھوں پر پٹیاں ضرور چڑھائی جاتیں، اس کے بعد صبح آٹھ بجے ناشتہ دیا جاتا، ناشتہ میں (ہر کمرے کے دروازے میں اوپر نیچے دو سوراخ تھے، نیچے والے سوراخ سے کھانا وغیرہ دیا جاتا جبکہ اوپر والے سوراخ سے عملہ کے لوگ قیدیوں پر نظر رکھتے تھے) روزانہ میٹھا قہوہ، ترش پنیر اور روٹی ہوتی، دوپہر کے ۱۲ بجے پھر دروازے باری باری کھولے جاتے اور قیدیوں کو ظہر کے وضو وغیرہ کیلئے نکالا جاتا، پھر ایک بجے دوپہر کا کھانا ملتا، دوپہر کو روزانہ ہم قیدیوں کو کھانے میں پلاؤ دیا جاتا، یہ پلاؤ روزانہ ایک ہی طرح کا نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر روز مختلف قسم کا پلاؤ ہوتا تھا، کبھی کباب پلاؤ، کبھی مرغ پلاؤ اور کبھی تاجکی پلاؤ، عصر کے وضو کیلئے ہمیں نہیں نکالا جاتا تھا کیونکہ شیعہ عصر کے وقت کی نماز نہیں پڑھتے، پھر مغرب کے وقت وضو وغیرہ کیلئے ہمیں نکالا جاتا اس کے فوراً بعد رات کا کھانا دے دیا جاتا جو ہر رات مختلف ایرانی ڈشوں پر مشتمل ہوتا، ایرانی جیل میں ملنے والا کھانا شمالی اتحاد کی جیلوں کے کھانوں سے 100 فی صد بہتر تھا، یہی وجہ تھی کہ ایرانی جیل میں 5 مہینے کے عرصے میں تمام قیدی صحت مند اور سرخ و سپید ہو گئے، رات 9 بجے پھر ہمیں بیت الخلاء جانے کیلئے نکالا جاتا، ہر قیدی کو ٹوتھ برش دیئے گئے تھے، جبکہ ٹوتھ پیسٹ باتھ روم کے بیسن پر رکھی ہوتی تھی، ہر قیدی پر سونے سے پہلے جب رات 9 بجے باہر نکالا جاتا تھا تو دانتوں کی صفائی کرنا لازمی تھا لیکن اس دوران عشاء کی نماز کیلئے وضو نہیں کرنے دیتے تھے بلکہ اگر کسی قیدی کو اس وقت چھپ کر وضو کرتے ایرانی پہریدار دیکھ لیتے تو دور ہی سے وضو حرام، وضو حرام کا شور کرنا شروع کر دیتے اور وضو کرنے والے قیدی کو وضو سے ہٹا دیتے تھے۔

ایران کی جیل میں پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی قیدیوں کی تفتیش شروع ہو گئی، جس کمرے میں تفتیش کیلئے قیدیوں کو لے جایا جاتا تھا اس کمرے کے باہر دو بڑی تختیاں آویزاں تھیں جن

میں سے ایک پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا ''اینجا خدا وجود نہ دارد'' (نعوذ باللہ من ذالک) یعنی یہاں تفتیش والی جگہ پر خدا موجود نہیں ہے، یہاں خدا بھی تمہاری مدد نہیں کر سکتا، ''استغفر اللہ'' جبکہ دوسری تختی پر انڈا دیتے ہوئے نرمرغ کی تصویر بنی ہوئی تھی اور یہ لکھا ہوا تھا کہ ''اینجا از مرغ نر ہم تخم مے کشم'' یعنی ہم یہاں نرمرغ تک سے بھی انڈا نکلوا لیتے ہیں، تفتیش کار صاف اردو بولتے تھے یہ تفتیش کار قیدی کا نام پتہ لکھنے کے بعد اس سے پوچھتے کہ تم افغانستان میں کیوں آئے تھے؟ اور کب آئے تھے؟ اور تمہارا پاک فوج میں کیا عہدہ ہے؟ قیدی لاکھ کہتے کہ طالب علم ہیں اور پاکستان کی فوج کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ لوگ ہماری بات ماننے پر تیار نہ ہوتے، اس کے علاوہ جو سوال وہ اکثر قیدیوں سے کرتے تھے وہ یہ تھا کہ سپاہ صحابہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟

ایرانیوں کی بے حیائی

ہم ایران کے دارلحکومت تہران میں پانچ ماہ قید رہے۔ یہ جیل چونکہ مکمل طور پر بند تھی اس لئے دن رات کا بالکل پتہ نہیں چلتا تھا۔ یہاں ہر وقت بلبوں ہی کی روشنی ہوتی تھی۔ پانچ ماہ تک ہم سورج کی روشنی اور آسمان دیکھنے سے محروم رہے۔ اس جیل میں ہمیں ایرانی حکومت نے باہر کی دنیا سے مکمل طور پر پوشیدہ اور چھپا کر رکھا ہوا تھا، اس لئے یہاں پر جیل میں کوئی صحافی یا ریڈ کراس کا کوئی نمائندہ نہیں آسکتا تھا، ایک مرتبہ ہمیں ریڈ کراس کے عملہ نے ایران میں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ایرانی حکومت نے انہیں ہمارے بارے میں پتہ ہی نہ چلنے دیا ان باتوں کا ہمیں تخار میں جا کر اس وقت پتہ چلا جب ریڈ کراس والوں نے ہمیں اس معاملہ کی ساری تفصیل بتائی۔

جب قیدیوں کو وضو کیلئے نکالا جاتا تو جیل کے ملازمین اس دوران قیدیوں کے کمروں کی تلاشی لیتے اور صفائی کر دیتے، ایرانی اکثر نفاست پسند واقع ہوئے تھے، جیل میں بھی صفائی کا بہت ہی عمدہ نظام تھا بلکہ ان کا صفائی کا نظام اور بندوبست مبالغہ کی حد کو پہنچا ہوا تھا، ہمارے چھوٹے چھوٹے کمروں میں کوئی خاص سرگرمی یا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے گند پڑتا لیکن پھر بھی ہمارے کمروں کی ہر روز بلاناغہ صفائی ضرور کرتے اور ہم ان کی مبالغہ کی حد کو پہنچی ہوئی

صفائی کی عادت سے عاجز آچکے تھے کیونکہ جیل کا عملہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی صفائی کا پہلو نکالتا، یہاں تک کہ قیدیوں کے کسی کمرے میں عملہ کے کسی فرد کو ایک بال بھی نظر آجاتا تو اس پر بھی وہ قیدیوں کی سرزنش کرتے کہ یہ بال یہاں کیوں پڑا ہے، ہر ہفتے ہم قیدیوں کو غسل کرنا اور دھلے ہوئے کپڑے جو جیل والے ہر ہفتے ہمیں دیتے تھے وہ پہلے والے کپڑوں سے بدلنا لازمی تھا، جیل میں اگر کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو جیل کا عملہ پہلے تو جیل میں ہی چھوٹی موٹی دوائیاں دے کر اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا اور اگر اس طرح کوئی مریض صحت مند نہ ہوتا تو اسے بند وین میں بٹھا کر اور آنکھوں پر پٹیاں چڑھا کر تہران شہر میں کہیں موجود ملٹری ہسپتال میں لے جاتے، ایک دن مجھے بھی گردے کی تکلیف کی وجہ سے ہسپتال لے جایا گیا، جب میں ہسپتال پہنچا تو میری آنکھیں کھول دی گئیں اور ہاتھوں میں ڈالی ہوئی ہتھکڑیاں بھی اتار دی گئیں، خفیہ ایجنسی کا اہلکار مجھے ڈاکٹر کے پاس معائنہ کیلئے لے گیا، ڈاکٹر نے معائنہ کر کے دوائیاں لکھ دیں، ایجنسی کے اہلکار نے نسخہ ساتھ آئے ہوئے پہریدار کو دیا جو نسخہ لے کر چلا گیا اور ہم باہر آکر بیٹھ گئے، میرے ساتھ آیا ہوا ایجنسی کا اہلکار شوخ مزاج قسم کا آدمی تھا یا یہ اس کے پیشے کی فنکاری تھی کہ اس نے دو تین خوبرو نرسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ''دیکھو یہ کیسی خوبصورت لڑکیاں ہیں، ایسا حسن تم نے کبھی دیکھا ہے''

اس نے صرف بات ہی نہیں کی بلکہ لڑکیوں کو اپنے پاس بھی بلا لیا اور دانت نکالتے ہوئے لڑکیوں سے کہنے لگا کہ یہ قیدی کئی سالوں سے قید ہے اور تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔ میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا اور سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا جبکہ لڑکیاں اس اہلکار کے جواب میں کہہ رہی تھیں کہ ''ضرور ضرور...... ہم سب اس قیدی سے دوستی کرنے کو تیار ہیں اگر یہ چاہے۔ پھر ان میں سے ایک لڑکی نے ڈائریکٹ مجھے مخاطب کرتے ہوئے انتہائی شوخی سے کہا ''کیوں حاجی آغا (ایرانی ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے حاجی آغا کہتے ہیں) کرو گے ہم سے دوستی'' مجھے شرم بھی بہت آرہی تھی اور غصہ بھی کہ ایک طرف تو یہ قوم اسلام کا لبادہ اوڑھے اس چیز کی دعوے دار ہے کہ دنیا میں اسلام اور اسلامی روایات صرف ایران میں ہیں اور دوسری طرف اتنی بے حیائی اور بے شرمی اور وہ بھی ''اسلامی حکومت'' کے اہلکاروں میں۔ بہر حال میں

نے ان کو جواب دیتے ہوئے کہا ''ہم ایسی چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور نہ اسلام ہمیں ایسی خرافات کی اجازت دیتا ہے'' اس پر ایک لڑکی نے جواب دیتے ہوئے کہا ''حاجی آغا آپ کی مرضی'' یہ کہہ کر لڑکیاں چلی گئیں، اتنے میں پہرے دار بھی دوائیاں لے کر واپس آ گیا، چنانچہ یہ لوگ میری آنکھیں باندھ کر اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر واپس جیل میں لے آئے۔ اس جیل میں یہ بھی دستور تھا کہ دوائیاں مریضوں کو نہیں دی جاتی تھیں بلکہ جیل کا اہلکار مقرر تھا جو دوائیوں کے مقررہ اوقات میں بیمار قیدیوں کے پاس جا کر انہیں خود اپنے ہاتھ سے دوائی دیتا تھا۔

قیدیوں کو مہینے میں دو تین مرتبہ ٹہلنے کیلئے ایک چھوٹے سے صحن میں لے جایا جاتا جو چاروں طرف سے بند ہوتا تھا جبکہ اوپر چھت کی جگہ بڑے بڑے سوراخوں والا جنگلا لگا ہوا تھا، ٹہلنے کیلئے بھی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لے جایا جاتا تھا، 20، 25 قیدیوں کی قطار بنا کر آدھے گھنٹے کیلئے ٹہلایا جاتا وہ اس طرح کہ ایک فوجی سب سے آگے والے قیدی کا ہاتھ پکڑ کر چلتا باقی قیدی ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے پیچھے چلتے رہتے، تین مہینوں بعد ہم قیدیوں کو اسی ترتیب سے بڑے صحن میں ٹہلنے کیلئے لیجایا جانے لگا۔

ایرانی جیل میں کچھ ساتھیوں کو پہرداروں کی طرف سے روز و شب اذکار کے کتابچے دیئے گئے جن میں ہر ذکر کی ابتداء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اوپر تبرّا سے ہوتی اور اس کو ذکر کا لازمی جزو لکھا ہوتا تھا جس کی وجہ سے ساتھی اکثر پہریداروں سے الجھ پڑتے تھے اور ان کو کھری کھری سناتے، اسی طرح ایک پہرے دار ایک قیدی ساتھی کے ساتھ بات کرنے والی کھڑکی سے بحث کر رہا تھا جب پہریدار نے اپنی گندی زبان سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں گستاخی شروع کی تو قیدی ساتھی نے دروازے کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پہریدار کا گریبان پکڑ لیا اور زور زور سے اس کا سر دروازہ سے مارنا شروع کر دیا جس سے پہریدار سخت اذیت میں مبتلا ہو گیا اور زور زور سے دوسرے پہریداروں کو مدد کیلئے پکارنے لگا، چنانچہ قریب ہی موجود دوسرے پہریداروں نے آ کر اپنے ساتھی کو آزاد کرایا اور قیدی ساتھی کو باہر نکال کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی، جیل میں ہم قیدیوں کو جو قرآن پاک کافی مطالبہ کے بعد مہیا کئے گئے

تھے ان میں جا بجا آیات کاٹی ہوئیں تھیں، ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ شیعوں کی طرف سے یہ قرآن میں تحریف کی کوشش ہے، ہم نے ان کے اس کرتوت پر خوب احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ ہمیں تاج کمپنی کے شائع کردہ قرآن کے نسخے مہیا کیے جائیں، پھر کہیں جا کے قرآن کریم کے صحیح نسخے ہمیں دستیاب ہوئے۔

بھوک ہڑتال اور جیل سے فرار کا منصوبہ

ایرانی حکومت اور وہاں کے شیعوں کے ظاہر اور باطن میں زمین آسمان کا فرق ہے، ظاہراً اسلام اسلام کرتے نہیں تھکتے جبکہ اندر سے دجالی پالیسیوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور اسلام کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کرنے کی کوشش میں دن رات مصروف ہیں اسی طرح ان ایرانیوں کی مبالغہ کی حد کو پہنچی ہوئی صفائی کی عادت کا بھی یہی حال ہے، ایک طرف ڈاڑھیاں کاٹ دیتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے تھے کہ بند رہنے کی وجہ سے ڈاڑھیوں میں گندگی پیدا ہو جاتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ وہ لوگ اس معاملہ میں نبی کریم ﷺ کی گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے، جبکہ دوسری طرف ہم قیدی مسلسل تین مہینے تک چیختے رہے کہ ہمیں اپنے جسم کی صفائی کیلئے ریزر مہیا کیے جائیں لیکن تین مہینے تک انہوں نے ہماری اس حقیقی صفائی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، ہم قیدی اس معاملہ میں انتہائی پریشانی اور تکلیف کا شکار تھے، ایک قیدی ساتھی نے آخر تنگ آ کر ایک عجیب حرکت کی جو اخلاقی لحاظ سے تو لکھنے کے قابل نہیں ہے، لیکن لکھنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ تمام قیدی اس حالت میں کتنے مجبور ہو چکے تھے، اس قیدی نے ایک دن اپنے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر جیلر کو بلایا جب جیلر نے اس ساتھی کے دروازہ کی کھڑکی کھول کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا "ہاں.. کیا بات ہے؟ تو اس ساتھی نے جیلر سے پوچھا کہ ہماری ڈاڑھیاں کیوں کاٹتے ہو" تو جیلر نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "آپ کی صفائی کیلئے" اس پر اس ساتھی نے اچانک اپنا ٹراؤزر نیچے کرتے ہوئے جیلر سے کہا "یہاں تمہیں صفائی کا خیال نہیں آتا جس کیلئے ہم تین مہینوں سے مسلسل چیخ رہے ہیں" اس پر جیلر نے شرمندہ ہوتے ہوئے کھڑکی بند کر دی اور وہاں سے چلا گیا۔

تین ماہ بعد بہت زیادہ واویلہ اور احتجاج کرنے پر کہیں جا کر جیل حکام نے ہم قیدیوں کو الیکٹرک ریزر مہیا کی تو ہمیں کچھ سکھ کا سانس نصیب ہوا۔ ہمارے پرزور احتجاج، منت سماجت اور آہ وزاری کے باوجود دوسری بار پھر ہماری ڈاڑھیاں کاٹ دی گئیں جس کی وجہ سے ہم تمام قیدی کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے چنانچہ تمام قیدیوں نے متفقہ طور پر بھوک ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا، پہلے پہل بھوک ہڑتال کی تجویز چند ساتھیوں کو سوجھی تھی، ان ساتھیوں نے دوسرے قیدیوں کو مطلع کرنے کیلئے دو کام کیے، اوّل بیت الخلاؤں میں ان ساتھیوں نے بھوک ہڑتال کرنے کا پیغام لکھ دیا، دوم بیت الخلاء میں جاتے ہوئے دوسرے قیدیوں کے کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آواز لگاتے جاتے کہ ''بھوک ہڑتال کرنی ہے تاکہ آئندہ ڈاڑھیاں نہ مونڈھی جائیں، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے بھوک ہڑتال کا پیغام تمام قیدیوں تک پہنچ گیا اور تمام قیدیوں نے متفقہ طور پر بھوک ہڑتال کر دی جس سے جیل کے عملہ میں کھلبلی مچ گئی، چونکہ احمد شاہ مسعود نے ہمیں بطور امانت ایران کے حوالے کیا تھا اس لئے ان میں تشویش کا پیدا ہونا فطری بات تھی۔

جیل کے عملہ نے پہلے دن جب دیکھا کہ کوئی بھی قیدی کھانا کھانے پر تیار نہیں ہے تو ابتدائی طور پر انہوں نے یہ کیا کہ ایک ایک قیدی کو کوٹھڑیوں سے نکال کر اپنے آفس روم میں لے جاتے اور کھانا کھانے کیلئے کہتے اور ڈراتے دھمکاتے اور یہ بھی کہتے کہ ''تم کھانا کھا لو تمہیں کونسا کوئی تمہارا ساتھی دیکھ رہا ہے لیکن کوئی قیدی بھی کھانے کو ہاتھ لگانے کیلئے تیار نہ ہوا۔ جیل کے عملہ کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا تو انہوں نے اعلیٰ حکام کو اس معاملہ کی اطلاع کر دی اور ساتھ ہی ایک اور حیلہ شروع کر دیا یعنی جیل کے افسروں نے قیدیوں کے کمروں میں جا کر تبلیغات شروع کر دیں، جیل کا ایک افسر ہمارے پاس بھی آیا اور دروازے کی کھڑکی کھول کر ہمیں درس دینے لگا، اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ ''آپ تو سمجھ دار ہیں آپ اپنے ساتھیوں کو سمجھائیں کہ خود کو اذیت دینا اسلام میں حرام ہے'' میں نے اس افسر سے پوچھا کہ آپ لوگ ہماری ڈاڑھیاں کیوں کاٹتے ہیں؟ اس پر افسر نے جواب دیا کہ ہمارے ڈاکٹروں کا حکم ہے کہ جیل میں بند لوگوں کی ڈاڑھیاں مونڈھ دی جائیں تاکہ قیدیوں میں صفائی رہے اور قیدی

بیماریوں سے بچے رہیں، میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں مذہبی معاملات میں کسی ڈاکٹر یا سکالر سے ڈکٹیشن لینے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے لئے پیغمبر اسلام ﷺ کے فرامین اور طریقے کافی ہیں اور یہی ہمارا ایمان ہے اس سے نہ ہم ہٹ سکتے ہیں اور نہ کوئی طاقت ہمیں اس سے ہٹا سکتی ہے ان شاء اللہ، اس پر اس فوجی افسر نے شقاوت قلبی کی انتہا کرتے ہوئے بظاہر نا صحانہ انداز میں کہا کہ (نقل کفر کفر نہ باشد) ''برادرِ محترم (نعوذ باللہ من ذالك) ڈاڑھی کے بارے میں پیغمبر ﷺ کے جس قول اور حکم کی تم بات کرتے ہو وہ چودہ سو سال پرانی بات ہے جس کا اس موجودہ دور میں کوئی اعتبار نہیں بلکہ اس وقت ڈاکٹروں کا قول (نعوذ باللہ) بہتر ہے'' میں نے اس ملعون کو دو ٹوک الفاظ میں کہا ''تم کفر بک رہے ہو اس لئے ہم تم سے مزید بات نہیں کریں گے اور نہ ہی اس وقت تک بھوک ہڑتال ختم کریں گے جب تک ہمیں آئندہ ہماری ڈاڑھیاں نہ مونڈھنے کا یقین نہ دلایا جائے۔

جب جیل حکام کے بھوک ہڑتال ختم کرانے کے تمام حربے ناکام ہو گئے تو تیسرے دن متعلقہ اعلیٰ حکومتی وفد جیل میں آن وارد ہوا، انہوں نے قیدیوں کے ساتھ مذاکرات کے مختلف دور کیے اور ہم قیدیوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی لیکن ہم قیدیوں کو کسی طور پر بھی بھوک ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ نہ کر سکے، آخر کار حق غالب آ گیا اور باطل گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا، اور ہمارا مطالبہ مان لیا گیا، اس ثابت قدمی پر ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کیونکہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی عطا کردہ توفیق سے تھا۔

جیل سے فرار کے خیالی پلاؤ تو ہر قیدی اپنی جگہ پکا تا رہتا تھا لیکن کچھ ساتھیوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر ڈالی ،ان ساتھیوں نے پہلے پہرہ داروں کے آنے جانے کے اوقات اور کمروں کی چابیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں ،اس کے بعد ان ساتھیوں نے اضافی کپڑوں کی جو وہ غسل خانوں سے چھپا کر اپنے کمروں میں لے آتے تھے رسیاں بنا لیں ان ساتھیوں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے مطابق پہلے مرحلہ میں جیل پر قبضہ کرنا تھا وہ اس طرح کہ پیشاب کے بہانے چند قیدی یک بارگی باہر نکلیں گے اور موقع پا کر پہرہ داروں کو قابو کر کے باندھ دیں گے اسکے بعد تمام قیدیوں کو کمروں سے باہر نکال لیا جانا تھا بعد

ازیں کپڑوں سے بنائی گئی رسیوں کی مدد سے جیل کی دیواریں پھلانگ کر جیل سے فرار ہو جانا تھا لیکن جلد ہی یہ منصوبہ اس وقت فاش ہو گیا جب صفائی کے دوران جیل کے عملہ نے کمروں سے رسیاں برآمد کر لیں، بس پھر کیا تھا تفتیش شروع ہو گئی اور چار قیدیوں کو سخت سزا دی گئی، اس طرح فرار کا یہ منصوبہ ناکام ہو کر اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

تہران جیل کا عملہ ہم قیدیوں کی خوش مزاجی اور ہشاش بشاش رہنے پر متعجب رہتا تھا جس کا وہ اکثر اظہار بھی کرتے رہتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ یہ ایران کی خطرناک ترین جیل ہے یہاں پر بڑے بڑے سورما بھی آ کر بکری بن جاتے ہیں اور کسی کو یہاں پر سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی لیکن طالبان قیدی ایسے ہیں جیسے یہاں پکنک منانے آئے ہوں اور ایسے لگتا ہے جیسے انہیں اپنے قیدی ہونے کا کچھ غم نہ ہو، اس راز کو ابنِ سبا کی روحانی اولاد قیامت تک نہیں پا سکتی اس راز کو وہی لوگ جانتے ہیں جو اپنی حقیر جانیں اپنے اللہ کے ہاتھوں جنت کے بدلے میں بیچ چکے ہیں۔

افغانستان میں دوستم کے علاقہ شبرغان جیل سے کچھ پاکستانی اور افغانی قیدیوں کو بھی تہران جیل میں منتقل کیا گیا تھا ان میں سے ایک ایسا سادہ افغانی طالبان قیدی بھی تھا جس نے کبھی شہر کی سہولیات نہیں دیکھی تھیں، جب یہ لوگ تہران جیل میں پہنچے تو یہ متذکرہ قیدی پہلے دن مسلسل پریشان اور تکلیف میں رہا، پورا دن گزرنے کے بعد اس کے ساتھ والے قیدیوں نے اس سے تکلیف اور پریشانی کی وجہ پوچھی، پہلے تو وہ ساتھی شرم کی وجہ سے ٹال مٹول کرتا رہا جب اس کے ساتھیوں نے اصرار کیا تو اس ساتھی نے شرماتے ہوئے بتایا کہ اس جیل میں بیت الخلاء نہیں ہیں اور پیشاب وغیرہ نہ کرنے کی وجہ سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے، اس پر اس قیدی کے ساتھیوں نے بتایا کہ صبح سے اب تک ہم لوگ تین بار بیت الخلاء جا چکے ہیں اور تمہیں بھی پہرے دار تمہاری باری پر تین بار ہی بیت الخلاء اور وضو کیلئے لے گئے تھے، اس نے جواب دیا کہ وہاں وضو کیلئے تو جگہ تھی لیکن بیت الخلاء نہیں تھا اور اب تکلیف سے میری جان نکلی جا رہی ہے، ایک قیدی نے دروازہ کھٹکھٹایا پہریدار کو بلایا اور اسے بتایا کہ اس قیدی کو تکلیف ہے یہ بیت الخلاء جانا چاہتا ہے اس ساتھی نے پہریدار کو مزید کہا کہ اس ساتھی کو تکلیف زیادہ ہے اس

لئے میں اس کے ساتھ بیت الخلاء جانا چاہتا ہوں تا کہ یہ کہیں گر نہ پڑے (دراصل یہ ساتھی سمجھ چکے تھے کہ اس قیدی نے ایسے فلش سسٹم والے ٹائلٹ بیت الخلاء کبھی نہیں دیکھے تھے، اسی وجہ سے وہ سنگ مرمر سے مزین بیت الخلاء کو بیت الخلاء نہیں سمجھ رہا تھا) پہرے دار نے دونوں کو جانے کی اجازت دے دی، یہ ساتھی پریشان حال قیدی کو قریب ہی راہداری کے آخر میں موجود بیت الخلاء لے گیا اور اس ساتھی کو بتایا کہ یہ بیت الخلاء ہے اور فلش پر بیٹھنے کا طریقہ بھی بتا دیا، اس پر اس سادہ قیدی نے حیران ہوتے ہوئے کہا کہ ''میں آج تین بار پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں لیکن یہ مجھے بیت الخلاء نہیں لگتے کیونکہ ہمارا تو گھر بھی اتنا خوبصورت نہیں ہے جتنے یہ بیت الخلاء خوبصورت ہیں، اس کے ساتھ جانے والے قیدی کے بار بار کہنے اور قسمیں اٹھانے پر اس سادہ قیدی کو کہیں جا کر یقین آیا کہ یہ بیت الخلاء ہی ہیں۔

یہ سادگی کوئی اچنبھے کی بات نہیں کیونکہ اس طرح کی سادگی کے مظاہرے ہم پنجشیر جیل میں بھی کئی مرتبہ دیکھ چکے تھے، پنجشیر کی دشتک جیل میں ایک پہریدار تھا جو کہ اکثر ہم سے پوچھا کرتا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا انسان ہے جو روزانہ ایک سیب خرید کر کھانے کی حیثیت رکھتا ہو اور پھر بڑے فخر سے یہ پہریدار یہ بھی کہا کرتا تھا کہ سیب جیسا پھل صرف پنجشیر ہی میں ہوتا ہے، یہ افغانی لوگوں کی سادگی کے دو نمونے ہیں ورنہ افغانستان میں جا بجا ایسے سادہ لوگ ملتے ہیں جو اپنی چھوٹی سی دنیا ہی کو کل کائنات سمجھتے ہیں اور اسی میں وہ خوش رہتے ہیں۔

تہران جیل میں قید کے پانچویں ماہ ہم قیدیوں کو جزوی طور پر ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت دے دی گئی اور سختی نسبتاً کچھ کم ہو گئی، پہریدار قیدی کو دوسرے قیدیوں کے کمروں کے سامنے کھڑا کر کے آنکھوں کی پٹی ڈھیلی کر دیتے، اس طرح قیدی ایک دوسرے کا حال پوچھ لیتے تھے اور مختصر گپ شپ لگا لیتے تھے۔

تہران جیل میں قید ہمیں پورے پانچ ماہ ہو چکے تھے کہ ایک دن ایک ایرانی افسر نے ہمیں ہمارے کمروں میں آ کر بتایا کہ آپ قیدیوں کو رہا کیا جا رہا ہے چنانچہ ہمارے وہ کپڑے جو تہران جیل میں پہنچتے ہی اتروا لیے گئے تھے واپس ہمیں لوٹا دیے گئے، ہم نے جیل کا لباس اتار کر اپنے شلوار قمیص زیب تن کئے اور ایک اور ''آزادی'' کے سفر کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار

کر کے بیٹھ گئے۔

ایک اور ''آزادی'' کا سفر

اگلے دن ہماری آنکھوں پر پٹیاں چڑھا کر اور ہاتھ پشت پر باندھ کر ہمیں گاڑیوں میں سوار کر دیا، ایرانیوں نے میرے ساتھ احسان کیا کہ میرے ہاتھ نہیں باندھے اور بڑے آرام سے مجھے گاڑی میں لے جا کر بٹھایا، کچھ دیر کے سفر کے بعد گاڑیاں قیدیوں کو لے کر تہران کے ہوائی اڈے پر جا پہنچی جہاں پر ہم قیدیوں کو گاڑیوں سے اتار کر صاف ستھرے مگر سنسان لاؤنج میں لے جا کر قطاروں میں بٹھا دیا گیا، تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم تمام قیدیوں کو ایک بڑے فوجی جہاز میں سوار کرا دیا گیا، جب تمام قیدی جہاز میں موجود لوہے کی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو ایرانی کمانڈوز نے نائیلون کی پٹیوں سے بنا ہوا بہت بڑا جال قیدیوں کے اوپر پھیلا دیا اور تمام قیدیوں کی گردنیں جال کے بڑے سوراخوں کے اندر پھنسا دی گئیں، کوئی قیدی تھوڑا سا بھی سر ہلاتا تو جہاز کے آخری اونچے کونے میں بیٹھا ہوا ایرانی کمانڈو جال کی رسی کھینچ دیتا جس سے تمام قیدی انتہائی تکلیف کا شکار ہو جاتے۔

ڈیڑھ دو گھنٹوں کی پرواز کے بعد جہاز قیدیوں کو لے کر تاجکستان کے سرحدی شہر کولاب کے ہوائی اڈے پر جا اترا جہاں پر پنجشیری درندے ہمیں وصول کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھے چنانچہ ایرانیوں نے ہمیں شمالی اتحاد کے پنجشیریوں کے حوالے کر دیا گویا کہ ایران والوں نے احمد شاہ مسعود کی امانت اسے واپس لوٹا دی۔ شمالی اتحاد والوں نے ہمیں وصول کرتے ہی ٹھڈوں، مکوں اور کلاشنکوف کے بٹوں کے ساتھ ہماری تواضع شروع کر دی اور ہم قیدیوں کو وحشیانہ انداز میں گھسیٹ کر ہیلی کاپٹروں میں ٹھونس دیا۔ ہیلی کاپٹر قیدیوں کو لے کر اڑے اور شام کے وقت افغانستان کے شمالی صوبہ طالقان کے ضلع فرخار کے ایک گاؤں لڑ دہ میں جا اترے۔ لڑ دہ جیل ہم قیدیوں کے لیے پہلے سے ہی آراستہ تھی چنانچہ لڑ دہ پہنچتے ہی ہمیں جیل میں دھکیل دیا گیا۔

☆☆☆☆

ساتواں حصہ:

لڑدہ جیل فرخار ولایت (صوبہ) تخار افغانستان

پورے پانچ مہینے تہران (ایران) کی جیل میں قید رہنے کے بعد ہم قیدی دوبارہ 16 جنوری 1999ء کو افغانستان کی جیل میں پہنچ گئے، جس دن ہمیں لڑدہ جیل میں لایا گیا اس دن رمضان المبارک کا آخری دن تھا چنانچہ ہم نے آخری روزہ لڑدہ جیل میں آکر افطار کیا۔

ہمیں جب لڑدہ جیل میں منتقل کیا گیا تو ہم سے پہلے یہاں پر کچھ پاکستانی اور افغانی طالبان قیدی موجود تھے جو تخار میں طالبان کی پسپائی کے دوران گرفتار ہوئے تھے۔ ابتدائی دنوں میں لڑدہ جیل کا جو سب سے بڑا ذمہ دار تھا وہ انتہائی خدا ترس اور قیدیوں سے ہمدردی رکھنے والا انسان تھا، اس کا تعلق حکمت یار کی حزب اسلامی سے تھا اور وہ تخار ہی کے ایک قصبے ''ورسج'' کا رہنے والا تھا اسی وجہ سے اسے ورسجی کماندان کہا جاتا تھا یہ ورسجی کماندان چند ہفتے ہی جیل کا ذمہ دار رہا لیکن اِن چند ہفتوں میں اس ورسجی کماندان نے قیدیوں کو کوئی پریشانی نہیں آنے دی، یہ قیدیوں کو مناسب اور بروقت کھانا وغیرہ دینے کا خیال رکھتا تھا اور یہ قیدیوں کے ساتھ کسی بھی اہلکار کو زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، چند ہفتوں بعد اِس ورسجی کماندان نے اس بناپر اپنی ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا کہ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں نے اس کے احتجاج کے باوجود قیدیوں کی خوراک میں بہت زیادہ کمی کردی تھی۔ استعفیٰ پیش کرتے ہوئے ورسجی کماندان نے حکومتی ارکان کے سامنے اپنا موقف دوٹوک الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے اگر اس ذمہ داری پر رکھنا ہے تو آپ لوگوں کو قیدیوں کا پورا استحقاق میرے حوالے کرنا پڑے گا وگرنہ میں وسائل کے ہوتے ہوئے اپنے ہی جیسے انسانوں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔ شمالی اتحاد کے گرگوں کے سامنے ورسجی کماندان کا یہ مطالبہ صدا بصحراء ثابت ہوا۔

لڑدہ جیل پہنچنے کے تیسرے چوتھے روز ریڈکراس والے بھی جیل میں آن وارد ہوئے جنہوں نے ہماری شناخت کرنے کے بعد ہمیں بتایا کہ ''ہم نے آپ لوگوں کو بہت تلاش کیا حتیٰ کہ ایران میں بھی ہم لوگوں نے آپ کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہم آپ کو ڈھونڈنے

میں کامیاب نہ ہو سکے، ہم نے بھائی انور خان کی وساطت سے جو پاکستانی نژاد برطانوی شہری تھے اور تخار والی پسپائی میں گرفتار ہو کر لڑدہ جیل میں پہنچے تھے تمام حالات جو ہم پر بیتے تھے ریڈ کراس والوں کو بتائے اور ان سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ یہ معاملہ U.N.O اقوام متحدہ میں اٹھائیں کیونکہ یہ ایران کی افغانستان کے اندرونی معاملہ میں کھلی اور جارحانہ مداخلت تھی۔ ریڈ کراس والوں نے ہمیں یقین دلایا کہ ہم یہ معاملہ اقوام متحدہ تک پہنچائیں گے، یہی باتیں ہم نے عالمی میڈیا کے نمائندوں کو بھی بتائیں جو اکثر جیل میں ہمارے انٹرویو لینے کے لیے آتے رہتے تھے لیکن آج تک یہ معاملہ عالمی یا علاقائی سطح پر کبھی بھی زیر بحث نہیں آیا جبکہ پاکستان کو اس دور میں طالبان کے معاملہ میں ہر جگہ گھسیٹنے اور بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی رہی حالانکہ حکومت پاکستان نے کبھی بھی شمالی اتحاد اور طالبان کے درمیان جارحانہ طریقہ سے ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کی، اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایران بھی دجالی قوتوں کا آلہ کار ہے اور دجالی پالیسیوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جیل میں رہتے ہوئے ہر سطح پر واویلا کرنے کے باوجود اقوام متحدہ سمیت نہ کسی ملک اور نہ کسی انسانی حقوق کی تنظیم نے ایران کی اس جارحانہ حرکت کے خلاف کوئی حرف زبان سے نہیں نکالا۔

طالبان کا جاسوس

ورسجی کماندان کے استعفیٰ دے کر رخصت ہونے کے بعد لڑدہ جیل کا زمام اقتدار رحمت اللہ ورسجی، عبدالواسع خان اور عبدالحمید خان کے ہاتھ میں آ گیا، انہوں نے جیل کا بندوبست سنبھالنے کے کچھ دن بعد قیدیوں پر عجیب وغریب اور حیرت انگیز انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ ”جیل کا سابقہ ذمہ دار ورسجی کماندان طالبان کی خفیہ ایجنسی کا ایک اہم رکن تھا جو طالبان کی طرف سے صوبہ تخار میں جاسوسی کے لیے تعینات تھا“ انہوں نے مزید بتایا کہ ”ورسجی کماندان نے تخار کے علاقہ میں رہتے ہوئے طالبان کے لیے بے بہا خدمات انجام دیں اور شمالی اتحاد کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا، ورسجی کماندان کا تازہ ترین منصوبہ یہ تھا کہ قیدیوں کا اعتماد حاصل کر کے اور ان قیدیوں کے ذریعہ صوبہ تخار میں بغاوت کرا کے پورے صوبہ پر قبضہ کر لیا جائے اور

دریائے تخار کے پار موجود طالبان کے تخار میں داخلے کی راہ ہموار کر دی جائے'' جیل کے نئے ذمہ دار عبدالحمید نے مزید انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ ''ورسجی کماندان اپنے اس منصوبے پر بہت زیادہ کام کر چکا تھا اور تقریباً کامیابی کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن اس کو آپ قیدیوں اور ورسجی کی بدقسمتی کہیں یا ہماری حکومت کی خوش قسمتی کہ عین آخری لمحات میں جب کماندان ورسجی دو تین دن بعد اپنی کارروائی کا آغاز کرنے والا تھا اس کا منصوبہ طشت ازبام ہو کر افشا ہو گیا اور ہماری خفیہ ایجنسی نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا کچھ لوگ جو اس منصوبہ میں شامل تھے گرفتار کر لیے گئے لیکن کماندان ورسجی اور اس کے ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور طالبان کے پاس جا پہنچے۔''

عبدالحمید اور عبدالواسع کا قیدیوں کے ساتھ رویہ خالصتاً پاکستانی سیاستدانوں جیسا تھا یعنی ظاہراً قیدیوں کے ساتھ بڑی ہمدردی کے ساتھ پیش آتے اور قیدیوں کو اچھے دنوں کے سبز باغ دکھاتے لیکن اندر سے یہ لوگ قیدیوں کے لیے مستقل عذاب بنے ہوئے تھے، قیدیوں کی خوراک جو پہلے ہی اعلیٰ حکام کی طرف سے کم آتی تھے یہ لوگ اس میں سے بھی ہڑپ کر جاتے اور ان کے دور میں چکنائی جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے اسے قیدی دیکھنے کو ترس گئے، غذائی قلت اور چکنائی کی عدم دستیابی کی وجہ سے قیدیوں کو مختلف بیماریوں نے آن گھیرا، اکثر ساتھی چڑچڑے پن کا شکار ہو گئے اور کئی ساتھی ٹی بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ان دونوں یعنی عبدالحمید اور عبدالواسع نے ایک اچھا کام کیا کہ ڈاکٹر ولی محمد سواتی کو قیدیوں کی طبی خدمت کے لیے مقرر کر دیا اور باہر جیل کے دفاتر کے ساتھ ایک کمرہ بطور کلینک ڈاکٹر ولی کو دے دیا یہ اچھا کام بھی ان دونوں نے اپنے مفاد ہی کے لیے کیا تھا یعنی یہ لوگ اپنے ذاتی ذرائع سے قیدیوں کے لیے طالبان سے دوائیاں وغیرہ منگواتے اور انہیں بیچ کر خوب رقم کھاتے جبکہ قیدیوں کے لیے برائے نام ادویات صرف خانہ پری کے لیے لا کر دے دیتے اور تمام قیدی اسی میں خوش ہو جاتے کیونکہ انہیں جیل کے ذمہ داروں کی خیانت کے بارے میں پتا نہیں تھا۔ عبدالواسع کی یہ خوبی قابل ذکر ہے کہ جو قیدی زیادہ مریض ہوتا اور تکلیف میں مبتلا ہوتا وہ اسے فرخار شہر کے ہسپتال بھیج دیتا جہاں بیمار قیدی کا کچھ نہ کچھ علاج معالجہ ہو جاتا۔ عبدالحمید

کے مقابلے میں عبدالواسع قیدیوں کے لیے قدرے بہتر شخص تھا اور یہ قیدیوں کے لیے کافی حد تک نرم گوشہ رکھتا تھا اور بیمار قیدیوں کا خاص طور پر خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

مجھ جیسے بیمار قیدیوں کے لیے غذائی قلت کے دوران بھائی رحمت اللہ یہاں لڑدہ جیل میں بھی پنجشیر کی دوسری جیلوں کی طرح رحمت کا فرشتہ بنا رہا کیونکہ بھائی رحمت اللہ اپنی خداداد ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر مریض قیدیوں کے لیے کسی نہ کسی طریقہ سے کھانا وغیرہ حاصل کر لیتا تھا، پنجشیر جیل میں بھائی رحمت اللہ اکثر مریضوں کے لیے اضافی کھانا اور قہوہ جیل کے باورچی خانہ سے حاصل کرتا رہتا تھا، وہاں تو بھائی رحمت اللہ کے ساتھ خالد بھائی بھی اس کام میں پیش پیش ہوتے تھے لیکن جب ہم قیدیوں کو ایران کے حوالہ کیا گیا تھا اس وقت احمد شاہ مسعود نے خالد بھائی کو ایران کے حوالہ کرنے کی بجائے پنجشیر ہی میں روک دیا تھا چنانچہ یہاں پر رحمت اللہ بھائی اکیلے کو یہ کام سرانجام دینا پڑتا تھا، لڑدہ جیل میں ہم قیدیوں کے باشی (ذمہ دار) بھی بھائی رحمت اللہ ہی تھے۔

لڑدہ جیل تین احاطوں پر مشتمل تھی، جیل کے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی پہلا احاطہ تھا جہاں بائیں طرف جیل عملہ کے دفاتر وغیرہ تھے، دفاتر کے بالکل ساتھ بائیں طرف ایک کمرے سے گذرتے ہوئے قیدیوں کے احاطے میں جانے کا چھوٹا راستہ تھا اسی راستہ والے کمرے کے ساتھ آگے کی طرف نکلا ہوا ایک کمرہ تھا جسے جیل کے کلینک کا درجہ دے کر ڈاکٹر ولی کے حوالے کیا گیا تھا، انتہائی دائیں جانب جیل کا باورچی خانہ اور سٹور وغیرہ تھے، جیل دفاتر کے سامنے ایک گراسی پلاٹ تھا جبکہ دائیں طرف بیرونی دیواروں کے کونے میں ایک مسجد بنی ہوئی تھی، اس احاطے کے بالکل عقب میں قیدیوں کا احاطہ تھا، اس احاطہ کے تین اطراف قیدیوں کے کمرے تھے جبکہ بائیں طرف باورچی خانہ کی دیوار تھی جس میں کھانا وغیرہ دینے کے لیے ایک چھوٹی سے کھڑکی بنی ہوئی تھی، کمروں کے درمیان میں ایک راہداری تھی جو قیدیوں کے احاطے کو تیسرے احاطے سے ملاتی تھی، تیسرے اور آخری احاطے میں بیت الخلاء تھے، اس احاطے سے پہاڑی چشمے سے آنے والے پانی کا ایک چھوٹا سا نالہ گذرتا تھا جہاں پر قیدی وضو اور غسل کرتے تھے، علاوہ ازیں یہیں پر قیدی اپنے کپڑے وغیرہ بھی دھوتے تھے،

اسی تیسرے احاطہ میں قیدیوں کے کمروں کے بالکل عقب میں کچھ غیر آباد کمرے بھی تھے اسی تیسرے احاطے کی دائیں طرف قیدیوں کے احاطے میں داخل ہونے کا بڑا دروازہ تھا جہاں سے داخل ہوکر تیسرے احاطہ سے گذر کر قیدیوں کے احاطہ میں جایا جاتا تھا اسی دروازے سے باہر سبزیوں کا چھوٹا سا کھیت تھا جہاں پر سیب کے درخت بھی لگے ہوئے تھے اسی طرف سے کچن کی طرف سے ہوتا ہوا راستہ پہلے احاطے میں اور پھر باہر کی طرف جاتا تھا۔

جیل سے فرار کی ناکام کوشش

ڈاکٹر ولی محمد سواتی نے جیل حکام کا اعتماد حاصل کر کے چار مزید قیدی ساتھیوں کو باہر کلینک میں اپنے ساتھ رکھ لیا تھا جن میں قاری اقبال اور عمران بھائی باورچی خانہ کے ساتھ لگے ہوئے تنور پر کام کرتے تھے اور قیدیوں اور جیل کے عملہ کی روٹیاں بناتے تھے۔ ڈاکٹر ولی نے جیل حکام کا اس حد تک اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ وہ اکیلا ہی بغیر پہرہ دار کے لڑدہ گاؤں تک چلا جاتا، اس گاؤں میں چونکہ کوئی ڈاکٹر وغیرہ نہیں تھا، قیدی ڈاکٹر کی صورت میں انہیں یہ سہولت میسر آ گئی تھی یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر ولی کا جب دل کرتا مریض دیکھنے کے بہانے اردگرد کے دیہاتوں کا چکر لگا آتا اور یوں ڈاکٹر ولی نے لڑدہ سے نکلنے کے تمام راستے ذہن نشین کر لیے اور فرار کے منصوبے سوچنے لگا۔

ایک روز مجھے گردے میں سخت تکلیف شروع ہوگئی تو بھائی رحمت اللہ نے جو ہم قیدیوں کے ذمہ دار تھے عبدالواسع کی منت ساجت کی کہ اس مریض کو ہسپتال لے جاؤ کیونکہ یہ بہت تکلیف میں ہے، عبدالواسع جیلر پہلے تو ٹال مٹول کرتا رہا، آخر کار بھائی رحمت اللہ کے شدید اصرار پر مجھے ہسپتال لے جانے پر آمادہ ہوگیا چنانچہ مجھے ہسپتال لے جانے کے لیے جیپ میں سوار کرا دیا اور بھائی عبیداللہ شاہین کو بھی ساتھ لے لیا۔ جیلر عبدالواسع خان نے اپنی نگرانی میں ہمیں فرخار جیل میں پہنچا دیا جہاں پر ہماری انٹری کروائی گئی بعدازیں ہمیں فرخار ہسپتال لے جایا گیا جہاں پر ڈاکٹروں نے میرا معائنہ کرنے کے بعد چند دنوں کے لیے مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا۔ بھائی عبیداللہ شاہین سارا دن ہسپتال میں میرے پاس رہتا جبکہ رات کو پہرے دار بھائی شاہین کو جیل میں لے جاتے اور صبح سویرے میرے پاس چھوڑ جاتے۔

ہسپتال میں اکثر ایک آٹھ نو سال کا بچہ ہمارے پاس آتا، یہ بچہ کوئی بولنے والی مشین لگتا تھا کیونکہ جب بولنا شروع کرتا تو نان سٹاپ دو دو گھنٹے بولتا رہتا، ایسے ایسے قصے ہمیں سناتا کہ ہماری عقل دنگ رہ جاتی، یہ بچہ تخار سے طالبان کی پسپائی کے واقعات سناتے ہوئے ہمیں بتاتا تھا کہ ''ملا عبدالوکیل متوکل اور اور بڑے بڑے طالبان کمانڈر پسپائی کے وقت فرخار میں پھنس گئے تھے جنہیں میں نے ایک چکی میں چھپا دیا تھا'' یہ بچہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ ''ان پھنسے ہوئے طالبان کے بڑوں کو کئی معرکے لڑنے کے بعد میں نے۔ یہاں سے بحفاظت نکالا'' جسم پر ایک جگہ زخم کا نشان دکھاتے ہوئے وہ بچہ کہتا تھا کہ ''طالبان کے بڑوں کو نکالتے وقت یہ زخم مجھے لگا تھا۔'' ایک دن محظوظ ہوتے ہوئے میں نے اس بچے سے پوچھا کہ ''تمہارے لوگ تو طالبان کے خلاف ہیں پھر تم نے طالبان کے لیے یہ زحمت کیوں اٹھائی۔'' اس پر بچے نے نہایت معصومیت سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم غریب لوگ طالبان سے محبت کرتے ہیں کیونکہ طالبان بھی غریبوں سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔'' یہ بچہ اگرچہ اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرتا تھا اور بے پر کی چھوڑتا تھا لیکن یہ بات پکی تھی کہ اس بچے کے بڑے ضرور طالبان کے حامی تھے اور فرخار میں بھی طالبان کی حمایت موجود تھی کیونکہ بچے اپنے بڑوں اور جس جگہ اٹھتے بیٹھتے ہیں ان ہی کی باتیں نقل کرتے ہیں۔

ایک دن مجھے فرخار ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تو پہرے دار مجھے فرخار جیل میں لے گئے جہاں پر عبدالواسع خان بھی آیا ہوا تھا چنانچہ وہ مجھے اور شاہین بھائی کو ڈبل کیبن ڈالے میں بٹھا کر واپسی لڑدہ کے سفر پر روانہ ہو گیا، گاڑی ہمیں لے کر شہر سے نکلی ہی تھی کہ جھٹکے کھانے لگی اور کچھ دور جا کر بند ہو گئی، ہم پہرے داروں سمیت گاڑی سے نیچے اتر آئے آگے بیٹھے ہوئے عبدالواسع اور اس کے ساتھی بھی گاڑی سے باہر نکل آئے، ڈرائیور گاڑی کا بونٹ اٹھا کر اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، آخرکار اس نے تھک ہار کر ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ تمہارے طالبان کی گاڑی ہے ہمیں ان گاڑیوں کی کوئی سمجھ نہیں ہے تم لوگ ہی اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرو کیونکہ تمہارے استعمال میں تو یقیناً یہ گاڑیاں رہی ہوں گی۔'' میں نے اور شاہین بھائی نے بھی گاڑی کے انجن اور بیٹری وغیرہ کی

تاروں کو ادھر ادھر کر کے ٹھیک کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی گاڑی سٹارٹ نہ ہوئی چنانچہ ہم نے بھی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ گاڑی میں کیا خرابی پیدا ہوگئی ہے۔"

تھک ہار کر ہم سب سڑک کے قریب موجود ایک بہت بڑی حویلی کی اونچی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ عبدالواسع نے ایک پہرہ دار کو شہر کی طرف دوڑایا تا کہ وہ کسی مکینک کو لے آئے۔ جس حویلی کی دیوار کے سائے میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے اس حویلی کے مالک نے ہم بن بلائے مہمانوں کی قہوہ اور خشک توتوں کے ساتھ ضیافت کی۔ ابھی ہم قہوے اور خشک توتوں سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ لڑدہ کی جانب سے ایک سواریوں والا ٹرک آیا اور سڑک کے کنارے کھڑی ہماری گاڑی کے قریب آ کر رک گیا اور لڑدہ جیل کے ایک پہرہ دار کو اتار کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا، پہرہ دار نے انتہائی عجلت میں جیلر عبدالواسع خان کو بلایا اور اسے ہم سے کچھ دور لے جا کر رازدارانہ انداز میں اس سے باتیں کرنے لگا کچھ دیر یہ دونوں ہم سے دور کھڑے کھسر پھسر کرتے رہے بعد ازیں عبدالواسع خان واپس ہمارے پاس آیا اور آتے ہی اس نے دو پہرہ داروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "ان دونوں قیدیوں کو واپس فرخار جیل میں پہنچا دو" چنانچہ پہرے دار مجھے اور عبیداللہ شاہین کو لے کر پیدل ہی فرخار شہر کی طرف محو سفر ہو گئے۔ پانچ چھ کلومیٹر کا یہ پیدل سفر ایک ٹانگ کے ساتھ بیساکھیوں پر طے کرنا انتہائی دشوار تھا، جب میں تھک جاتا شاہین بھائی مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے اور اس طرح چلتے ہوئے آخر کار ہم دوبارہ فرخار جیل میں پہنچ گئے۔ ہم دونوں قیدی پریشان تھے کہ ایسا کیا معاملہ پیش آ گیا کہ ہمیں لڑدہ جیل لے جانے کی بجائے واپس فرخار جیل بھیج دیا گیا حالانکہ گاڑی خراب ہونے کی صورت میں ہمیں پہرداروں کے ساتھ سواریوں والے ٹرک میں بھی لڑدہ روانہ کیا جا سکتا تھا۔ فرخار جیل میں پہنچتے ہی ہمیں اس عجلت میں واپسی کا سبب معلوم ہو گیا، فرخار جیل کے پہرے داروں نے ہمیں بتایا کہ تمہارے دو ساتھی جیل کا ڈاکٹر اور ایک قاری فرار ہو گئے ہیں۔

ہم نے رات فرخار جیل میں یہ دعائیں کرتے گذاری کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ان دونوں

ساتھیوں کو جنہوں نے ظلم و ستم سے نکلنے کی کوشش کی کامیابی سے نکلنے کی توفیق عطا فرمادے
''صبح ہوئی تو جیل کے درو دیوار کلاشنکوف کی فائرنگ اور پہرے داروں کے نعروں سے گونج اٹھیں، جب ہم نے پہرہ داروں سے اس فائرنگ اور نعروں کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ''تمہارے جو ساتھی فرار ہوئے تھے انہیں ہمارے سپاہیوں نے تلاش کر کے گرفتار کرلیا ہے جنہیں تھوڑی دیر بعد یہاں پہنچا دیا جائے گا۔ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ شمالی اتحاد کے فوجی ڈاکٹر ولی اور بھائی عمران کو پکڑ کر فرخار جیل میں لے آئے۔ ان دونوں کے جیل میں پہنچنے کے تین گھنٹے بعد عبدالواسع بھی آ گیا اور بغیر رکے ہم چاروں قیدیوں اور پہرہ داروں کو لے کر فرخار کے اڈے پر جا پہنچا جہاں ہمیں پہرہ داروں سمیت لڑ دہ کی طرف جانے والے ٹرک پر سوار کرا دیا اور خود ٹرک کے کیبن میں سوار ہوگیا۔ جب ہمارا ٹرک لڑ دہ جیل کے قریب پہنچا تو جیل کی چھتوں پر موجود پہرہ داروں نے فرار شدہ قیدی پکڑنے کی خوشی میں اندھا دھند ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ جیل میں اترتے ہی ڈاکٹر ولی، عمران بھائی اور ان کے ساتھ کلینک میں رہنے والے قیدی ساتھیوں کو زدو کوب کیا جانے لگا، ان قیدیوں پر جیل کے سپاہیوں نے طرح طرح سے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے، ان پر فولادی کیبلوں اور کلاشنکوف کے آہنی بٹوں کے ساتھ تشدد کیا گیا، یخ بستہ پانی کے اندر ان کو پھینکا گیا، غرض بھاگنے کی پاداش میں ان ناتواں قیدیوں پر ہر قسم کا ستم ڈھایا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد جب ان قیدیوں پر سے ظلم و ستم کے بادل چھٹے تو میں نے عمران بھائی جو شبرغان جیل سے ایران اور پھر ہمارے ساتھ لڑ دہ جیل میں منتقل ہوئے تھے سے پوچھا کہ آپ لوگ کس طرح جیل سے فرار ہوئے تھے، اس پر عمران بھائی نے اپنے جیل سے فرار ہونے کی داستان سناتے ہوئے بتایا کہ ''ڈاکٹر ولی محمد سواتی نے جب مریضوں کو دیکھنے کے بہانے تمام راستوں سے آگاہی حاصل کر لی تو اس نے فرار کا ایک منصوبہ بنایا اور مجھے بھی اس منصوبے میں شامل کر لیا چنانچہ ایک دن مناسب موقع پر ڈاکٹر ولی قریبی گاؤں میں مریض دیکھنے کے بہانے نکلا تو منصوبے کے مطابق نکلتے ہوئے اس نے مجھے بھی ساتھ لے لیا جس پر کسی پہرہ دار نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ ڈاکٹر ولی مکمل طور پر جیل عملہ کا اعتماد حاصل کر چکا

تھا۔ ہم جیل سے نکل کر پہلے فرخار روڈ پر واقع ایک گاؤں میں گئے اور وہیں سے راستہ بدل کر ہم فرخار کی طرف چل پڑے اور شام تک ہم فرخار شہر سے متصل پہاڑ پر پہنچ گئے جہاں ہم نے چھپ کر رات گذاری، صبح ہونے پر ڈاکٹر ولی نے کہا کہ ہم فرخار شہر میں اترتے ہیں اور یہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر تخار جائیں گے۔'' عمران بھائی نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ''میں نے ڈاکٹر ولی سے کہا کہ ہمیں فرخار شہر میں اتر کر گاڑی میں بیٹھنے کا رسک نہیں لینا چاہیے کیونکہ اب تک جیل والوں کو ہمارے فرار کا علم ہو چکا ہوگا اور ہماری تلاش جاری ہوگی جس پر ڈاکٹر ولی محمد نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا کہ ہمیں کوئی نہیں پکڑے گا کیونکہ میں پہلے بھی ایک دو مرتبہ فرخار آچکا ہوں اور پھر جہاں تک پیدل تخار کی طرف چلنے کا معاملہ ہے تو ہم اتنا لمبا اور کٹھن پہاڑی سفر بغیر خوراک اور پانی کے طے نہیں کر سکیں گے۔ میں نے ڈاکٹر ولی کی بات مان لی چنانچہ ہم پہاڑ سے صبح منہ اندھیرے فرخار شہر میں اتر آئے جہاں پر تخار (طالقان) شہر کو جانے والی ایک گاڑی تیار کھڑی تھی ہم اس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی کی سواریاں اور اردگرد کے لوگ ہمیں مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اس وقت ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہمیں پہاڑ سے اتر کر گاڑی میں آ کر نہیں بیٹھنا چاہیے تھا، ابھی ہم انہیں سوچوں میں گم بیٹھے ہوئے تھے کہ عبدالواسع چند پہرہ داروں کے ساتھ آ موجود ہوا اور آتے ہی اس نے ڈاکٹر ولی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا کہ ''دکتور صاحب کجا میروی......''؟ (یعنی ڈاکٹر صاحب کہاں جا رہے ہو) ڈاکٹر ولی نے ہنستے ہوئے خوف زدہ سے لہجہ میں عبدالواسع کو جواب دیتے ہوئے کہا ''تخار میرم'' (تخار جا رہا ہوں) عبدالواسع نے ہمیں گاڑی سے نیچے اتارتے ہوئے کہا ''ابھی تو آپ لوگ ہمارے ساتھ لڑدہ چلیں جہاں آپ لوگوں کی ضیافت کا ہم نے انتظام کر رکھا ہے تخار پھر کسی وقت چلے جانا'' عمران بھائی نے ہنستے ہوئے کہا ''یہ تھی ہمارے فرار ہونے کی داستان جس میں ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ان دنوں لڑدہ جیل میں تمام قیدیوں کی حالت غذائی قلت کی وجہ سے عمومی طور پر انتہائی ناگفتہ بہ ہو چکی، کئی قیدی ساتھی جن میں بھائی ریدی گل، بادشاہ میر اور بھائی زاہد کلی طور پر اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے جبکہ مولانا ناصر الدین بکوٹی (ضلع مری کے نواہی گاؤں بکوٹ کے

رہنے والے) اور بھائی عبدالرشید (لکی مروت کے رہنے والے) ٹی بی جیسے مہلک مرض کا شکار ہو کر موت کی دہلیز پر پہنچ چکے تھے۔ دو افغانی ساتھی اسی مہلک مرض میں مبتلا ہو کر لڑہ دہ جیل میں داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ قیدیوں کے تمام نازک حالات کو دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی جیل انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔

انہیں دنوں ریڈ کراس والے جیل میں آئے جن میں ایک ڈاکٹر بھی تھا انہوں نے جب قیدیوں کی حالت زار دیکھی تو قیدیوں کے لیے ادویات بھیجنے کا وعدہ کیا علاوہ ازیں ریڈ کراس والوں نے بھائی ناصرالدین بکوٹی، بھائی عبدالرشید اور مجھے تخار منتقل کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ انہوں نے اس بارے میں جیل انتظامیہ کو آگاہ کیا، جیل حکام نے کچھ اصرار کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی، ریڈ کراس والے ہمیں گاڑی میں بٹھا کر تخار لے گئے، ریڈ کراس کی گاڑی جونہی تخار شہر میں داخل ہوئی تو ہمارے شاہینوں نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا یعنی ریڈ کراس کی گاڑی ہمیں لیے ہوئے جیسے ہی تخار شہر میں داخل ہوئی تو عین اسی وقت طالبان کے جیٹ جہازوں نے تخار میں موجود شمالی اتحاد کے تیل کے ذخیرے اور دو تین مزید ٹارگٹوں پر بم برسائے جس سے سارا شہر لرز اٹھا اور تیل کے ذخائر چند منٹوں میں جل کر خاک ہو گئے۔ ریڈ کراس والوں نے ہم مریضوں کو ہسپتال لے جانے کی بجائے تخار جیل میں پہنچا کر وہاں کی انتظامیہ کے حوالے کر دیا اور چلتے بنے۔

ریڈ کراس والوں کی بے حسی کا اندازہ لگائیں کہ ہمیں تخار جیل میں چھوڑنے کے دو دن بعد واپس آئے اور ان دونوں مریضوں کو جو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے جنہیں انتہائی نگہداشت کی ضرورت تھی ہسپتال لے جانے کی بجائے یہیں پر انہیں صرف خانہ پری کے لیے کچھ دوائیاں لا کر دے دیں۔

تخار جیل میں مولانا ناصرالدین بکوٹی کی شہادت

تخار جیل میں جیل کا ایک ذمہ دار ضابط (کرنل) زین الدین بدخشی ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا اس نے ہمیں رہنے کے لیے ایک الگ اور صاف ستھرا کمرہ دیا جبکہ ہمارے کھانے کا بھی خاص خیال رکھتا۔ بھائی ناصرالدین اور بھائی عبدالرشید کی حالت یہاں تک پہنچ

چکی تھی کہ چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے وہ دونوں اپنے ہاتھ سے کچھ کھا پی بھی نہیں سکتے تھے چنانچہ ان دونوں کو میں اپنے ہاتھ سے کھلاتا تھا، رات کو سوتے وقت دو رسیاں میں ان دونوں کے ہاتھ پر باندھ دیتا اور رسیوں کا دوسرا سرا میں اپنے ہاتھ پر باندھ لیتا تاکہ بوقت ضرورت وہ اپنے ہاتھ ہلا کر مجھے بیدار کرلیں۔ اس جیل میں پہنچنے کے تیسرے دن صبح صادق کے قریب جب میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ یکدم رسی کے کھینچنے کی وجہ سے میرا ہاتھ ہلنے لگا تو میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا، میں نے دیکھا تو پتہ چلا کہ بھائی ناصرالدین مجھے بلا رہے ہیں میں جلدی جلدی گھسٹتا ہوا بھائی ناصرالدین کے پاس گیا اور پوچھا ''جی ناصر بھائی کیا بات ہے......؟'' ناصر بھائی نے نقاہت زدہ لہجے میں بولتے ہوئے کہا ''مجھے بٹھا دو اور پانی پلاؤ۔'' میں نے ناصر بھائی کو اٹھایا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پانی کا گلاس اس کے منہ کو لگا دیا، ناصرالدین نے پانی پی لیا، اتنے میں بھائی عبدالرشید بھی جاگ چکے تھے میں نے اسے بھی پانی پلایا، ناصر بھائی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''حامد بھائی! آج میری طبیعت کافی بہتر ہے اور میں خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا ہوں اور بھوک بھی محسوس کر رہا ہوں......اگر روٹی کا ٹکڑا رات کا بچہ ہوا پڑا ہے تو مجھے کھلا دو۔'' میں نے رات کی بچی ہوئی روٹی رومال سے نکالی اور جو ابھی تک نرم ہی تھی اور ناصر بھائی کو کھلانی شروع کی حالانکہ دو تین دن سے ناصر بھائی کچھ بھی نہیں کھا رہے تھے لیکن اس وقت ناصر بھائی نے انتہائی رغبت کے ساتھ چار پانچ نوالے کھائے اور یہ چند نوالے کھانے کے بعد ناصر بھائی نے کہا ''بس حامد بھائی......میرا پیٹ بھر گیا ہے......اب مجھے تیمّم کرا دو کہ میں نماز پڑھ لوں۔'' تیمّم کر کے ناصر بھائی بجائے نماز پڑھنے کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، میں نے ناصرالدین بھائی کو دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا کہ رونے کی کیا وجہ ہے اس پر ناصرالدین نے بے بسی کے عالم میں بولتے ہوئے کہا ''میرے کپڑے ہر وقت بول و براز سے بھرے رہتے ہیں اور میں اسی طرح خالق و مالک کائنات کے حضور پیش ہو جاتا ہوں......کتنا گستاخ ہوں میں اور کتنا بڑا بے ادب ہوں۔'' میں نے ناصر بھائی کو تسلی دیتے ہوئے کہا ''ناصر بھائی اول تو اس وقت آپ کے کپڑے بالکل صاف ستھرے ہیں کیونکہ رات ہی میں نے آپ کے گندے کپڑے اتار دیئے تھے اور گیلے کپڑوں کے ساتھ آپ کا جسم بھی

اچھی طرح صاف اور پاک کر دیا تھا اس لیے آپ بے غم ہو کر نماز ادا کریں، دوم اس حالت میں اگر کپڑے خراب بھی ہوں تو ہماری قید اور مجبوری کی وجہ سے نماز میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔'' ناصر بھائی نے الحمد للہ کہا، اللہ کا شکر ادا کیا اور اشاروں کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی، اتنے میں عبدالرشید کا تیمّم بھی کروادیا اور خود میں نے کمرے کے کونے میں بیٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر میں نے ناصر بھائی کا دل بہلانے کے لیے کہا ''ناصر بھائی آج تو آپ ماشاء اللہ کافی تنگڑے معلوم ہو رہے ہیں.......... (حقیقت میں بھی آج ناصر الدین بھائی کے چہرے پر نور ہی نور برس رہا تھا)

کیا خیال ہے کراٹے کھیلو گے میرے ساتھ؟ ناصر الدین نے مسکراتے ہوئے کہا ''کیوں کوئی ہڈی پسلی میرے ہاتھ سے تڑاؤ گے.....'' میں نے ناصر بھائی کے قریب ہوتے ہوئے کہا ''آؤ دیکھتے ہیں کس میں زیادہ زور ہے۔'' ناصر الدین نے مکہ بنایا اور انتہائی نقاہت کے ساتھ میرے سینے پر مارا...... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ''مکہ میرے سینے پر مس کیا۔'' اس کا ہاتھ لگنا تھا کہ میں جان بوجھ کر اس طرح دور جا گرا جیسے کسی پہلوان نے واقعتاً مکہ مار کر دور پھینک دیا ہو۔ ناصر بھائی اور عبدالرشید بھائی ہنسنے لگے، ناصر بھائی مکہ فضا میں لہرا کر ہنستے ہوئے کہنے لگے ''دیکھی میری طاقت...... ابھی تو میں نے مکہ تمہارے سینے کے ساتھ مس ہی کیا تھا...... اگر زور سے لگا دیتا تو تمہارا کیا حال ہوتا۔'' اس کے بعد ناصر بھائی نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے مجھے اور عبدالرشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر مجھ سے کوئی اور کوتاہی ہوئی ہو یا میری وجہ سے آپ لوگوں کا دل دکھا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔'' اس کے بعد ناصر بھائی نے کہا ''مجھے لٹا دیں میں بیٹھا بیٹھا تھک گیا ہوں اور پھر میں لیٹ کر آرام سے کچھ تلاوت بھی کرنا چاہتا ہوں...... آپ لوگ بھی تلاوت کر لیں'' میں نے احتیاط سے ناصر الدین کو لٹا دیا تو ناصر بھائی دھیمی آواز میں سورۃ یٰسین کی تلاوت کرنے لگے، عبدالرشید بھائی بھی ناصر الدین بھائی کے قریب اپنی جگہ پر لیٹ گئے اور تلاوت کرنے لگے جب کہ میں باہر کھلنے والی کھڑکی میں جا بیٹھا اور وہاں بیٹھ کر جو کچھ زبانی یاد تھا پڑھنے لگا ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ عبدالرشید نے مجھے آواز دیتے ہوئے کہا ''حامد بھائی...... ناصر بھائی تلاوت کرتے کرتے

خاموش ہو گئے ہیں......اور ان کے جسم میں بھی حرکت محسوس نہیں ہو رہی۔" میں چھلانگ مار کر جلدی جلدی ناصر بھائی کے پاس پہنچا...... میں نے ناصر بھائی کی نبض چیک کی سینے پر کان لگا کر دیکھا......لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا......اپنی شوخ طبیعت کی وجہ سے قیدی ساتھیوں کو ہمیشہ خوش رکھنے والا مولوی ناصر الدین بکوٹی ہمیں داغ مفارقت دے کر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے شہادت کا عظیم مرتبہ پا چکا تھا...... اور وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے ایسے رخصت ہوا کہ ہمیں قریب بیٹھے ہوؤں کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ جنت کا راہی .... اللہ رب العزت کے دیدار کا طالب .... حوروں کا دلہا کب ہم سے رخصت ہوا.........۔

صبح کا اجالہ ہر طرف پھیل چکا تھا اور جیل کے تمام باسی بیدار ہو چکے تھے اور جیل میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی، ایسے میں میں نے کھڑکی میں بیٹھ کر پہرہ داروں کو آوازیں دینا شروع کیں تو ایک دو پہرہ دار اور کچھ مقامی قیدی میرے پاس آ گئے جن کو میں نے بتایا کہ میرا ایک ساتھی وفات پا گیا ہے، پہرہ داروں نے جیل کے ذمہ داروں کو اطلاع دی، جلد ہی ضابط (کرنل) زین الدین ہمارے پاس آ گیا، میں نے ضابط زین الدین کی منت کرتے ہوئے کہا کہ "ضابط صاحب! ریڈ کراس والے ان مریضوں کو علاج معالجہ کے لیے یہاں لائے تھے لیکن انہوں نے ان کے علاج میں کوئی دلچسپی نہیں لی، اب میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ ریڈ کراس والوں پر زور ڈالیں کہ ہمارے ساتھی کی میت کو پاکستان میں اس کے گھر پہنچا دیں اور دوسرے مریض ساتھی کے علاج پر آپ خود توجہ فرمائیں۔" ضابط زین الدین نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ بے فکر ہو جائیں میں ابھی ریڈ کراس کے دفتر میں جاتا ہوں اور ان کو لے کر یہاں آتا ہوں۔

ضابط (کرنل) زین الدین کی واپسی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوئی، ریڈ کراس والے بھی اس کے ہمراہ تھے، ریڈ کراس والوں نے آتے ہی ناصر الدین کی میت کو اپنے ساتھ لائے ہوئے تابوت میں ڈالا اور یقین دلایا کہ ہم میت کو اس کے گھر تک پہنچائیں گے چنانچہ وہ تابوت کو اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے بعد میں ہمیں ریڈ کراس والوں ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے ناصر بھائی کی میت کو ان کے گھر بکوٹ (مری) میں پہنچا دیا تھا۔

ضابط زین الدین نے اپنے طور پر مقامی ہسپتال سے عبدالرشید کا علاج شروع کروایا لیکن ساتھ ہی اس نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ ''سرخ کشمش منگوالو'' جسے رات کو بھگو دیا کرو اور صبح نہار منہ پانی اور کشمش مریض کو کھلا دیا کرو اس سے مریض میں خون کی کمی پوری ہو جائے گی اور مریض روبصحت ہو جائے گا۔'' چنانچہ جب میں نے کشمش منگوا کر باقاعدگی سے بھائی عبدالرشید کو دینا شروع کی تو واقعتاً اس نے جادو جیسا کام کیا اور تیزی سے عبدالرشید میں خون کی کمی پوری ہونا شروع ہو گئی اور ایک ہفتہ میں بھائی عبدالرشید خود سے اٹھ کر کھڑے ہونا شروع ہو گئے، جب میں نے دیکھا کہ یہ اب اللہ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہونا شروع ہو گیا ہے تو میں نے اس پر کچھ مشقت ڈالنا شروع کر دی وہ اس طرح کہ ہمارے کمرے کے ایک کونے میں لوہے کی وزنی بیڑیوں کا کافی بڑا ڈھیر پڑا ہوا تھا، میں صبح سویرے اٹھ کر بڑی احتیاط کے ساتھ بغیر آواز پیدا کیے تمام بیڑیوں کو کمرے میں بکھیر دیتا اور بعد میں عبدالرشید کو اٹھا کر کہتا کہ ''پہرے دار یہ بیڑیاں بکھیر گئے ہیں انہیں اٹھا کر دوبارہ کونے میں جمع کر دو۔'' پہلی بار عبدالرشید نے سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھ سے یہ کام نہیں ہوتا۔'' اس پر میں نے صاف لفظوں میں اور مصنوعی طور پر غصہ ہوتے ہوئے کہا ''میرے بھائی! اگر بھائی ناصر الدین کی طرح دیار غیر میں بے بسی کے عالم میں اپنی جان دینا چاہتے ہو تو شوق سے لیٹے رہو، میں ایک ٹانگ کے ساتھ تمہاری خدمت کرتا رہوں گا اور اگر اپنے آپ کو تندرست کرنا چاہتے ہو تو تمہیں حرکت کرنا پڑے گی اور خود کو کام میں مصروف کرنا پڑے گا۔ میری یہ سرزنش کارگر ثابت ہوئی اور عبدالرشید بھائی نے کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دن تو میں بھائی عبدالرشید سے بیڑیاں اکٹھی کرواتا رہا، بعد ازیں جب میں نے دیکھا کہ عبدالرشید اچھی طرح حرکت کرنے اور کمرے کی حد تک چلنے پھرنے لگ گیا ہے تو ایک دن یونہی باتوں باتوں میں میں نے عبدالرشید کو کہا کہ ''بھائی! ہم لوگ مجاہد ہیں اور اللہ کے سپاہی ہیں لیکن کتنی بے غیرتی کی بات ہے کہ قیدی ہم پہ ترس کھا کر ہمارے کام کریں اور ہمیں استعمال کے لیے پانی بھی باہر سے وہی لاکر دیں........ مجھے تو اب شرم آتی ہے، میرا تیر عین نشانے پر لگا عبدالرشید کی ایمانی اور پٹھانی غیرت جوش میں آ گئی، چنانچہ اس نے انتہائی جوشیلے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے

ہوئے کہا ''حامد بھائی اب میں ٹھیک ہوگیا ہوں، اپنے لیے باہر سے پانی میں خود لایا کروں گا اور سارے کام بھی میں خود کیا کروں گا۔''

عبدالرشید نے جب کام وغیرہ کرنا شروع کیا تو اس کی صحت اور بھی تیزی کے ساتھ بحال ہونا شروع ہوگئی اور وہ مریض جو موت کی دہلیز پر پہنچ چکا تھا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اپنے عزم وقوت ارادی کے بل بوتے پر چند ہفتوں میں اس طرح صحت مند ہوگیا کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ چند ہفتے پہلے اس کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی، یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مدد ونصرت تھی جسے عام حالات میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا لیکن اللہ کی راہ میں نکلنے والے اللہ رب العزت کی مدد ونصرت کے ایسے واقعات اکثر دیکھتے رہتے ہیں۔

کچھ دنوں سے ایک چوبیس پچیس سالہ لڑکے کو ہمارے کمرے میں بند کیا گیا تھا جسے کسی لڑائی کے کیس میں پکڑ کر لایا گیا تھا اس کے ساتھ میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی اس لڑکے نے بتایا کہ ''میری ایک ہمشیرہ لڑشدہ گاؤں میں رہتی ہے' جب آپ واپس لڑشدہ جیل میں جاؤ گے تو میں اپنے بہنوئی کو جو وہاں جیل میں باورچی ہے آپ کا خیال رکھنے کا کہوں گا۔ ایک دن ایک چودہ پندرہ سالہ بچہ اس لڑکے کے لیے کھانا لے کر آیا تو بڑے لڑکے نے بتایا کہ یہ بچہ ہماری تیل نکالنے والی مشین پر کام کرتا ہے میں نے چھوٹے بچے سے پوچھا کہ ''آپ کی تو پڑھنے کی عمر ہے آپ ملازمت کیوں کرتے ہیں؟ اور کیا جب طالبان کا تخار پر قبضہ تھا اس وقت بھی آپ یہی ملازمت کرتے تھے'' میرا یہ کہنا تھا کہ وہ بچہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور رونے کی وجہ پوچھی تو اس بچے نے مجھے اپنی روئیداد سناتے ہوئے کہا: ''جب طالبان نے تخار پر قبضہ کیا تھا تو اس سے پہلے بھی میں اس مشین پر کام کرتا تھا کیونکہ ہمارے گھر میں کوئی اور کمانے والا نہیں ہے، میری پانچ بہنیں اور والدہ ہیں جبکہ میرے والد صاحب دو سال پہلے وفات پا چکے ہیں اس لیے پورے گھر کا میں واحد کفیل ہوں لیکن جب طالبان یہاں آئے تو انہوں نے مجھے کام سے ہٹا کر مدرسہ میں داخل کرا دیا اور میرے گھر کی کفالت کی مکمل ذمہ داری انہوں نے اٹھالی نہ صرف ہماری کفالت کی ذمہ داری انہوں نے اٹھائی بلکہ ہم جیسے اور بھی جتنے خاندان ان کے علم میں آئے ان کی کفالت بھی انہوں نے اپنے

ذمہ لے لی، طالبان کے دور حکومت میں ہم سب غریب لوگ خوشحال ہوگئے تھے لیکن جب سے طالبان یہاں سے پسپا ہو کر گئے ہیں اس وقت سے پھر ہم مشکلات کا شکار ہیں، دینی مدارس جو طالبان نے بنائے تھے وہ ان کے جانے کے بعد ختم کر دیئے گئے، ہمارے گھر میں فاقے شروع ہوگئے تو مجھے پھر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے ملازمت کرنا پڑی۔'' بچے نے مزید بتاتے ہوئے کہا کہ ''تخار کے تمام غریب لوگ شب و روز جھولیاں اٹھا اٹھا کر دعائیں کرتے ہیں کہ یا اللہ پھر یہاں پر طالبان آ جائیں اور ہمیشہ کے لیے آ جائیں۔'' میں نے اس بچے کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''میرے بھائی غم نہ کرو یہ اندھیری رات جلد ختم ہو جائے گی۔ اور طالبان جلد امن و انصاف کا پرچم لہراتے ہوئے آئیں گے اور ہمیشہ کے لیے آئیں گے۔

جب عبدالرشید کی طبیعت قدرے بہتر ہوگئی تو ایک دن میں نے جیلر ضابط زین الدین کو یاد دلایا کہ ریڈ کراس والے آپ کو کہہ گئے تھے کہ آپ مجھے سویڈش کمیٹی کے ٹانگیں بنانے والے ہسپتال پہنچا دیں، میری یاد دہانی پر ضابط زین الدین نے قریب ہی موجود جیل کے بڑے ذمہ دار امیر احمد سے پوچھا کہ ''اس قیدی کو مصنوعی ٹانگ بنوانے کے لیے ہسپتال لے جانا ہے۔'' امیر احمد نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس معاملہ پر ان دونوں میں خاصی تلخ کلامی ہوگئی، آخر کار ضابط زین الدین نے بحث ختم کرتے ہوئے کہا ''امیر خان! اگرچہ اس قیدی کے ساتھ میرا کوئی رشتہ ہے اور نہ کوئی تعلق ہے لیکن انسانیت کے ناطے میں اسے خود ہسپتال لے کر جاؤں گا اس میں آپ ناراض ہوتے ہیں تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ بہرحال ضابط زین الدین مجھے سویڈش کمیٹی کے ہسپتال لے گیا وہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے خصوصی کرم نوازی فرمائی کیونکہ ہسپتال کا جو ڈائریکٹر تھا وہ ۱۹۹۳ میں لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں آرتھوپیڈک پروفیسر رہ چکا تھا اس طرح اس سے میری جان پہچان نکل آئی دراصل اس ڈائریکٹر جس کا نام عبدالحمید تھا، نے میڈیکل کی تعلیم بھی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور ہی سے حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر عبدالحمید مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا اور اس نے اپنی خصوصی نگرانی میں میری ٹانگ بنوانا شروع کی۔ ٹانگ بنانے کے عمل میں چونکہ کافی دن لگتے ہیں اس لیے ڈاکٹر عبدالحمید اپنی

گاڑی میں جب فارغ ہوتی مجھے جیل سے لے آتے اور چھوڑ بھی آتے علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب روزانہ ہسپتال میں میری خوب تواضع بھی کرتے۔

ضابط زین الدین کے بدخشی پہرے دار مجھے ہسپتال لے جاتے راستے میں اگر کوئی ان سے میرے بارے میں پوچھتا تو بدخشی پہرے دار پوچھنے والے کو بتاتے کہ ''یہ ہمارا کماندان ہے جو بدخشاں سے اپنی ٹانگ بنوانے کے لیے یہاں آیا ہے۔'' وہ کسی کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ یہ پاکستانی قیدی ہے، یہ پہرے دار مجھے ہسپتال سے واپس لاتے ہوئے تخار کے بڑے پارک میں بعض مرتبہ سیر کروانے کے لیے لے جاتے اور بازاروں میں بھی پھرالاتے، یہ لوگ میرے ساتھ نہایت ادب اور احترام سے پیش آتے اور کسی اور کو بھی میرے ساتھ بدتمیزی کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، ایک مرتبہ ہسپتال میں ایک ہزارہ نے میرے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کی، پہرے دار کے منع کرنے کے باوجود بھی جب یہ ہزارہ اپنی بکواس سے باز نہ آیا تو بدخشی پہرہ دار نے اپنی وردی کے بیلٹ کے ساتھ اس کی اچھی خاصی ٹھکائی لگادی اور اسے ہسپتال سے باہر نکال دیا۔

پہرہ دار اکثر مجھے ہسپتال میں چھوڑ کر سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتے اور ظہر کے بعد آ کر مجھے واپس لے جاتے، اسی دوران ایک دن ایک نوجوان شخص مجھے ہسپتال میں آ کر ملا جس نے مجھے بتایا کہ وہ طالبان کی طرف سے آیا ہے، اس نے مجھے ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ ''آؤ میں تمہیں یہاں سے نکال کرلے جاؤں، میں نے مشکوک نگاہوں سے اس آدمی کو دیکھتے ہوئے صاف انکار کر دیا، یہ آدمی تین دن تک میرے پیچھے ہسپتال میں آتا رہا اور مجھے مسلسل یقین دلاتا رہا کہ وہ غلط آدمی نہیں ہے آخری دن تو وہ پل بنگی کے اس پار محاذ پر موجود پاکستانی ساتھیوں کا خط بھی لے کر آیا۔

(دراصل طالبان کا خط اول یہاں سے صرف ایک گھنٹہ کی مسافت پر تھا) مجھے اگرچہ اس متذکرہ شخص پر طالب ہونے اور مخلص ہونے کا یقین آ گیا تھا جس کا ذکر میں نے اس طالب سے کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے بھائی مجھے آپ پر پورا یقین ہے لیکن میں یہاں سے نہیں بھاگوں گا کیونکہ جس شخص نے مجھے اپنی ذمہ داری پر ٹانگ بنوانے کے لیے موقع فراہم کیا ہے

اور جو مجھے ہسپتال بھیجتا ہے اسے اس نیکی کے کام کے لیے اپنے بڑوں سے لڑائی مول لینا پڑی ہے۔ مجھ پر اعتماد کر کے ہی اس نے اپنے حکام کی مخالفت مول لی ہے ایسی صورت میں میں اس ہمدرد انسان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر طالبان کو بدنام نہیں کرنا چاہتا اس لیے میں آپ سے اور اپنے دوسرے ہمدردوں سے معذرت چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ وہ جلد ہم سب قیدیوں کی رہائی کا بندوبست فرما دیں گے۔'' اس پر متذکرہ شخص نے کہا کہ ''آپ کی مرضی......لیکن میرے بارے میں کسی سے تذکرہ نہ کرنا کیونکہ میرے ابھی بہت سے کام یہاں باقی ہیں۔'' میں نے اس شخص کو جواب دیتے ہوئے کہا ''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، جب میں تھوڑا سا احسان کرنے پر اپنے دشمن سے بے وفائی نہیں کر رہا تو اپنوں سے کیسے بیوفائی کروں گا'' اس لیے آپ بے غم ہو کر اپنے کام کرتے رہیں اور ذہن سے نکال دیں کہ آپ کسی قیدی سے ملے تھے۔

طالبان کا احسان نہیں بھول سکتا......

ایک دن صبح دس بجے کے قریب شمالی اتحاد کا کوئی بڑا فوجی افسر جیل میں آیا، جیل حکام سے گپ شپ لگانے اور ملنے کے بعد یہ افسر اکیلا ہی ہمارے کمرے میں آ دھمکا، میں اور بھائی عبدالرشید پریشان ہو گئے اور اپنے آپ کو غلیظ گالیاں سننے کے لیے تیار کرنے لگے کیونکہ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا کہ جب بھی باہر سے کوئی حکومتی اہلکار جیل میں آتا تو وہ اپنی ''بہادری'' کے جوہر ہم ناتواں قیدیوں کو ضرور دکھا کر جاتا چنانچہ اس فوجی افسر کے آنے پر بھی ہم یہی گمان کر رہے تھے لیکن خلاف توقع آنے والے نے ہمارے ساتھ انتہائی اخلاق سے سلام دعا کی اور ہمارے پاس زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا، باتوں باتوں میں اس نے طالبان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ''میں اپنی ماں کا دودھ تو بھلا سکتا ہوں لیکن طالبان کا احسان جو انہوں نے میرے اور میرے ساتھیوں پر کیا نہیں بھول سکتا۔'' ہمارے استفسار پر اس افسر نے طالبان کے احسان کا قصہ سناتے ہوئے کہا کہ ''بامیان کی جنگ میں میں اور میرے ساتھی احمد شاہ مسعود کی طرف سے خلیلی کی مدد کے لیے گئے تھے، جنگ میں ہمیں طالبان کے ہاتھوں سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جس میں میں اور میرے تمام ساتھی طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے

ہمارے علاوہ حزب وحدت کے بھی بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ طالبان نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو حزب وحدت کے افراد سے الگ کر دیا اور ایک طیارے میں بٹھا کر قندھار بھیج دیا، وقت گرفتاری اور قندھار لے جاتے ہوئے کسی بھی طالب نے ہمارے ساتھ کسی قسم کی کوئی سختی اور زیادتی نہیں کی بلکہ طیارے میں سوار کراتے وقت ہمارے ہاتھ باندھتے ہوئے طالبان کے ذمہ دار بار بار ہم سے معذرت کرتے رہے۔ ہمیں لے جا کر قندھار جیل میں بند کر دیا گیا۔" شمالی افسر نے مزید بتاتے ہوئے کہا "قندھار جیل ہمارے لیے صرف نام کی جیل تھی کیونکہ جیل میں ہمیں طالبان کی طرف سے تمام سہولتیں میسر تھیں اور کسی قسم کی تنگی کا وہاں نام ونشان تک بھی نہیں تھا، تفتیش کے دوران بھی طالبان نے ہمارے ساتھ معزز مہمانوں جیسا سلوک کیا اور پھر دو مہینوں بعد طالبان نے ہمیں تحائف دے کر آزاد کر دیا نہ صرف آزاد کیا بلکہ ہمیں ہمارے علاقہ کی سرحد تک پہنچایا، آزاد کرتے وقت طالبان کے ایک بڑے عالم نے صرف اتنی نصیحت کی کہ "حق کو پہچاننے کی کوشش کرو کیونکہ اسی میں نجات ہے۔" اس عالم نے مزید بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم آپ لوگوں کو کسی لالچ میں آزاد نہیں کر رہے اور نہ اس میں ہمارا کوئی ظاہری مفاد ہے بلکہ ہم رضائے الٰہی کے لیے آپ لوگوں کو صرف اس لیے آزاد کر رہے ہیں کہ بدخشاں کے لوگ پکے مسلمان ہیں اور آپ لوگ بھی بدخشان کے رہنے والے ہیں، علاوہ ازیں ہم آپ لوگوں سے یہ تقاضا بھی نہیں کریں گے کہ آپ لوگ ہمارے ساتھ تحریک طالبان میں شامل ہو جائیں، اتنا ضرور کہیں گے کہ حق کو پہچانو، نور اور ظلمات میں تمیز کرنا سیکھو۔" متذکرہ فوجی افسر نے اپنی باتوں کا اختتام کرتے ہوئے کہا کہ "جن لوگوں کو ہم اتنی دور قتل کرنے، تباہ وبرباد کرنے اور ان کے علاقوں پر قبضہ کرنے گئے تھے انہوں نے ہمارے دلوں پر قبضہ کر لیا، وہ چاہتے تو ہمیں میدان جنگ ہی میں قتل کر کے ختم کر سکتے تھے، اگر وہ ایسا کرتے تو یہ ان کا حق تھا لیکن انہوں نے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمارے ساتھ احسان کا معاملہ کیا، یہی وجہ ہے کہ میں طالبان کو معیار حق سمجھتا ہوں اور ان کے احسان کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔" میں نے اس افسر کی داستان سننے کے بعد حیران ہوتے ہوئے کہا "کمانڈر صاحب اگر ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟" کمانڈر نے ہنستے ہوئے کہا: "ضرور پوچھو میں بالکل ناراض نہیں

ہوں گا، بلکہ مجھے یقین تھا کہ آپ مجھ سے ضرور سوال کریں گے۔'' میں نے کہا: ایک طرف آپ طالبان کے اس قدر احسان مند ہیں کہ ان کے احسان کے مقابلہ میں ماں جیسے عظیم ہستی کو ہیچ سمجھتے ہیں اور طالبان کو معیار حق کہتے ہیں جبکہ دوسری طرف آپ طالبان کے مقابلہ میں احمد شاہ مسعود کے ساتھ ہیں اور اس کی قوت میں اضافہ کا باعث بنے ہوئے ہیں؟''

میرے سوال پر کمانڈر نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا ''ہمارے علاقوں میں ہمارے بڑے بڑے خاندان آباد ہیں جو سب کے سب وار لارڈز کے منافق اور عیاش ٹولوں کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں، گویا کہ ہم سب اپنے علاقوں میں یرغمال ہیں، علاوہ ازیں طالبان کے مفتوحہ علاقوں کی کوئی سرحد ہمارے بدخشان کے علاقوں کے ساتھ نہیں لگتی، اگرچہ ہمارے لوگوں نے دو تین بار طالبان کی حمایت میں بغاوت کرنے کی کوشش کی مگر یہ بغاوت سختی سے دبا دی گئی۔'' کمانڈر نے مزید بات کرتے ہوئے کہا کہ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب طالبان بدخشان کی کسی سرحد کے قریب پہنچ گئے تو انہیں بدخشان فتح کرنے کے لیے جنگ نہیں کرنا پڑے گی بلکہ وہ بدخشان کی عوام کو اپنے استقبال کے لیے راستوں میں کھڑا پائیں گے۔'' متذکرہ کمانڈر مزید کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اور ہمیں تسلی اور آزادی کی دعائیں دے کر رخصت ہو گیا۔

احمد شاہ مسعود پر حملہ

ایک دن ہم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً جنگی طیارے کی گھن گرج سنائی دی اور ساتھ ایک زوردار دھماکا ہوا جس سے جیل کے در و دیوار لرز اٹھے، ایسے لگتا تھا جیسے جیل کے بہت ہی قریب طالبان کے جنگی جہاز نے بم پھینکا ہو۔ شام کے وقت میں نے ایک بدخشی پہرہ دار کو جو ہمارے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا آواز دے کر کمرے میں بلایا جب وہ پہرہ دار کمرے میں آ گیا تو میں نے باتوں باتوں میں اس سے دوپہر کے وقت جہاز سے پھینکے گئے بم کے بارے میں پوچھا تو پہرے دار نے حیران کن انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ ''آج کے اس حملہ میں آمر صاحب احمد شاہ مسعود بال بال بچے ہیں۔'' پہرہ دار نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ''آج دوپہر کے وقت احمد شاہ مسعود گریژون (فوجی مرکز) سے ایک اہم اجلاس کے بعد

گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہیلی کاپٹر کی طرف جا رہے تھے، تین روسی کمانڈر بھی آمر صاحب کے ساتھ تھے جو دوسری گاڑی میں بیٹھ کر ہیلی کاپٹر کی طرف جا رہے تھے، دونوں گاڑیاں گریژون کی عمارت سے ایک ساتھ ہی نکلی تھیں، آمر صاحب کی گاڑی گیٹ کے پاس رک گئی کیونکہ ایک شمالی کمانڈر نے آمر صاحب کی گاڑی میں سوار ہونا تھا جو شمالی اتحاد کے افسروں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا جبکہ روسی کمانڈروں کی گاڑی فوجی عمارت سے کچھ ہی دور ہیلی پیڈ پر پہنچ گئی اور روسی کمانڈر پہلی کاپٹر میں سوار ہوگئے، جونہی آمر صاحب کی گاڑی نے ہیلی پیڈ کی طرف جانے کے لیے حرکت کی طالبان کا جنگی جہاز آیا جس نے بڑی کامیابی سے دریائے تخار کے کنارے کھڑے ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا اور رفو چکر ہوگیا، ہیلی کاپٹر مکمل طور پر تباہ ہوگیا اور ہیلی کاپٹر میں موجود روسی کمانڈروں سمیت تمام لوگ مارے گئے۔" پہرے دار نے مزید بتایا کہ اگر طیارہ صرف دو منٹ بعد بم پھینکتا یا آمر صاحب وہاں عمارت کے گیٹ پر ایک دو منٹ کے لیے رک نہ جاتے تو آج آمر صاحب بھی روسی کمانڈروں کے ساتھ اوپر پہنچ جاتے، اگرچہ طالبان نے اپنے طور پر آمر صاحب کو ہٹ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر آمر صاحب کی قسمت اچھی ہے جو بچ گئے۔" پہرے دار نے مزید انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ "کچھ دن پہلے بھی طالبان نے جنگی جہاز کے ذریعہ احمد شاہ مسعود کے ایک ہیلی کاپٹر کو فضاء میں شکار کیا تھا جو روس اور انڈیا کی طرف سے ملی ہوئی بہت ساری کرنسی اور جنگی ساز وسامان لے کر پنجشیر جا رہا تھا۔"

قاتل............

تخار شہر کی اس جیل میں ایک نوعمر قاتل قیدی بھی بند تھا جس سے میں نے ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا کہ "آپ نے اتنی چھوٹی سی عمر میں قتل کیسے کر دیا۔" میرے اس سوال پر لڑکے نے نہایت افسردگی کے ساتھ اپنی داستان سناتے ہوئے کہا کہ "ایک دن میں اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا کہ ایک ۸۰، ۹۰ سالہ بوڑھا بکریاں چراتے ہوئے ادھر آ نکلا، اس کی بکریاں میرے کھیتوں میں داخل ہوگئیں، میں نے بڑے میاں سے کہا کہ "اپنی بکریاں میرے کھیتوں سے نکال لو کیونکہ یہ فصل کو نقصان پہنچا رہی ہیں، میرے تین چار بار منع کرنے کے باوجود وہ بوڑھا بکریوں کو وہیں لے کر کھڑا رہا تو میں نے غصہ میں آ کر ایک باریک سی چھڑی جو

میں نے پرندوں کو اڑانے کے لیے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی بوڑھے کی کمر پر دے ماری، میرا ارادہ نہ تو بوڑھے کو قتل کرنے کا تھا اور نہ ہی باریک اور نازک سی چھڑی لگنے سے کوئی مرتا ہے لیکن بڑے میاں چھڑی کھاتے ہی گرے اور وہیں مر گئے، قریب کھڑے دوسرے لوگوں نے مجھے پکڑ کر حکام کے حوالے کر دیا جنہوں نے میرے اوپر قتل کا مقدمہ بنا کر یہاں جیل میں لا کر بند کر دیا اور اس طرح وہ بوڑھا جو مرنے ہی والا تھا لیکن وہ مرتے مرتے مجھے قاتل بنا گیا۔

انہیں دنوں بھائی قاری رحمت اللہ بھی لشدہ جیل کے کمانڈر عبدالواسع خان کے ہمراہ اپنے دانتوں کے علاج کے لیے تخار جیل میں آ پہنچے، اگرچہ ان دنوں طالبان کے شدید حملوں کی وجہ سے پورے صوبہ تخار میں ایمرجنسی کی کیفیت طاری تھی اور ویسے بھی کسی مریض کو علاج کے لیے جیل کے عملے کا ازخود ہسپتال لے جانا تقریباً ناممکن تھا لیکن بھائی رحمت اللہ جو لشدہ جیل میں تمام قیدیوں کے باشی (ذمہ دار) تھے کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو قائل کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نواز رکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ خلوص نیت کے ساتھ اپنی انہی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مجھ جیسے مریضوں کو وقتاً فوقتاً علاج معالجے کے لیے تخار شہر یا قریبی ہسپتال میں بھیجنے کے لیے کوشش کرتا رہتا تھا اور اکثر اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔

بھائی رحمت اللہ نے تخار جیل میں جو چند دن گذارے تو اس دوران بھی وہ بے کار نہیں بیٹھا بلکہ اس نے ایک بہت بڑا رسک لے کر ایسا کام کیا جس سے تمام قیدی آخر تک مستفید ہوتے رہے یعنی جب بھائی رحمت اللہ اپنے دانتوں کے علاج کے لیے تخار جیل کے پہرہ داروں کے ساتھ بازار گئے تو وہاں سے انتہائی چالاکی کے ساتھ ایک چھوٹا سا اعلیٰ قسم کا ریڈیو اور ایک تیل سے چلنے والا چولہا خرید کر لے آئے جس کی جیل کے عملہ کو کانوں وکان خبر نہ ہوسکی علاوہ ازیں بھائی رحمت اللہ نے یہاں پر جیل میں قید شمالی اتحاد کے ایک فوجی افسر ضابط (کرنل) دین محمد کے ساتھ تعلق قائم کر لیا جو آگے چل کر رحمت اللہ اور دیگر قیدی ساتھیوں کے بہت کام آیا جس کا تذکرہ ان شاء اللہ آگے چل کر آئے گا۔

رحمت اللہ بھائی کے تخار جیل میں پہنچنے کے تین دن بعد ہم تینوں پاکستانی قیدیوں کو اور قیدی کرنل دین محمد اور دیگر دس شمالی اتحاد کے قیدیوں کو ٹرک پر بٹھا کر واپس لشدہ جیل کی طرف

روانہ کر دیا گیا جبکہ تخار جیل کا سپرٹینڈنٹ میر محمد بھی اپنے پہرہ داروں کے ہمراہ ہمارے ساتھ تھا۔

لڑدہ جیل میں پہنچ کر ہم قیدیوں کو ٹرک سے اتار کر تلاشی وغیرہ کے لیے جیل کی مسجد کے ساتھ لائین میں کھڑا کر دیا گیا اس دوران بھائی رحمت اللہ نے آنکھ بچا کر ہوشیاری کے ساتھ فالتوں کپڑوں والا تھیلا جس میں چولہا وغیرہ چھپایا ہوا تھا مسجد کی کھڑکی کے ذریعہ مسجد کے اندر رکھ دیا جسے وہاں پر موجود ہمارا ایک قیدی ساتھی جو باہر مطبخ میں کام کرتا تھا اور مسجد میں عصر کی نماز پڑھ کر تنہا بیٹھا ہوا تھا چپکے سے اٹھا کر مطبخ میں لے گیا، جب ہم تلاشی وغیرہ کے مراحل سے گزر کر جیل کے اندر پہنچے تو مطبخ والے ساتھی نے کھانے والی کھڑکی سے تھیلا بھائی رحمت اللہ کے سپرد کر دیا جسے بھائی رحمت اللہ اپنے کمرے میں لے آئے۔

بھائی رحمت اللہ نے ریڈیو اور سیلوں کا ڈبہ جو ریڈیو کے ساتھ ہی تخار سے لائے تھے بھائی ابوعبیدہ کے سپرد کر دیا، بھائی ابوعبیدہ نے کمرے کے تمام قیدی ساتھیوں کو سختی سے تاکید کی کہ ریڈیو کا باہر کے کسی آدمی حتیٰ کہ دوسرے کمروں کے اپنے ساتھیوں کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔

بھائی ابوعبیدہ رات کے وقت جب کمرے مقفل ہو جاتے کمبل کے اندر گھس کر خبریں وغیرہ سنتے اور بعد ازیں تمام ساتھیوں میں یہ خبریں اپنی زبانی نشر کر دیتے، جو سینہ بہ سینہ دوسرے کمرے کے ساتھیوں تک بھی پہنچ جاتیں۔

پراسرار بیماری

تخار جیل سے جس دن ہم لڑدہ جیل میں پہنچے اسی دن ہی جیلر عبدالواسع خان نے کلینک اور ساتھیوں کی طبی خدمات کی ذمہ داری مجھے سونپ دی اور کلینک میرے حوالہ کر دیا۔

کلینک میں باہر دیہاتوں وغیرہ کے لوگ بھی چیک اپ وغیرہ کروانے کے لیے اکثر آتے رہتے تھے جن کے بعض اوقات عجیب وغریب قسم کے معاملات ہوتے تھے اسی طرح ایک دن لڑدہ گاؤں سے بوڑھے میاں بیوی اپنی نوجوان اور انتہائی خوبصورت بیٹی کو لے کر میرے پاس کلینک میں آئے انہوں نے بتایا کہ "ہماری بیٹی کو عجیب غریب قسم کے دورے پڑتے ہیں، ہم نے تخار کے ڈاکٹروں کو بھی چیک کروایا ہے لیکن اس کی بیماری کسی بھی ڈاکٹر کی

سمجھ نہیں آئی۔'' لڑکی کی بوڑھی والدہ نے روتے ہوئے بتایا کہ ''یہ ہماری اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے اس کی اس بیماری نے ہمیں اذیت میں ڈال رکھا ہے۔'' میں نے لڑکی کا بغور معائنہ کیا تو لڑکی ظاہری چیک اپ کی رو سے بالکل نارمل نظر آرہی تھی اور پھر جب میں نے لڑکی سے اس کو پڑنے والے دوروں کی تفصیل پوچھی تو اس کی اپنی ہی باتوں میں میں نے تضاد محسوس کیا، آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس لڑکی کو کوئی جسمانی بیماری لاحق نہیں ہے بلکہ یہ کسی نفسیاتی معاملہ میں الجھی ہوئی ہے، پہلے تو میں نے اس معاملہ سے جان چھڑانے کا ارادہ کیا لیکن لڑکی کے بوڑھے ماں باپ کی آہ وزاری سن کر میں نے دل میں سوچا کہ جو نتیجہ میں نے اس لڑکی کے بارہ میں اخذ کیا ہے اس لائن پر ایک کوشش کر لینی چاہیے ممکن ہے میری سوچی ہوئی بات درست ثابت ہو چنانچہ میں نے لڑکی کے ماں باپ کو کہا کہ ''آپ دونوں کلینک سے باہر چلے جائیں اور مسجد میں جا کر بیٹھ جائیں تھوڑی دیر بعد میں آپ کو بلا لیتا ہوں چنانچہ دونوں میاں بیوی اٹھ کر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد میں نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا ''دل آویز (لڑکی کا نام دل آویز تھا)

آپ کا کوئی بھائی نہیں ہے آج سے مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو اور مجھے بتا دو کہ آپ کے ساتھ اصل معاملہ کیا ہے۔'' پہلے تو دل آویز ٹال مٹول کرتی رہی اور اسی بات پر اڑی رہی کہ یہ کوئی پراسرار بیماری ہے جس کی وجہ سے اسے دورے وغیرہ پڑتے ہیں۔'' لڑکی کی پراسرار بیماری دیکھ کر پہلے تو مجھے اپنے اخذ کیے ہوئے نتیجے پر کچھ مایوسی ہوئی کیونکہ میں کوئی اتنا بڑا ماہر نفسیات تو تھا نہیں کہ میری سوچی ہوئی بات ہی حتمی ہو پھر بھی میں نے آخری کوشش کے طور پر ہوا میں تیر پھینکتے ہوئے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا ''دیکھو دل آویز بہن میں تمہارے سارے معاملہ کو سمجھ چکا ہوں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک بھائی ہونے کی حیثیت سے جتنا ممکن ہو سکا تمہاری مدد کروں گا، مجھے سچ سچ اپنی زبان سے بتا دو کہ اصل معاملہ کیا ہے...... اور یہ بھی سن لو کہ اگر تم نہیں بتاؤ گی تو یہ مصنوعی دورے اصل دوروں کی شکل اختیار کر لیں گے اور تمہارا یہ حسن بدصورتی کی شکل اختیار کر لے گا اور تم ساری عمر یونہی گھل گھل کر مرتی رہو گی اور اپنے ماں باپ کو بھی مار ڈالو گی۔'' میرا تیر اس بار عین نشانے پر لگا کیونکہ لڑکی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے

بعد شرماتے ہوئے کہا ”برادر! آپ میری مدد کر سکیں گے؟ وہ...... بات دراصل یہ ہے...... کہ۔“ شرم کے مارے دل آویز کو اپنی بات پوری کرنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی، میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا، میری بہن اپنی بات پوری کرو...... گھبراؤ مت...... تمہارا بھائی تمہارے راز سے کبھی پردہ نہیں اٹھائے گا...... دل آویز نے دوبارہ ہمت کر کے بات شروع کرتے ہوئے کہا ”دراصل میرے ماں باپ جس لڑکے سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ انتہائی بدکردار اور پرلے درجے کا نشئی ہے علاوہ ازیں میری خواہش ہے کہ میری شادی میرے چچازاد سے ہو جائے جو نہایت شریف آدمی ہے، حیا اور شرم کے مارے میں اپنے ماں باپ سے اس بارے میں بات نہیں کر سکتی ہوں چنانچہ میں بیماری اور دوروں کا ڈھونگ رچا کر اس نشئی کے ساتھ شادی کرنے سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

میں نے دل آویز کی داستان سننے کے بعد اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ”میری بہن اگر تمہاری بات درست ہے تو میں کوشش کروں گا کہ تمہاری خواہش پوری ہو جائے کیونکہ شرعاً بھی شادی کے لیے لڑکی کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔“ اب میں تمہارے ماں باپ کو بلاتا ہوں تم خاموشی سے ان کے ساتھ گھر چلی جاؤ...... اور ہاں کل تک کے لیے دورے وغیرہ نہ ڈالنا...... میں کل تم لوگوں کو دوبارہ بلاؤں گا اور تمہاری موجودگی میں میں تمہارے والدین کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“ چنانچہ میں نے اس کے والدین کو بلایا اور ان سے کہا کہ ”معاملہ بڑا نازک ہے اور تمہاری بیٹی کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے لیکن فکر نہ کریں آپ سب لوگ گھر چلے جائیں میں رات کو ایک عمل کروں گا اور آپ لوگوں کی بیٹی کے سر سے بلا کو ٹالنے کی کوشش کروں گا۔“ دونوں بوڑھے میاں بیوی اپنی بیٹی کے بارے میں کافی پریشان ہو گئے اور دوبارہ آنے کا کہہ کر تینوں جیل کے کلینک سے رخصت ہو گئے۔

اگلے دن جب بوڑھے میاں بیوی اپنی بیٹی کو لے کر میرے پاس آئے تو آتے ہی مجھے دعائیں دینے لگے اور بتانے لگے کہ ”الحمدللہ کل سے اب تک ہماری بیٹی کو کوئی دورہ وغیرہ نہیں پڑا، اب ہماری بیٹی بالکل ٹھیک لگ رہی ہے۔“ میں نے ان کو بتایا کہ میں نے رات کو ایک عمل

کیا ہے جس سے مجھے بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے اور باتوں ہی باتوں میں میں نے اس لڑکے کے بارے میں بھی جس کے ساتھ یہ لوگ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے تھے، معلومات حاصل کر لیں، ان کے قول کے مطابق بھی وہ مذکورہ لڑکا نشئی تھا، لڑکی کی بتائی ہوئی بات کی تصدیق ہو گئی تو میں نے لڑکی دل آویز کے ماں باپ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے بنائے ہوئے پلان کے مطابق کہا "بابا...... مجھے میرے عمل سے جو معلوم ہوا ہے اس کے مطابق اگر آپ لوگوں نے اپنی بیٹی کی شادی اس نشئی سے کر دی تو جو چیزیں اس لڑکی پر مسلط ہیں وہ اس کا دماغ نکال کر کھا جائیں گی جس کی وجہ سے نہ صرف تمہاری بیٹی پاگل ہو کر جنگلوں میں بھٹکتی پھرے گی بلکہ تمہارے اوپر بھی مصیبتیں نازل ہونا شروع ہو جائیں گی جن سے تمہیں کبھی بھی چھٹکارا نہیں ملے گا (ایک خوبصورت اور نیک سیرت لڑکی جب اوباش بدکردار نشئی کے گھر میں جائے گی تو ذہنی طور پر یقیناً ابنارمل ہو جائے گی جس سے لڑکی کے والدین بھی ذہنی طور پر تکلیف اور مشکلات کا شکار ہوتے رہیں گے) میری باتیں سن کر لڑکی کے بوڑھے ماں باپ ہل کر رہ گئے (کیونکہ دور دراز پہاڑیوں میں رہنے والے لوگ علم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر توہم پرست ہوتے ہیں اور ایسی باتوں میں جلد آ جاتے ہیں) اور مجھ سے پوچھنے لگے "ڈاکٹر صاحب ہم کیا کریں یہ ہماری بڑھاپے کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے...... ہم اس کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے...... آپ ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں اور پھر کل آپ کے پاس آنے کی وجہ سے ہماری بیٹی ابھی تک ٹھیک ہے...... آپ ہی اس کا کوئی حل بتائیں کہ ہماری بیٹی پاگل ہونے سے بچ جائے، لڑکی کی بوڑھی ماں مسلسل روئے جا رہی تھی، میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے اور لڑکی کے والد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بزرگوار اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کر دیں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اگر آپ کے بھائی کا کوئی بیٹا ہے تو اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دیں تو امید ہے آپ کی بیٹی ہمیشہ خوش و خرم رہے گی۔" میرے بات ختم کرتے ہی بڑے میاں نے جھٹ سے کہا "ہاں...... یہ ٹھیک ہے! میں اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے ہی کر دوں گا...... ضرور کروں گا۔ اس کے لیے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے...... اور پھر میرے بھائی کا بیٹا بہت نیک اور شریف لڑکا ہے۔" بڑے میاں کی ان حوصلہ افزاء باتوں کا لڑکی پر کیا

اثر ہوا میں نہ دیکھ سکا لیکن یقیناً کاک ٹیل برقعے کے اندر وہ پھولے نہ سما رہی ہوگی...... کیونکہ اس کی مراد جو پوری ہو رہی تھی...... اور ایک بدکردار نشئی کے پلے بندھنے سے بچ رہی تھی۔

دو تین ہفتوں کے بعد ایک دن ایک جواں سال باشرع لڑکا اور ایک برقع پوش لڑکی جیل کے مین گیٹ پر کھڑے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے...... یہ جوڑا داخلے کی اجازت ملتے ہی میرے پاس کلینک میں آ گیا...... میں یہی سمجھا کہ کوئی مریض وغیرہ ہے جو معائنہ کی غرض سے آیا ہوگا...... لیکن اس جوڑے میں کوئی بھی مریض نہیں تھا بلکہ آنے والی وہی لڑکی تھی جو کچھ ہفتے پہلے متمرض بن کر میرے پاس آئی تھی اور صحت مند ہو کر گئی تھی...... لڑکی نے کلینک میں داخل ہوتے ہی اپنے ساتھ آئے ہوئے لڑکے کا تعارف کراتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر بھائی یہ میرے خاوند ہیں اور میرے چچا زاد ہیں۔ چند روز ہی قبل ہماری شادی ہوئی ہے لڑکی نے مزید بات کرتے ہوئے کہا: ''محترم بھائی میں آپ کا احسان پوری زندگی نہیں بھول سکتی...... آپ آزاد ہوتے تو آپ کو ضرور اپنی شادی پر بلاتی بعد ازیں لڑکی دل آویز نے اپنے خاوند کے ہاتھ سے بھنی ہوئی مچھلی اور خشک میوے سے بھری ہوئی چھوٹی سی ٹوکری لے کر مجھے دیتے ہوئے کہا: ''بھائی...... ایک غریب بہن کی طرف سے چھوٹا سا تحفہ قبول کر لیں۔'' میں نے لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: ''بہن اس کی کیا ضرورت تھی...... میرے لیے تو آپ کی دعائیں ہی بہت بڑا تحفہ ہیں۔'' آخر میں دونوں میاں بیوی مجھے اور تمام قیدیوں کو آزاد ہونے کی دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

میری اس سرگزشت میں جیل کے باورچی عبدالحکیم جو میرے تخار جیل کے دوست جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے کا تذکرہ نہ کرنا انتہائی ناسپاسی اور احسان فراموشی ہوگا کیونکہ جب سے تخار جیل کے میرے دوست نے عبدالحکیم باورچی سے میرا تعارف اپنا بھائی کہہ کر کروایا تھا اس وقت سے عبدالحکیم میرا انتہائی خیال رکھتا تھا نہ صرف عبدالحکیم بلکہ اس کی بیوی بھی گھر بیٹھے میرے لیے پریشان رہتی تھی اور اپنے خاوند سے کہا کرتی تھی کہ ''جس قیدی کو میرے بھائی نے اپنا بھائی کہا ہے وہ میرا بھی بھائی ہے۔'' عبدالحکیم اکثر میرے دھونے والے کپڑے زبردستی اٹھا کر دھلوانے کے لیے اپنے گھر لے جاتا اور جب میں اسے اس کام سے منع کرتا تو وہ

کہتا کہ ”میں تمہارے کپڑے وغیرہ اپنی مرضی سے نہیں لے جاتا بلکہ یہ تمہاری بہن کا حکم ہے، اگر میں یہ کام نہیں کرتا تو میری بیوی مجھ سے لڑتی ہے۔“ جب کبھی میں بیمار ہو جاتا تو عبدالحکیم اپنے گھر سے میرے لیے ابلے ہوئے انڈے اور آش (ایک افغانی ڈش) بنوا کر لے آتا غرضیکہ عبدالحکیم اور اس کے گھر والوں نے جب تک میں لشڈہ جیل میں رہا بے لوث ہو کر میری خدمت کی اور ہمیشہ میرے ساتھ بھلائی کا سلوک کیا، اللہ رب العزت تخار جیل کے میرے دوست، عبدالحکیم اور ان کے اہل وعیال کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور انہیں خیر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

ایک دن باہر سے چند نئے لوگ جیل میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جیل پر قابض ہو گئے جبکہ عبدالحمید اور عبدالواسع وغیرہ جو جیل کے حاکم تھے منہ لٹکائے جیل سے رخصت ہو گئے، دراصل یہ نئے آنے والے لوگ کوئی قبضہ گروپ نہیں تھا اور نہ ہی ہم قیدیوں کو آزاد کروانے کے لیے طالبان کا کوئی کمانڈو دستہ تھا بلکہ یہ عبدالحمید اور عبدالواسع کی جگہ آنے والا جیل کا نیا عملہ تھا جس نے آتے ہی جیل کا بندوبست سنبھال لیا۔

جیل کا نیا سربراہ مولوی مطیع الرحمٰن جو کہ صوبہ طالقان کے ضلع روہستاک کا رہنے والا تھا ایک دین دار باشرع اور خداترس آدمی تھا یہ جتنا عرصہ جیل کا ذمہ دار رہا قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا رہا، کسی بھی قیدی کو اس سربراہ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ مولوی مطیع الرحمٰن اکثر کلینک میں میرے پاس کافی کافی دیر بیٹھا رہتا، مولوی صاحب طالبان کے بہت بڑے مداح تھے اور اکثر طالبان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ”آج اگر پوری دنیا میں کہیں اسلامی نظام صحیح حالت میں موجود ہے تو وہ طالبان کے زیر کنٹرول علاقے ہیں جہاں مکمل طور پر شرعی قوانین نافذ ہیں علاوہ ازیں جیل سربراہ اپنی حکومت اور حکومتی لوگوں سے سخت نالاں رہتے تھے، مولوی مطیع الرحمٰن طالبان کی فتوحات کی خبریں انتہائی خوشی کے ساتھ مجھے سنایا کرتے تھے۔

قتیبہ ثانی

ایک دن مولوی مطیع الرحمٰن کلینک میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور میرے ساتھ

تاریخ کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ دوران گفتگو اسلام کے ایک عظیم فاتح جرنیل قتیبہ بن مسلم باہلی رحمہ اللہ کا تذکرہ آیا تو مولوی صاحب نے بتایا کہ ''طالبان کے سپہ سالار ملا فضل نے آج کے دور میں قتیبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں تازہ کر دیں۔''......! میں نے مولوی صاحب کے منہ سے اپنے سپہ سالار ملا فضل کی تعریف سن کر ان سے پوچھا کہ ''آپ ہمارے سپہ سالار کی فتوحات کی وجہ سے یہ بات کر رہے ہیں یا کوئی خاص جنگی واقعہ ان سے ظہور پذیر ہوا ہے۔''......؟ میرے اس سوال پر جیل سربراہ مولوی مطیع الرحمٰن نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ملا فضل کی فتوحات اپنی جگہ لیکن ملا فضل نے ''سمنگان'' فتح کرنے کے لیے اس راستے پر پیش قدمی کی جس راستے پر ۱۳۰۰ سال قبل سمنگان فتح کرنے کے لیے قتیبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے پیش قدمی کی تھی اور اس پیش قدمی میں ۱۳۰۰ سال پہلے جس رکاوٹ اور مشکل کا سامنا عظیم جرنیل قتیبہ بن مسلم کو ہوا تھا ویسی ہی رکاوٹ سمنگان کی طرف پیش قدمی کے دوران ملا فضل کو پیش آئی۔'' میں نے جیل سربراہ سے عرض کرتے ہوئے کہا ''مولوی صاحب! آپ مجھے ہمارے جرنیل ملا فضل کی اس جنگی پیش قدمی کی تفصیل نہیں بتائیں گے......''؟ مولوی صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''ہاں...... کیوں نہیں''...... ''دراصل جب شمالی اتحاد کے اتحادی طالقان سے طالبان کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگے تو سب تتر بتر ہو گئے، احمد شاہ مسعود پنجشیر میں جا چھپا جبکہ گلبدین، حکمت یار اور برہان الدین ربانی مزار شریف سے فرار ہو کر بدخشان جا پہنچے اور شیعہ حزب وحدت کے لیڈر استاد محقق نے بامیان میں جا پناہ لی، اس ذلت آمیز پسپائی کے بعد حزب وحدت کے بچے کھچے سپاہی مزار سے بامیان تک مختلف شہروں میں پھیل گئے اور انہوں نے درہ سالنگ کے کئی اہم مقامات پر قبضہ کر کے اپنی قوت کو نئے سرے سے مجتمع کرنا شروع کر دیا۔'' مولوی مطیع الرحمٰن نے مزید حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ''طالبان اب حزب وحدت کی روز روز کی ریشہ دوانیوں کا مکمل طور پر قضیہ نبٹانا چاہتے تھے مگر اس کے لیے انہیں شاہراہ سالنگ کا کنٹرول حاصل کرنا ضروری تھا جس پر حزب وحدت کے بھگوڑے قابض تھے چنانچہ طالبان نے حذب وحدت کا تعاقب کرتے ہوئے جنگی لحاظ سے ایک اہم علاقے ''خلم'' کو اپنا اگلا ہدف قرار دیا جو مزار شریف سے ۶۵ کلومیٹر دور مشرق میں واقع ہے۔ طالبان نے کئی

گھنٹوں کی جنگ کے بعد ''خلم'' پر قبضہ کرلیا، حزب وحدت کے شکست خوردہ جنگجو یہاں سے فرار ہو کر ''خلم'' کے جنوب میں نئی مورچہ بندیاں کرنے لگے علاوہ ازیں حزب وحدت کے سپاہیوں نے ''درہ صیاد'' جو ''خلم'' سے ۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے کے تنگ راستے کو بارود سے اڑا دیا جس سے راستہ مکمل طور پر بند ہو گیا اور طالبان کی برق رفتار پیش قدمی رک گئی، دشوار گذار علاقہ ہونے اور واحد راستہ بھی مسدود ہو جانے کی وجہ سے طالبان کا آگے بڑھنا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا جبکہ ''سمنگان'' کی طرف پیش قدمی جاری رکھنے کا کوئی متبادل راستہ دور دور تک بھی موجود نہیں تھا اور یہی وہ راستہ تھا جہاں سمنگان فتح کرنے کے لیے آج سے ۱۳۰۰ سال قبل سن ۹۱ ہجری میں عظیم مسلم فاتح قتیبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ گذرے تھے اور ''درہ صیاد'' کے عین اسی مقام کو جس کو حزب وحدت کے سپاہیوں نے طالبان پر مسدود کر دیا تھا اس وقت کی حریف قوت نے قتیبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے لشکر جرار کے لیے مسدود کر دیا تھا اور اسی تاریخی مماثلت کی وجہ سے میں ملا فضل کو قتیبہ ثانی کہتا ہوں۔'' اس مقام پر قتیبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی پیش قدمی کئی ہفتوں تک رکی رہی تھی اور ۱۳۰۰ سال بعد ایک مرتبہ پھر مجاہدین اسلام سمنگان کی طرف بھڑتے ہوئے اس جگہ آ کر رکنے پر مجبور ہو گئے، ان حالات میں انتظار کرنا طالبان کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتا تھا چنانچہ طالبان کے سپہ سالار ملا فضل نے اپنے مشیروں کے ساتھ مشورہ کر کے ایک عجیب اور تھکا دینے والا منصوبہ ترتیب دیا اور پھر راتوں رات اس پر عمل بھی کر ڈالا یعنی باہم مشورے سے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس راستہ پر پیش قدمی جاری رکھنا ممکن نہیں تو انہوں نے طویل اور نہایت ہی پر پیچ راستے کے ذریعے پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا جو کئی صوبوں سے گذر کر حزب وحدت کے مورچوں کے عقب میں جا نکلتا تھا، اگرچہ مطلوبہ ہدف پر پہنچنے کے لیے چالیس پچاس کلومیٹر کی جگہ اڑھائی تین سو کلومیٹر سفر کرنا پڑتا مگر طالبان جانتے تھے کہ مزید تاخیر طالبان کے لیے نقصان دہ اور دشمن کے لیے فائدہ مند ہو سکتی تھی چنانچہ طالبان اس فیصلہ پر عمل پیرا ہو کر حرکت میں آ گئے۔'' جیل سربراہ مولوی مطیع الرحمٰن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''ملا فضل نے اپنے لشکر کی کچھ سپاہ کو نمائشی طور پر ''درہ صیاد'' کی پہاڑیوں پر دشمن کے سامنے چھوڑا اور رات کی تاریکی میں لشکر کے بقیہ بڑے حصے کو

لے کر ''خلم'' سے جنوب کی طرف بڑھنے کی بجائے مشرق میں قندوز کی طرف روانہ ہو گئے، یہاں سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں میں طالبان کی یہ فوج قندور پہنچی، قندوز سے ملا فضل نے اپنی سپاہ کے ساتھ صحراء کا دشوار گذار راستہ اختیار کیا اور بغلان پہنچ گئے جہاں سے انہوں نے جنوب کی طرف راستہ اختیار کیا اور ایک غیر معروف کچے راستے پر پیش قدمی کرتے چلے گئے یاد رہے کہ طالبان نے ۲۵۔۳۰ گھنٹوں کا یہ سفر بغیر رکے اور بغیر آرام کئے طے کیا تھا جس کی وجہ سے طالبان تھکاوٹ، بھوک اور پیاس کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے لیکن عزم وہمت کے عظیم پیکروں نے سمنگان کے مرکز ''ایبک'' کے قریب پہنچ کر دم لیا ''ایبک'' اور ''پل خمری'' کے درمیان ''اباطک'' کے مقام پر دشمن کی چند ٹولیاں موجود تھیں جبکہ اس جگہ سے ۳۰ میل دور ایبک شہر فوج سے بالکل خالی تھا کیونکہ حزب وحدت کی تمام سپاہ طالبان کے مقابلہ میں درہ صیاد میں پہنچی ہوئی تھی، ملا فضل کے تھکاوٹ سے چور مگر پر جوش مجاہدین نے بغیر کسی مزاحمت کے صوبہ سمنگان کے مرکز ''ایبک'' شہر پر قبضہ کرلیا، بعد ازیں ملا فضل اپنی سپاہ کے ساتھ برق رفتار پیش قدمی کرتے ہوئے حزب وحدت کے عقب میں جا پہنچے، حزب وحدت کے جنگجوؤں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عقب سے بھی ہم پر کوئی حملہ آ سکتا ہے اس لیے وہ اپنے عقب سے بالکل بے پرواہ تھے، حملے کا انہیں عین اس وقت پتہ چلا جب طالبان ان کے سر پر پہنچ چکے تھے ایسے میں انہیں بھاگنے کا موقع نہ ملا حزب وحدت کے بہت سے سپاہی مارے گئے جبکہ باقی ماندہ کو طالبان نے گرفتار کرلیا، اس فتح کے بعد مزار شریف سے لے کر خلم، ایبک اور سمنگان کا پورا علاقہ طالبان کے قبضہ میں آ گیا۔''

حسن بن صباح کے جانشینوں کی تباہی

میں انتہائی متجسس نگاہوں سے مولوی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ شخص طالبان کے بارے میں اتنی گہری معلومات کس طرح رکھتا ہے، مجھے متجسس دیکھ کر مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب......! آپ کے سپہ سالار ملا فضل کے حصہ میں ایک اور بڑی سعادت بھی آتی ہے...... اور وہ ہے درہ کیان کی پر اسرار دنیا کی تباہی'' یہاں تک پہنچ کر مولوی صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے، میں نے انتہائی پر تجسس لہجے میں مولوی

مطیع الرحمٰن صاحب سے پوچھا ''مولوی صاحب......! درہ کیان میں کس طرح کی پراسرار دنیا ہے.......... اور وہ کونسی سعادت ہے جس کو ملا فضل سے منسوب کر رہے ہیں......؟'' جیل سربراہ مولوی مطیع الرحمٰن نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''درہ کیان گذشتہ ۸۰۰ سالوں سے باطل اسماعیلی فرقہ (آغا خانیوں) کا مرکز تھا اور یہ علاقہ افغانستان میں ہمیشہ غیر ملکی سازشوں کا مرکز رہا ہے۔ اسماعیلیوں کا یہ فرقہ دراصل حسن بن صباح کے باطنی گروہ سے تعلق رکھتا ہے، پانچویں صدی ہجری کے آخری سالوں میں حسن بن صباح نے اپنی دہشت گردانہ کارروائیوں کے لیے شمالی ایران کے پہاڑی علاقے ''قزوین'' میں ''الموت'' نامی پہاڑی کی چوٹی پر ناقابل تسخیر قلعے کو اپنا مرکز بنایا تھا، قلعہ الموت کو ''آشیانہ عقاب'' بھی کہا جاتا تھا، حسن بن صباح نے اپنے فدائیوں کے ذریعہ پوری دنیا کو اتنا دہشت زدہ کیا کہ بہت سی حکومتیں اسے خراج دینے پر مجبور ہوگئی تھیں، حسن بن صباح کے جانشینوں نے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک وحشت و بربریت کے اس سلسلے کو جاری رکھا بالآخر ساتویں صدی ہجری میں ہلاکو خان نے قلعہ الموت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اسے پیوند خاک کر دیا جس سے باطنی فرقہ یہاں سے ختم ہوگیا، ہلاکو خان کے ہاتھوں بچ جانے والے اس فرقے کے لوگ ادھر ادھر بکھر گئے انہیں میں سے کچھ لوگ افغانستان کے درہ کیان میں آ کر آباد ہوگئے اور رفتہ رفتہ یہ جگہ باطنیوں کا نیا مرکز بن گئی، یہاں پر آباد ہونے والے باطنیوں نے قلعہ الموت کی یاد میں یہاں پر بھی جگہ جگہ عقاب کی تصاویر اور مجسمے بنائے ہوئے تھے، طالبان کے حملے سے پہلے منصور نادری درہ کیان کا بے تاج بادشاہ تھا، یہ شخص ہمیشہ طالبان کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتا تھا علاوہ ازیں طالبان کے مخالف گروہوں کو مالی امداد بھی دیتا رہتا تھا، طالبان نے جب منصور نادری کا گھیرا تنگ کرنا شروع کیا تو اس نے فرانس میں موجود اپنے آقا اور آغا خانی جماعت کے پیشوائے اعظم آغا خان کے ساتھ رابطے تیز کر دیئے اور اسے طالبان کی صورت میں سر پر منڈلاتے خطرات سے آگاہ کیا۔

سمنگان اور مزار شریف کی فتح کے بعد طالبان نے اسماعیلیوں کا قضیہ نمٹانے کے لیے ''پل خمری'' کی طرف پیش قدمی شروع کی جہاں پر منصور نادری کا بیٹا سید نادری حکومت کرتا

تھا، طالبان جب سبک رفتار پیش قدمی کرتے ہوئے پل خمری پہنچے تو سید نادری انتہائی بوکھلاہٹ اور افراتفری کی حالت میں پل خمری سے فرار ہوگیا چنانچہ طالبان نے ۱۱ اگست کو پل خمری پر قبضہ کرلیا اور وہاں کا کنٹرول سنبھال لیا اور ساتھ ہی طالبان نے منصور نادری کو دھمکی دی کہ وہ دس دن کے اندر اندر درہ کیان خالی کردے، اس صورت حال میں منصور نادری نے فوراً اپنے آقا آغا خان سے رابطہ کیا اور اسے تازہ ترین، صورت حال سے آگاہ کیا جس کے جواب میں آغا خان نے اسے ڈٹے رہنے کا کہا اور اطمینان دلاتے ہوئے خاص مدد کا وعدہ کیا تاہم کافی دنوں تک درہ کیان اور اس کے اردگرد مکمل سکوت چھایا رہا۔" جب طالبان کی دی ہوئی ڈیڈ لائن میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تب اچانک امریکہ نے شمال مشرقی افغانستان پر کروز میزائلوں سے حملہ کردیا۔ اس حملہ میں اسامہ بن لادن اور حرکت الانصار کے تربیتی کیمپوں کونشانہ بنایا گیا تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۹۸ء کے اس امریکی حملے میں زیادہ تر پاکستانی حرکت الانصار کے مجاہدین اور افغانی شہید ہوئے، دراصل امریکہ دنیا کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ۷ اگست ۱۹۹۸ء کو تنزانیہ اور کینیا میں جو امریکی سفارت خانوں کو بموں سے اڑایا گیا تھا جس میں ۲۲۴ افراد ہلاک اور ۶۰۰ کے لگ بھگ زخمی ہوئے تھے امریکہ کی طرف سے افغانستان پر کروز حملہ ان حملوں کی جوابی کارروائی ہے۔ حالانکہ طالبان نے امریکہ کے اس الزام کی تردید کی تھی۔

خوست کے معسکرات پر امریکی حملے سے منصور نادری اور دیگر طالبان مخالف قوتوں کی باچھیں کھل اٹھیں، امریکی حملے کے بعد طالبان مخالف قوتوں کو یقین ہوگیا کہ اب طالبان امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے، منصور نادری خاص طور پر اس امریکی حملہ کے بعد مطمئن ہوگیا کہ اب طالبان کبھی بھی درہ کیان کا رخ نہیں کرسکیں گے۔ چنانچہ منصور نادری نے شراب شباب سے بھرپور جشن منایا اور ساتھ ہی فون کرکے اپنے آقا آغا خان کا خصوصی شکریہ ادا کرنا نہیں بھولا، شراب وشباب کا یہ جشن رات بھر جاری رہا مگر صبح کے آغاز میں جب اسے خبر ملی کہ طالبان نے درہ کیان پر حملہ کردیا ہے تو اس کا سارا نشہ اتر گیا، طالبان نے سب سے پہلے مارٹر توپ کے گولے سے طاقت ور سیٹلائیٹ فون سسٹم کو نشانہ بنایا جس کے ذریعہ منصور نادری فرانس میں اپنے آقا آغا خان سے رابطہ میں رہتا تھا، سیٹلائیٹ سسٹم تباہ ہونے سے اس کا

فرانس سے رابطہ منقطع ہوگیا، اب منصور نادری کو اپنا انجام بدقریب نظر آنے لگا چنانچہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور چوروں کی طرح جان بچا کر بھاگ گیا، دو دن بعد جب طالبان درہ کیان میں داخل ہوئے تو وادی کیان کی خوبصورتی اور عقاب کی شکل والے منصور نادری کے عجوبہ روزگار محل کو دیکھ کر دنگ رہ گئے جبکہ پہاڑ پر چڑھنے والی ٹرین لفٹ بھی طالبان کے لیے ایک نئی اور حیران کن چیز تھی، طالبان نے عقاب کی شکل والے محل کو توپوں کے گولوں سے اڑا دیا اور درہ کیان میں موجود تمام عقابی مجسموں کو بھی تباہ کر دیا، درہ کیان سے طالبان کو اسلحے کے اتنے بڑے بڑے ذخیرے ملے کہ صرف ایک ڈپو سے تقریباً ۵۰۰ طالبان تین دن تک اسلحہ بارود نکال کر ٹرکوں میں لوڈ کرتے رہے.......... اور اس طرح ملا فضل کو درہ کیان سے اسماعیلیوں باطنیوں کا قلع قمع کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوگئی۔"

میرا طالبان کے بارے میں شمالی اتحاد کے ایک ذمہ دار کی زبانی اتنی گہری معلومات سن کر متجسس ہونا ایک فطری بات تھی چنانچہ میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جیل سربراہ سے پوچھ ہی لیا کہ "مولوی صاحب! طالبان کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات آپ کے پاس کس طرح آ گئیں حالانکہ آپ تو فی الحال شمالی اتحاد کا حصہ ہیں؟" میرے اس سوال پر مولوی مطیع الرحمٰن نے مسکراتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر صاحب! آپ کو اپنے ساتھیوں یعنی طالبان کے بارے میں جاننے اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق تھا سو میں نے آپ کا شوق پورا کر دیا اور طالبان کی فتوحات سے آپ کو آگاہ کر دیا، اس سے آگے یہ سوچنا آپ کے لیے مناسب نہیں کہ مجھے یہ معلومات کہاں سے ملیں۔"

آئینہ جو دکھایا تو..........

ایک دن طالبان کے دو نمائندے پنجشیری حکومتی وفد کے ساتھ لشدہ جیل میں آئے طالبان کے نمائندوں نے ہم قیدیوں کے لیے کچھ رقم دی اور چند گھنٹے جیل حکام کے ساتھ گذارنے کے بعد واپسی کی تیاری کرنے لگے، جانے سے پہلے پنجشیر کے اعلیٰ حکومتی عہدیدار معلم نعیم نے مجھے جیل سربراہ کے دفتر میں بلایا چنانچہ میں کلینک کو مقفل کر کے ان کے پاس جا

پہنچا جہاں پر تمام پنجشیری مجھے خوش اخلاقی سے ملے بعدازیں معلم نعیم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے ایک سوال کا جواب دیں کہ آپ پاکستانی لوگ ہمارے خلاف جنگ کرنے افغانستان کیوں آتے ہو......؟“ معلم صاحب! میں نے معلم نعیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”میں ایک قیدی ہونے کی حیثیت سے آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا...... کیونکہ آپ کے سوال کے جواب میں جو کچھ کہوں گا وہ آپ لوگوں پر گراں گزرے گا اور آپ لوگ خفا ہو کر میرے ساتھ کوئی تادیبی کارروائی کریں گے جس کا میں متحمل نہیں ہوں...... اس لیے میں معذرت چاہوں گا...... معلم نعیم نے کہا: ”ڈاکٹر صاحب ہم دوستانہ ماحول میں بیٹھے ہیں...... جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں بلا خوف کہہ دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی بھی آپ سے خفا نہیں ہوگا۔“ جیل سربراہ مولوی مطیع الرحمٰن نے بھی مجھے حوصلہ دیتے ہوئے اردو زبان میں کہا (مولوی مطیع الرحمٰن اردو اور عربی پر مہارت رکھتے تھے) ”بلا جھجک ان کو آئینہ دکھا دو میرے ہوتے ہوئے کوئی بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ چنانچہ میں نے معلم نعیم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”معلم صاحب جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا اور آپ لوگوں نے روسی سامراج کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی تو اپنے افغانی مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے سب سے پہلے ہم پاکستانی ہی پہنچے تھے جہاں پر آپ لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے قربانیاں پیش کیں تو ہم پاکستانی بھی قربانیاں دینے اور شہادتیں پیش کرنے میں آپ لوگوں سے پیچھے نہیں تھے۔“ یہاں تک پہنچ کر میں نے معلم نعیم سے پوچھا: ”معلم صاحب یہاں تک میں نے کوئی بات غلط تو نہیں کہی؟“ معلم نعیم نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا: ”آپ نے بالکل سچ کہا ہے واقعتاً پاکستانی قوم نے روس کے خلاف جہاد میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا اور ہمارے یہاں سے ہجرت کرنے والوں کو اپنے ملک میں جگہ دے کر اسلام دوستی کا ثبوت دیا تھا اور ہم پاکستانی قوم کے احسانات کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔“

میں نے وہاں پر موجود شمالی اتحاد کے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”محترم حضرات! جب افغان قوم نے عدیم المثال جرأت و بہادری اور عظیم الشان جدوجہد کر کے اور لاکھوں

فرزندان اسلام کی جانوں کے نذرانے پیش کر کے روسی عفریت کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا تو تب آپ کو چاہیے تھا کہ اس عظیم کامیابی کے ثمرات حاصل کرتے ہوئے اس ملک کو امن کا گہوارہ اور ایک شرعی اسلامی سلطنت میں تبدیل کر دیتے مگر افسوس کہ آپ لوگوں نے شہیدوں کے خون سے بے وفائی کی اور کرسی اور حکومت کے لالچ میں آ کر باہم دست و گریبان ہو گئے اور حکومت حاصل کرنے کی اس رسہ کشی میں آپ لوگوں نے عام آدمی کا جینا تک حرام کر دیا، کل تک جو لوگ مجاہد تھے وہ راہزن اور لٹیرے بن گئے، جگہ جگہ پر پھاٹک لگا دیئے گئے جہاں پر عوام سے جگا ٹیکس وصول کیا جاتا اور ان کی عزتوں سے کھیلا جاتا غرضیکہ آپ لوگوں کی آپس کی جنگ کے دوران یہاں پر نہ کسی کی عزت محفوظ تھی اور نہ ہی مال۔ جب آپ لوگوں کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا اور لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو ایسے میں ملا عمر مجاہد اٹھے اور ظلم وستم کے خلاف ڈٹ گئے، افغانستان کی ستائی ہوئی عوام ایسے ہی کسی نجات دہندہ کے انتظار میں تھے چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ملا عمر مجاہد کی تحریک طالبان جو ابتداء میں چند لوگوں پر مشتمل تھی عوامی حمایت سے ایک بہت بڑی مسلح تحریک بن گئی اور ہم لوگ بھی اس امن و آشتی اور اسلامی نظام کی علمبردار تحریک میں آ کر شامل ہو گئے اور پھر چند ہی سالوں میں طالبان نے ۷۰ فیصد افغانستان پر کنٹرول حاصل کر لیا جہاں پر انہوں نے شرعی اسلامی قوانین نافذ کیے جس سے عوام خوشحال ہو گئی اسلامی نظام کی برکت سے طالبان کے زیر کنٹرول پورا ملک امن کا گہوارہ بن گیا۔'' میری کھری کھری باتیں سن کر شمالی اتحاد کے عہدیداروں کی تیوریاں چڑھ گئیں اور وہ غصے میں الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے اور عجیب وغریب منطق جھاڑنے لگے، ان کی الٹی سیدھی اور بے تکی باتوں کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش بیٹھا رہا اور سچ بات تو یہ ہے کہ ان کی تیوریاں دیکھ کر میں اندر ہی اندر سے ڈر رہا تھا کہ نہ جانے اب یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں، آخر کار میری جان میں جان اس وقت آئی جب یہ وفد جیل سے رخصت ہوا۔ وفد کے رخصت ہونے کے بعد مولوی مطیع الرحمٰن نے مجھے شاباش دیتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے پنجشیری وفد کو کھری کھری سنا کر میرا دل خوش کر دیا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

لڑدہ کا زخمی بچہ

لڑدہ گاؤں سے ایک دن ایک آدمی دس بارہ سالہ بچے کو لے کر کلینک میں میرے پاس آیا جس کے بازو پر کندھے کے قریب کافی بڑا زخم تھا، بچے کے ساتھ آنے والے شخص نے بچے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ''اس بچے کا باپ پاگل ہوگیا ہے اور اس نے اپنے پاگل پن کی وجہ سے ۲ ہفتے پہلے اس بچے کو کاٹ لیا تھا جس کی وجہ سے یہ بچہ خوف زدہ ہو کر گھر سے نکل بھاگا، دو تین دن بعد جب ہم نے بچے کو تلاش کیا تو اس کے بازو کا زخم جس جگہ اس کے باپ نے کاٹا تھا کافی خراب ہو چکا تھا چنانچہ ہم بچے کو تخار شہر کے بڑے ہسپتال میں لے گئے جہاں پر ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ بچے کا زخم خراب ہو چکا ہے جس کی وجہ سے کندھے سے اس کا بازو کاٹنا پڑے گا ورنہ بچے کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے کیونکہ زخم کا زہر بڑی تیزی سے آگے سرایت کرتا جارہا ہے علاوہ ازیں ہم نے دو تین اور بڑے ڈاکٹروں کو بھی دکھایا ہے سب نے یہی کہا ہے کہ بچے کا بازو کاٹے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، ہمیں ہمارے گاؤں کے ایک رہائشی جو جیل میں پہرہ دار ہے نے آپ کے بارے میں بتایا ہے اس لیے ہم بچے کو آپ کے پاس لائے ہیں...... اس امید کے ساتھ کہ آپ بچے کا بازو بچانے کی شاید کوئی کوشش کرسکیں۔'' میں نے جب بچے کا بازو دیکھا تو واقعتاً بچے کے بازو کا ۲/۳ رینج تک مکمل گل چکا تھا اور اندر سے ہڈی ظاہر ہو چکی تھی جس پر انفیکشن کے اثرات نظر آ رہے تھے، میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کہا ''اگر چہ بچے کے زخم کی حالت واقعتاً بہت خراب ہو چکی ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ بچے کا بازو کٹنے سے بچ جائے۔'' بعد ازیں میں نے بچے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''دیکھو بچے میرے پاس سن کرنے والی کوئی دوائی نہیں اور شہر سے دوائی منگوانے تک آپ کا زخم بالکل ہی خراب ہو جائے گا اس لیے بغیر سن کیے آپ کے زخم کا آپریشن کرنا پڑے گا اور آپریشن کے دوران آپ اپنا بازو بالکل نہیں ہلائیں گے۔'' میری اس بات پر بچے نے کہا ''ڈاکٹر صاحب آپ میرا بازو کٹنے سے بچا دیں میں بالکل بھی کوئی حرکت نہیں کروں گا اور منہ سے بھی کوئی آواز نہیں نکالوں گا۔'' چنانچہ میں نے بچے کے بازو کا گلا ہوا تمام گوشت اور ایک سینٹی میٹر تندرست جلد گوشت سمیت کاٹ کر الگ کر دیا اور ہڈی کو بھی

کھرچ کر صاف کر دیا اس آپریشن میں تقریباً ۲۰، ۲۵ منٹ لگے مگر اس دوران بچے نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ بازو ہلایا اور نہ ہی منہ سے رونے کی کوئی آواز نکالی مگر اتنا ضرور تھا کہ آپریشن کے دوران بچے کی آنکھوں سے مسلسل ٹپ ٹپ کر کے آنسو گرتے رہے، آپریشن کے بعد میں نے بچے کے بازو پر مرہم پٹی کر دی اور کچھ کھانے والی اینٹی بائیوٹک دوائیاں میں نے اپنے پاس سے دے دیں اور کچھ لکھ کر دے دیں کہ تخار سے منگوا لیں اور پھر انہیں اس تاکید کے ساتھ کلینک سے رخصت کر دیا کہ روزانہ بلا ناغہ آ کر پٹی ضرور تبدیل کروالیا کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص فضل وکرم سے بچے کا وہ بازو جسے تخار شہر کے ڈاکٹروں نے کاٹنے کا فیصلہ کیا تھا پانچ چھ ہفتوں کے دوران مکمل طور پر ٹھیک ہو گیا اور زخم بھی بھر گیا، میں نے اللہ رب العزت پر توکل کر کے اور اس دعا کے ساتھ کہ یا اللہ اس معصوم سے بچے کو معذوری سے بچانا بچے کے بازو کے آپریشن کا رسک لیا تھا، اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرما لی اور معصوم سے بچے کو معذوری سے بچا کر مکمل طور پر صحت یاب فرما دیا۔ الحمد لله على ذالك

جیل سربراہ......اور سمگلر

لڑدہ جیل میں سخی داد نامی منشیات کا ایک سمگلر بھی قید تھا جو ہر وقت چرس کے نشہ میں دھت رہتا تھا اس کے ملاقاتی اکثر اس کی ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے اسی طرح ایک دن صبح کے وقت سخی داد کے ملاقاتی آئے جنہیں جیل سربراہ نے اپنے دفتر میں بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد سخی داد کو بھی باہر بلا لیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد خلاف معمول جیل سربراہ مولوی مطیع الرحمٰن اپنے پہرے داروں کو ساتھ لے کر سخی داد سمیت اس کے ملاقاتیوں کی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے، میں حیران تھا کہ آج مولوی صاحب مجھے مل کر کیوں نہیں گئے کیونکہ جیل سربراہ مولوی مطیع الرحمٰن کا یہ معمول تھا کہ جب بھی جیل سے باہر جاتے تو مجھے مل کر اور اللہ حافظ کہہ کر جاتے تھے علاوہ ازیں مولوی مطیع الرحمٰن کا اپنے تینوں پہرے داروں اور سخی داد جیسے اہم حکومتی مجرم کو اپنے ساتھ ملاقاتیوں کی گاڑی میں لے جانا بھی حیران کن تھا، میری یہ حیرانگی شام کے قریب اس وقت ختم ہو گئی جب مولوی مطیع الرحمٰن اپنے پہرے داروں، سخی داد اور اس کے دو ملاقاتیوں

سمیت انتہائی خستہ حالت میں واپس جیل میں آ گئے یہ سب لوگ جیل کے احاطے میں پہنچ کر جب دو گاڑیوں (ان کی گاڑی کے ساتھ ایک فوجی گاڑی بھی تھی) سے اترے تو سب کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے ان سب کو پہلے تشدد کا نشانہ بنایا گیا بعد ازیں انہیں اندر قیدیوں والے حصے میں منتقل کر دیا گیا جبکہ جیل کی ذمہ داری لڑدہ گاؤں کے کمانڈر ملا عطا کے نائب ایوب خان کے سپرد کر دی گئی تھی۔

جیل کا نیا سربراہ یعنی سپرٹینڈنٹ ایوب خان نہایت ہی شقی القلب قسم کا آدمی تھا اس نے کئی دن تک مولوی مطیع الرحمٰن اور اس کے ساتھیوں کو بے رحمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جبکہ اصلی مجرم سخی داد اور اس کے دو ملا قاتیوں کو ہاتھ تک بھی نہیں لگایا گیا۔

چند دنوں کے بعد جب مولوی مطیع الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں پر سختی کم ہوئی تو ایک دن میں نے مولوی صاحب سے پوچھا ''مولوی صاحب یہ آپ نے کیا کیا...........؟ مولوی صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''اللہ کی یہی مرضی تھی......اس میں انسان کیا کر سکتا ہے'' میں نے پھر مولوی صاحب سے سوال کرتے ہوئے پوچھا ''آپ لوگ کہاں جا رہے تھے اور یہ افتاد آپ لوگوں پر کیسے آن پڑی......؟'' میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے مولوی صاحب نے بتایا کہ ''دراصل میری اور میرے ساتھیوں کی منزل ہمارا اصل ٹھکانہ یعنی طالبان کا علاقہ تھا لیکن شومئ قسمت جب ہم فرخار سے نکل کر ''آہن قلعہ' کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں تخار کے گورنر داؤد خان نے جو تخار سے فرخار کی طرف آ رہا تھا ہمیں دیکھ لیا اور ہمیں رکنے کا اشارہ کیا لیکن ہم رکنے کی بجائے تیزی سے آہن قلعہ کے راستے پر آگے نکل گئے، داؤد خان نے آگے کی چوکیوں کے فوجیوں کو ہمارے فرار کی اطلاع دے کر چوکس کر دیا اور خود بھی اپنے محافظوں سمیت ہمارے تعاقب میں آ گیا۔ ہم نے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن چاروں طرف سے گھیرے میں آ جانے کی وجہ سے ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے اور گرفتار ہو کر آپ لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔'' میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ ''مولوی صاحب اگر آپ اکیلے اپنے محافظوں کے ساتھ نکلتے تو آپ آسانی سے کامیاب ہو سکتے تھے پھر آپ نے سخی داد کو ساتھ لے جانے کا رسک کیوں لیا......؟ مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''ڈاکٹر

صاحب یہ ایک راز ہے اور اسے راز ہی رہنے دیں اور اس بارے میں کوئی سوال نہ کریں۔"

نئے جیل سربراہ کی فرعونیت

جیل کے ذمہ دار ایوب خان نے جیل میں ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا یہ قیدیوں سے انتہائی غلیظ زبان میں بات کرتا تھا اور بات بات پر قیدیوں کو شرمناک گندی گالیاں بکتا تھا اور ہر قیدی کو یہ دھمکی دیا کرتا تھا کہ اگر کسی نے میری بات نہ مانی تو مکہ مار کر اس کے ۳۲ دانت اس کے پیٹ میں داخل کر دوں گا۔ تمام قیدی اس فرعون کے روز روز کے ظلم وستم سے عاجز آ چکے تھے۔

جب ظلم وستم حد سے بڑھ جاتا ہے اور عزت نفس مجروح ہونے لگتی ہے تو ایسے میں ہر مظلوم ظلم سے نجات کے طریقے سوچنے لگتا ہے چنانچہ اسی سوچ پر عمل کرتے ہوئے چند مقامی جرائم پیشہ قیدیوں نے ایک رات اپنے کمرے کی عقبی دیوار میں بڑا سا سوراخ کیا اور بیرونی وضو والے احاطے میں نکل آئے جہاں سے انہوں نے جیل سے باہر نکلنے کے لیے دیوار پھلانگنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے پہرہ داروں نے انہیں دیکھا اور للکار کر انہیں دیوار پھلانگنے سے منع کر دیا اور فوراً انہیں جا دبوچا، جیل سربراہ ایوب خان نے سفاکیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاگنے والے قیدیوں میں سے ایک کو گولی سے اڑانے کا حکم دیا تا کہ آئندہ کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے چنانچہ ان میں سے ایک قیدی کو بیرونی وضو والے احاطے سے باہر جانے والے راستہ پر کھڑا کر کے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اور اس کی لاش کو وہیں رہنے دیا گیا اور دو تین دن تک لاش وہیں راستے میں پڑی رہی اور کسی کو بھی ایوب خان کے خوف سے لاش کو راستے سے ہٹانے کی ہمت نہ ہوئی۔

باہر کام پر جانے والے ساتھیوں کو چونکہ اسی راستے سے باہر جانا ہوتا تھا تو انہیں لاش کو پھلانگ کر جانا پڑتا تھا، لاش کی بے حرمتی ہونے کی وجہ سے ساتھیوں کو بہت تکلیف ہوتی تھی، آخر کار تیسرے دن قیدیوں کے ذمہ دار بھائی قاری رحمت اللہ نے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ہے کوئی جوان مرد جو اس لاش کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے میرے ساتھ مل کر اسے وضو والے احاطے کے ایک ویران کمرے میں منتقل کرائے، اس پر چند ساتھیوں نے ہمت

کر کے بھائی رحمت اللہ کے ساتھ مل کر لاش کو ایک ویران کمرے میں منتقل کر دیا لیکن لاش کمرے میں بھی محفوظ نہ رہی کیونکہ وہاں پر لاش کو چوہوں نے کھانا شروع کر دیا اور پھر چند ہی دنوں میں لاش سے بدبو اٹھنا شروع ہوگئی جس سے پوری جیل کا ماحول متعفن ہوگیا اور سانس لینا دشوار ہونے لگا تو ایک بار پھر بھائی رحمت اللہ نے ہمت کی اور مولوی عبدالصمد صاحب اور مولوی عبدالجلیل صاحب (یہ دونوں حضرات بلوچستان کے رہنے والے عالم دین اور ہمارے قیدی ساتھی تھے) کو ساتھ لیا اور جیل سربراہ ایوب خان کے پاس چلے گئے اور اس سے لاش کو دفنانے کی اجازت مانگی پہلے تو ایوب خان اسی بات پر اڑا رہا ہے کہ لاش یونہی پڑی رہے تا کہ تم سب قیدی اس سے عبرت پکڑتے رہو لیکن جب بھائی رحمت اللہ نے ایوب خان کو اپنے انداز میں خوف زدہ کرتے ہو کہا ''اگر لاش یونہی پڑی رہی تو اس کی بدبو سے خوفناک وبائیں پھیلنا شروع ہو جائیں گی جس سے جہاں جیل کے قیدی اور پہرے دار متاثر ہوں گے وہیں پر آپ کی بستیاں بھی ان وباؤں کی لپیٹ میں آجائیں گی اور اگر ایک دفعہ اس لاش کی بدبو سے کوئی وبا شروع ہوگئی تو پھر وہ روکنے سے بھی نہیں رکے گی اس لیے آپ قیدیوں پر نہیں تو اپنی بستیوں کے لوگوں پر ہی احسان کرتے ہوئے اس لاش کو دفنانے کی اجازت دے دیں۔'' بھائی رحمت اللہ کی اس گفتگو سے فرعون صفت ایوب خان کافی حد تک خوفزدہ ہوگیا اور لاش کو دفنانے کی اجازت دیتے ہوئے اس نے بھائی رحمت اللہ اور مولوی صاحبان سے کہا: ''ایسی بات ہے تو آپ آج ہی........ آج ہی نہیں بلکہ ابھی جا کر لاش کو دفنا دیں۔'' چنانچہ بھائی رحمت اللہ نے واپس آکر چند ساتھیوں کو ساتھ ملا کر وضو کے احاطے سے باہر ایک ویران سی جگہ پر ایک گھڑا کھودا اور وہاں پر لاش کو دفنا دیا جس سے وہاں پر موجود تمام لوگوں کو تعفن زدہ ماحول سے نجات حاصل ہوگئی۔

سپرینٹنڈنٹ جیل ایوب خان نے بھاگنے والے قیدی کو اس لیے قتل کیا تھا اور اس کی لاش کی کئی دن تک بے حرمتی کی تھی کہ دوسرے قیدی اس سے عبرت حاصل کریں لیکن ایوب خان کے اس بیہمانہ اقدام کا الٹا اثر ہوا کہ ہر قیدی جیل توڑ کر بھاگنے کے منصوبے بنانے لگا جہاں دو قیدی بیٹھتے یہی موضوع زیر غور ہوتا، سب سے پہلے بھائی رحمت اللہ نے ہر اس قیدی کے لیے

جو جیل سے بھاگے ایک آسانی پیدا کر دی وہ اس طرح کہ قید میں بند بھائی رحمت اللہ کے دوست شمالی اتحاد کے کرنل دین محمد کے ملاقاتی اکثر اس کی ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے چنانچہ بھائی رحمت اللہ نے کرنل دین محمد کو اعتماد میں لے کر اس سے پوچھا کہ "اگر ہمارا کوئی قیدی ساتھی یہاں سے فرار ہو کر آپ کے آدمیوں کے پاس جائے تو کیا وہ اسے پناہ دے سکیں گے......؟ کرنل دین محمد نے بھائی رحمت اللہ کے اس سوال کے جواب میں حق دوستی ادا کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا کوئی ساتھی یہاں سے فرار ہو کر میرے فلاں آدمی کے پاس فلاں جگہ پہنچ جائے تو میرا وہ ساتھی آپ کے فرار ہونے والے قیدیوں کو نہ صرف پناہ دے گا بلکہ بحفاظت طالبان کے علاقہ میں بھی پہنچا دے گا" بھائی رحمت اللہ نے بہت سے قابل اعتماد ساتھیوں کو کرنل دین محمد کے بتائے ہوئے آدمی اور پتے سے آگاہ کر دیا۔

انہیں دنوں تخار کا گورنر داؤد خان لڑدہ جیل کے دورے پر آنکلا اس دوران وہ طالبان قیدیوں سے بھی ملا اور اپنے اتنے بڑے عہدے کا لحاظ کیے بغیر اور انتہائی گری ہوئی سطح پر اتر کر اس نے طالبان قیدیوں کو اپنی غلیظ زبان کے تیروں کا نشانہ بنایا اور خوب دل آزاری کی اگرچہ داؤد خان ظاہری طور پر انتہائی وجیہ اور خوبصورت شکل وصورت کا مالک تھا لیکن جتنا اس کا ظاہر خوبصورت تھا اس سے کئی گنا اس کا باطن خباثت سے بھرا ہوا تھا، یہ بد باطن باہر کلینک میں میرے پاس بھی آیا اور بغیر میری کوئی بات سنے انتہائی غرور و تکبر کے ساتھ اکڑتا ہوا واپس چلا گیا، گورنر تخار داؤد خان واپس تو چلا گیا لیکن قیدیوں کو اپنی بے ہودہ باتوں سے ایک عجیب سے کیفیت میں مبتلا کر گیا۔

گورنر تخار کا تکبر......اور شاہینوں کی پرواز

گورنر تخار نے طالبان قیدیوں سے ملاقات کے دوران ایک بات خاص طور پر انتہائی تکبر اور غرور کے ساتھ کہی تھی کہ "میری تحویل سے کوئی مائی کالال کبھی بھی نہیں نکل سکتا اس لیے یہاں سے بھاگنے کا کبھی سوچنا بھی نہیں ...... اللہ رب العزت نے گورنر تخار داؤد خان کا غرور چند ہی گھنٹوں میں خاک میں ملا دیا کیونکہ اس کے جیل سے رخصت ہونے کے ٹھیک تین گھنٹوں کے بعد دن کی روشنی میں نماز عصر کے وقت تین طالبان قیدی جن میں بھائی کشمیری

بلوچستان کے رہنے والے، بھائی خیال محمد اور مکہ مکرمہ کے رہائشی بھائی محمود شامل تھے تمام جیل انتظامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اور جیل سربراہ اور گورنر تخار کے غرور و تکبر کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے جیل سے فرار ہو گئے، جیل انتظامیہ کو دو گھنٹوں کے بعد ان ساتھیوں کے فرار کا اس وقت پتہ چلا جب انہوں نے نماز مغرب کے بعد حسب معمول قیدیوں کو کمروں میں بند کرنے کے لیے گنتی کی۔ بھائی رحمت اللہ نے طالبان قیدیوں کے ذمہ دار کی حیثیت سے پہرہ داروں کو انتہائی چالاکی اور غیر محسوس طریقہ سے کافی دیر تک گنتی میں الجھائے رکھا تاکہ بھاگنے والوں کو زیادہ سے زیادہ وقت مل جائے اور وہ جیل کی حدود سے زیادہ سے زیادہ دور نکل سکیں، آخر کار کافی دیر تک پہرہ داروں کو گنتی میں الجھائے رکھنے کے بعد بھائی رحمت اللہ نے پہرہ داروں کو آگاہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ فلاں فلاں قیدی موجود نہیں ہے، تین طالبان قیدیوں کی عدم دستیابی نے جیل انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا اور ان میں ایک ہل چل بپا ہو گئی، جیل سربراہ ایوب خان جیل کی چھت پر کھڑا خارش زدہ کتے کی طرح بھونکنے لگا اور اس نے وائرلیس (ریڈیو) کے ذریعہ تخار تک قیدیوں کے فرار کی اطلاع دی اور خود اس نے پہرے داروں کو لے کر جیل کے ارد گرد مفرور قیدیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

کئی دنوں تک لڑدہ سے تخار تک پوری شدومد کے ساتھ فرار ہونے والے قیدیوں کو تلاش کیا جاتا رہا، جب کئی دنوں کی کوشش اور تگ ودو کے باوجود شمالی اتحاد والے فرار ہونے والے قیدیوں کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے جیل میں یہ افواہ پھیلا دی کہ ''ہم نے فرخار کے قریب فرار ہونے والے قیدیوں کو پکڑ کر وہیں پر مار ڈالا ہے لیکن ہم تمام قیدیوں کو یقین ہو چکا تھا کہ ہمارے ساتھی ان کے ہاتھ نہیں آئے ہیں اور نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں کیونکہ اگر یہ ساتھی پکڑے جاتے تو یقیناً انہیں تمام قیدیوں کے سامنے لا کر مارا جاتا۔

ان ساتھیوں کے فرار کے تقریباً دو مہینوں کے بعد جب موسم سرما اپنے اختتام کو پہنچا اور پہاڑوں پر سے برف پگھلنا شروع ہوئی تو ایک واقعہ نے ہم سب طالبان قیدیوں کو پریشان کر دیا، واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک دن پہاڑی چرواہوں نے لڑدہ جیل کی انتظامیہ کو یہ اطلاع دی

کہ پہاڑوں میں برف کے نیچے سے ایک لاوارث لاش ملی ہے علاوہ ازیں انہوں نے جیل انتظامیہ کو چند کاغذات اور ایک ٹوپی اور ایک جیبی ڈائری دیتے ہوئے بتایا کہ یہ سامان لاش کے لباس کی جیبوں سے برآمد ہوا ہے، جب جیل انتظامیہ نے یہ سامان ہمیں دکھایا تو عرب مجاہد محمود کی ٹوپی اور ڈائری کو ہم نے پہچان لیا جس سے ہم سب قیدیوں کو پتا چل گیا کہ عرب مجاہد محمود دیار غیر میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے آزادی کی جدوجہد کرتے ہوئے بلند و بالا برف پوش پہاڑوں میں گمنامی کی حالت میں برف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر چکا ہے اور اس طرح اسے بگرام سے پر تشدد گرفتاری کے بعد افغانستان اور ایران کی مختلف جیلوں میں پہنچنے والی اذیتوں اور تکالیف سے نجات مل گئی، قدرت نے راہ حق کے اس شہید کی بے گور و کفن نعش کو جنگلی جانوروں کی دسترس سے محفوظ رکھنے کے لیے برف کی سفید چادر کا کفن پہنا دیا اور جب برف پگھلی تو اللہ رب العزت نے طالبان سے ہمدردی رکھنے والے پہاڑی گجر قبیلے کے لوگوں کو اس شہید ناز کی لاش کی طرف متوجہ فرما دیا جنہوں نے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس شہید کو دفنا دیا۔

عرب مجاہد محمود گندمی رنگ اور درمیانے قد کا پر عزم جوان تھا جس نے اسلامی نظام کے قیام کے لیے دیار غیر میں بے مثال قربانی دے کر دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم مثال قائم کر دی۔

اس اطلاع نے ہم تمام طالبان قیدیوں کو فرار ہونے والے دوسرے دو ساتھیوں کے بارے میں تشویش میں مبتلا کر دیا لیکن ہماری یہ تشویش زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہی کیونکہ چند ہی ہفتوں کے بعد ہمیں کرنل دین محمد کے ملاقاتیوں کے ذریعہ معلوم ہوگیا کہ بھائی کشمیری اور بھائی خیال محمد خیر و عافیت کے ساتھ طالبان کے علاقہ میں پہنچ چکے ہیں، یہ مسحور کن خبر سن کر تمام طالبان قیدیوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور تمام ساتھیوں نے شکرانے کے نفل ادا کیے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے ساتھیوں کو محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا۔

قید و بند کی اس داستان کی ترتیب کو برقرار رکھنے کے لیے قیدی ساتھیوں کے جیل سے فرار کے واقعے کے ساتھ ان کے فرار ہونے کی تفصیل کہ وہ کس طرح جیل سے نکلے اور طالبان

کے آزاد علاقہ میں پہنچنے کے لیے کن کن مشکلات اور مراحل سے گذرے لکھنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ تسلسل برقرار رہے۔ یاد رہے کہ ان ساتھیوں کے جیل سے فرار کی مکمل روئیداد میں نے آزاد ہونے کے بعد فرار ہونے والے ساتھی بھائی کشمیری کی زبانی سنی تھی اب یہ تفصیل اسی کی زبانی یہاں پیش کر رہا ہوں۔

بھائی کشمیری بیان کرتے ہیں کہ.........

گورنر تخار داؤد خان کی توہین آمیز باتوں سے میرے دل کو بہت چر کے لگے اور اس کے علاوہ اس کے اس متکبرانہ اور فرعونی دعوے نے کہ میری تحویل سے کوئی جری سے جری آدمی بھی نہیں بھاگ سکتا اور تم لوگ کیا چیز ہو، میری غیرت کو للکارا اور مجھے برانگیختہ کر دیا چنانچہ میں نے اللہ پر توکل کر کے اسی دن جیل سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا اگر چہ میں نے بھاگنے کا منصوبہ تو پہلے کا بنایا ہوا تھا اور میں اس منصوبہ پر پیش رفت بھی کر رہا تھا لیکن گورنر تخار نے مجھے اپنے دورے والے دن ہی بھاگنے پہ مجبور کر دیا۔

فرار ہونے سے چند دن قبل میں نے ایک عرب ساتھی محمود کو اپنا ہم راز بنا لیا۔ جیل کے دو احاطے تھے پہلا احاطہ بڑا تھا۔ جبکہ دوسرا احاطہ پہلے احاطے سے چھوٹا تھا جس میں قیدیوں کو بند کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے 9 کمرے تھے اس چھوٹے احاطے کا دروازہ ایک راہداری سے گزر کر بڑے احاطے میں کھلتا تھا جہاں قضائے حاجت پانی اور وضو وغیرہ کے لیے قیدیوں کو دن میں تین مرتبہ نکالا جاتا تھا یہاں پر ایک طرف بیت الخلا اور دوسری جانب چند ویران کمرے تھے جبکہ ان دونوں کے عین درمیان میں نالے کی صورت صاف پانی کا چشمہ بہتا تھا جب ظہر کے وقت قیدیوں کو وضو وغیرہ کے لیے بڑے احاطہ میں نکالا جاتا تو میں چھت پر کھڑے قیدیوں کی نگرانی کرنے والے پہرے داروں اور ساتھیوں سے نظریں بچا کر بیرونی دیوار کے ساتھ والے ویران کمرے میں داخل ہو جاتا اور میرا ہم راز ساتھی محمود عرب باہر سے کمرے کے دروازے کو کنڈی لگا دیتا جس کی وجہ سے کمرے کے اندر میری موجودگی کا کسی کو شبہ تک نہ ہوتا، میں ظہر سے عصر تک ایک بڑے سے کیل کی مدد سے گارے اور پتھر کی بنی ہوئی بیرونی دیوار میں سوراخ کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور جب نماز عصر کے وضو کے لیے قیدیوں کو دوبارہ بڑے

احاطہ میں نکالا جاتا تو میرا ساتھی سب سے پہلے احاطہ میں داخل ہو کر پھرتی سے کنڈی کھول دیتا اور میں ویران کمرے سے باہر نکل کر جلدی سے ساتھیوں میں گھل مل جاتا اور وضو کر کے اندر چلا جاتا۔

تین دن تک مسلسل کیل کے ذریعہ سے دیوار میں نقب لگانے کی کوشش سے میرے دونوں ہاتھ زخمی ہو چکے تھے، جن کے بارے میں ساتھی استفسار کرتے تھے جس کا میرے پاس خاموش رہنے کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا۔ تیسرے دن حسب معمول عصر کے وقت گیٹ کھلنے پر میرا راز دار ساتھی محمود سب سے پہلے بڑے احاطہ میں داخل ہوا اور آتے ہی اس نے دروازہ کی کنڈی کھول دی اور میں کمرے سے باہر آ گیا اسی دوران بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ایک ساتھی بھائی خیال محمد نے مجھے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا چنانچہ اس نے میرے نزدیک آکر مجھ سے پوچھا کہ ''گیٹ کھلنے کے بعد محمود کے پیچھے دوسرے نمبر پر بڑے احاطہ میں، میں داخل ہوا تھا تو آپ مجھ سے پہلے یہاں پر کیسے پہنچ گئے......؟'' میں نے بھائی خیال محمد کو ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ میری کوئی بات اور کوئی بہانہ ماننے کو تیار نہ ہوا تو آخر کار مجھے اس کو سارا معاملہ بتانا ہی پڑا جس سے وہ بھی ہمارا ہم راز بن گیا اور ہمارے فرار کے منصوبے میں شامل ہو گیا۔

جس دن گورنر تخار نے ہماری عزت نفس کو مجروح اور ہماری غیرت کو چیلنج کیا تو میں نے بیرونی دیوار میں نقب لگانے والے منصوبے کو جسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابھی کچھ دن اور درکار تھے ترک کر دیا اور اسی دن فرار ہونے کے لیے ایک نیا منصوبہ سوچا جس سے دونوں ساتھیوں کو بھی میں نے آگاہ کر دیا تا کہ فرعون صفت گورنر تخار کو باور کرایا جا سکے کہ بھاگنے والوں کو تو تو کیا تیرا پورا لشکر مل کر بھی نہیں روک سکتا۔

داؤد خان کو جیل کا دورہ مکمل کر کے واپس گئے ہوئے ابھی اڑھائی گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ جب ہمیں نماز عصر کے وضو کے لیے بڑے احاطے میں نکالا گیا تو تمام قیدیوں سے پہلے ہم تینوں ساتھی بڑے احاطہ میں داخل ہوئے میرے دونوں ساتھی تو تیزی سے دوسرے ساتھیوں کے بڑے احاطہ میں داخل ہونے سے پہلے مذکورہ کمرے جا چھپے جبکہ مجھے چند لمحوں کی

تاخیر ہوگئی جب میں اس ویران کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو پہرے دار آ گئے چنانچہ میں لوٹا لے کر کمرے کے سامنے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور جونہی مجھے موقع ملا پہرے داروں اور دوسرے ساتھیوں سے نظریں بچا کر پھرتی سے کمرے میں داخل ہوگیا جہاں پر ہم تینوں ساتھی ویران اور تاریک کمرے میں دروازے کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئے اور دروازہ کھلا چھوڑ دیا تاکہ کسی کو شک نہ گزرے۔ تمام قیدی وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر چھوٹے احاطہ میں چلے گئے، گیٹ بند ہونے سے پہلے پہرے داروں نے تمام بیت الخلاء چیک کیے کہ کوئی قیدی رہ تو نہیں گیا بعد ازیں پہرے دار میدان کا چکر لگاتے ہوئے کمروں کے سامنے سے گزرنے لگے اور جب وہ ہمارے کمرے کے نزدیک پہنچے اور ان کے قدموں کی آہٹ ہمیں سنائی دینے لگی تو ہمارے دل دھک دھک کرنے لگے اور ان کا ہر قدم ہمیں اپنے دل پر پڑتا ہوا محسوس ہونے لگا اور پھر جب پہرے دار ہمارے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچے اور باہر سے ہی کمرے میں جھانکنے لگے تو ہم تینوں کی حالت انتہائی غیر ہونے لگی کیونکہ پہرہ داروں میں سے کوئی اگر تھوڑا سا اندر ہو کر دیکھ لیتا تو ہم ضرور پکڑے جاتے لیکن ایسے میں اللہ رب العزت نے مدد فرمائی اور پہرہ داروں کی آنکھوں اور عقل دونوں کو اندھا کر دیا اور وہ کمرے میں سرسری سی نگاہ ڈال کر آگے گزر گئے تب کہیں جا کر ہمیں سکھ کا سانس نصیب ہوا۔

ہم اس ویران کمرے میں بیٹھے پہرہ داروں کے اندر جانے کا انتظار کرنے لگے، ہم کمرے کے اندر ہونے کی وجہ سے اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ پہرہ دار چھوٹے احاطہ میں چلے گئے ہیں یا کہ نہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے میں نے پہلے ہی ایک قیدی ساتھی کے ذمہ لگا دیا تھا کہ جونہی پہرے دار چھوٹے احاطہ میں داخل ہو کر دروازہ مقفل کر دیں تو اندر سے وہ ہمارے کمرے کی دیوار کو مسلسل دو مرتبہ بجائے اور اگر پہرے دار اندر نہ جائیں تو وہ دیوار کو صرف ایک مرتبہ ٹھونکے تاکہ ہم پہرے داروں کی نقل و حرکت سے آگاہ ہو کر اپنی کارروائی کا آغاز کریں مگر اندر والے ساتھ نے غلطی سے دوسرے کمرہ کی دیوار بجائی جس کا ہمیں صحیح طرح علم نہ ہو سکا جس کی وجہ سے ہم پہرہ داروں کی پوزیشن معلوم نہ کر سکے اور ہم الجھن کا شکار ہونے لگے کہ اب کیا کریں......؟ آخر کار میں نے وقت ضائع کیے بغیر ہمت کر کے کمرے کے

دروازے میں کھڑے ہو کر اردگرد کا جائزہ لیا تو مجھے دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آیا اور اس بڑے احاطے پر مکمل طور سکوت چھایا ہوا تھا، بعد ازیں میں نے اپنے ساتھیوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا "اگرچہ دائیں بائیں مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا پھر بھی میں مزید تسلی کے لیے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینے جا رہا ہوں چنانچہ میں نے احتیاط کے ساتھ باہر نکل کر دائیں بائیں کا جائزہ لیا، داخلی دروازے کو دیکھا جو مقفل تھا، مجھے تسلی ہوگئی کہ بڑے احاطے میں اب ہمارے سوا کوئی بھی نہیں ہے، چھت کا جائزہ لینے کے لیے میں گردن گھما کر کمروں کے سامنے وسط میں بہنے والے چشمے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک چھت پر کھڑے پہرے دار پر میری نظر پڑی اور میں دھک سے رہ گیا لیکن خیر یہ گزری کہ اس کا منہ دوسری طرف تھا جس کی وجہ سے وہ مجھے نہ دیکھ سکا، میں فوراً کمرہ میں واپس آ گیا اور آ کر ساتھیوں کو باہر کے حالات سے آگاہ کیا اور چھت پر موجود پہرے دار کی موجودگی کے بارے میں انہیں بتایا۔

دس منٹ بعد میں نے دوبارہ کمرے سے باہر نکل کر چھت کی جانب دیکھا تو پہرے دار گلے میں کلاشنکوف لٹکائے اسی جگہ پر کھڑا چھوٹے احاطے میں موجود قیدیوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا چنانچہ میں نے کمرے میں آ کر ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ان حالات میں جب پہرے دار اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہا ہمیں کیا کرنا چاہیے............؟ کیونکہ وقت بہت کم رہ گیا تھا اور قیدیوں کی گنتی شروع ہونے میں بھی صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ ہمیں اندھیرا پھیلنے اور قیدیوں کی گنتی شروع ہونے سے پہلے ہر حال میں یہاں سے نکلنا تھا کیونکہ گنتی کے دوران ہماری غیر موجودگی کا راز کھل جانا تھا اور ہماری تلاش شروع ہو جانی تھی چنانچہ ہم تینوں فوراً نکلنے کا فیصلہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے، سب سے پہلے میں باہر نکلا اور میں نے چھت کی جانب دیکھا تو پہرے دار بدستور اندر کی طرف منہ کر کے اسی جگہ کھڑا ہوا تھا، میں کمرے کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا بیرونی دیوار کے پاس پہنچ گیا اور خیال محمد اور محمود کو اشارے سے اپنے پاس بلا لیا، دیوار اونچی ہونے کی وجہ سے اسے اکیلا آدمی عبور نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے بھائی خیال محمد کو اپنے کندھوں پر چڑھایا تاکہ وہ دوسری طرف کود سکے لیکن جونہی خیال محمد میرے کندھوں پر سوار ہو کر دیوار کے اوپر پہنچا تو اس نے نیچے ہو کر گھبرائے ہوئے لہجے میں مگر آہستہ سے کہا کہ دور

چھت کے اوپر پہرے دار موجود ہے جس کا منہ دوسری طرف ہے، اس سے پہلے کہ خیال محمد چھلانگ مار کر واپس نیچے اتر آتا میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ فوراً دوسری جانب کود جاؤ اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کریں گے، میری بات سن کر بھائی خیال محمد دیوار کے اوپر چڑھ گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ باہر کی طرف کود گیا، خیال محمد کے کودنے سے زوردار آواز پیدا ہوئی جس کی وجہ سے ہم اندر رہ جانے والے دونوں ساتھی سخت گھبرا گئے اور بھاگ کر واپس کمرے میں جا چھپے اور پہرے داروں کی فائرنگ کا انتظار کرنے لگے کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ خیال محمد کے کودنے سے پیدا ہونے والی آواز کو یقیناً پہردار نے سن لیا ہوگا مگر اللہ رب العزت کی خصوصی مدد ونصرت سے یہ مرحلہ بھی عافیت کے ساتھ طے ہوگیا اور پہرہ دار مکمل طور پر بے خبر رہا۔

اب یہاں پر زیادہ تاخیر کرنا ہمارے لیے مہلک ثابت ہوسکتا تھا کیونکہ گنتی شروع ہونے میں صرف ۲۰، ۲۵ منٹ باقی رہ گئے تھے چنانچہ ہم نے جلدی سے اپنی چادروں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھا اور جلدی بیرونی دیوار کے پاس پہنچ گئے جہاں پر میں، عرب مجاہد بھائی محمود کے کاندھوں سوار ہوکر دیوار پر چڑھ گیا، میں نے دیکھا کہ پہرے دار ہنوز اسی جگہ کھڑا مکمل طور پر اندر کی جانب متوجہ تھا، اس وقت اگر وہ تھوڑی سی گردن گھما لیتا تو.........بس.........ٹائیں ٹائیں فش ہوجاتا.........! بہرحال میں نے دیوار پر چڑھتے ہی رسی کی طرح بنی ہوئی چادروں کو دیوار کی دونوں جانب لٹکا کر باہم جڑی ہوئی چادروں کا ایک سرا اندر کھڑے ہوئے محمود بھائی کو پکڑا دیا اور باہر کی جانب لٹکتے ہوئے چادر کے حصے کے ذریعہ لٹک کر آرام سے بغیر کوئی آواز پیدا کیے جیل سے باہر اتر گیا اور نیچے اترتے ہی میں نے خیال محمد کی مدد سے چادر کو مضبوطی سے پکڑ لیا، محمود بھائی چادر کی مدد سے انتہائی پھرتی کے ساتھ دیوار کے اوپر پہنچ گئے اور فوراً باہر کی جانب چھلانگ لگا دی جہاں پر ہم دونوں نے اسے کھینچ لیا اور کسی قسم کی کوئی آواز پیدا نہ ہونے دی۔

اب ہم تینوں جیل سے باہر تھے اور اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہے تھے، باہر کا ماحول ہمیں بڑا ہی مسحور کن لگ رہا تھا، ہر طرف سکوت ہی سکوت طاری تھا۔ افطاری کا وقت قریب ہونے کی وجہ سے دور دور تک کوئی بھی بندہ بشر نظر نہیں آرہا تھا، ہم لمحہ بھر دیوار کے پاس رکنے

اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد دریا کے رخ پر جو جیل کے بالکل عقب میں واقع تھا کھیتوں میں بھاگنے لگے۔

کھیتوں کو عبور کر کے ہم نیچے دریا کی طرف اتر گئے، ہم نے دریا کی طرف جانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا کیونکہ اگر ہم سڑک کی جانب جاتے یا سڑک کے متوازی سفر کرتے تو ایسے میں پکڑے جانے کا زیادہ امکان تھا، چنانچہ ہم نے دریا پار کر کے بلند و بالا پہاڑوں میں سفر کرنے کو ترجیح دی، ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے دریا پار کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگے اور پھر ایک مناسب جگہ ملنے پر وہاں سے ہم نے دریا پار کرنے کا فیصلہ کیا لیکن دریا میں اترنا کارے دارد تھا کیونکہ برف باری کے اس موسم میں دریا کا پانی خوفناک حد تک ٹھنڈا تھا جس میں پاؤں تک رکھنا بھی انتہائی مشکل تھا لیکن پکڑے جانے کے خوف اور آزادی کے جوش نے ہماری ہمت بندھائی چنانچہ ہم اللہ کا نام لے کر کپڑوں سمیت جسم میں خون کو منجمد کر دینے والے برفانی پانی میں داخل ہو گئے اور تیز بہتے ہوئے دریا کے پانی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا اور احتیاط کے ساتھ دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگے جب ہم دریا کے وسط میں پہنچے تو دریا کا پانی ہماری کمروں تک آ گیا یہاں پر دریا کا زور بھی زیادہ تھا، ہمارے نچلے دھڑ یخ بستہ پانی کے اندر سن ہو چکے تھے جس کی وجہ سے ہمیں آگے بڑھنے میں بہت زیادہ مشکل پیش آ رہی تھی لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ لڑھکتے ہوئے.......... گرتے اٹھتے بالآخر دوسرے کنارے پر پہنچ ہی گئے لیکن یہاں سے گیلے کپڑوں، سخت ترین سردی اور سن بدن کے ساتھ مزید آگے بڑھنا ہمارے لیے انتہائی مشکل ہو گیا ایک تو سخت ترین سردی تھی اور دوسرا جیل کی بھوک، سختیوں اور مشقتوں نے ہمارے جسموں میں کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا اور اوپر سے ہر لمحے دشمن کے خوف نے ہمیں ادھ موا کیا ہوا تھا۔

دریا کے پار دوسرے کنارے کھڑے ابھی ہم اس سوچ میں غلطاں تھے کہ سن بدن اور ٹھٹھرتے ہوئے جسم کے ساتھ حرکت کیسے کریں کہ یکا یک ہم سے ۳۰۰ میٹر دور جیل سے فائرنگ شروع ہو گئی جس سے پہاڑ گونج اٹھے، فائرنگ کی اس آواز نے ہمارے جسموں میں

بجلیاں بھر دیں اور چند لمحوں کے لیے ہڈیوں کو جام کر دینے والی سردی کا احساس بھی ختم ہو گیا اور ہم بھاگ کر کنارے سے چند میٹر دور پڑی ایک بڑی چٹان کے پیچھے جا چھپے اور جیل سے ہونے والی فائرنگ کی سمت معلوم کرنے لگے یہ دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی کہ فائرنگ ہماری سمت نہیں بلکہ نامعلوم سمت کی طرف ہو رہی تھی۔

دراصل جب گنتی کے دوران پہرے داروں کو ہمارے فرار کا علم ہوا تو ان میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ پاگل کتوں کی طرح ہوائی فائرنگ کرتے اور مغلظات بکتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، جیل کمانڈر ایوب خان جیل کی چھت پر کھڑا پہرہ داروں کو گالیاں بکتے ہوئے مختلف سمتوں میں روانہ کر رہا تھا۔

مفرور جانبازوں کا سنگلاخ اور برفانی پہاڑوں پر سفر

ہم جیل سے دو تین سو میٹر دور اونچائی پر بیٹھے چٹان کے پیچھے سے جیل انتظامیہ میں مچی افراتفری کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے کہ چلو صف دشمناں میں کچھ تو ماتم برپا ہوا جنہوں نے ہمیں پل پل رلایا تھا۔

اب ہم اطمینان سے چٹان کے پیچھے بیٹھے اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنے لگے کیونکہ ہم اپنے عقب میں موجود پہاڑ پر اندھیرا ہونے کے بعد ہی چڑھ سکتے تھے، روشنی میں ہمیں پہاڑ پر چڑھتے ہوئے دور سے دیکھا جا سکتا تھا، جب کہ ہم یہ سوچ کر بھی اپنے آپ کو تسلی دے رہے تھے کہ اس برفانی موسم میں دشمن ہماری تلاش میں دریا پار کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کیونکہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ جاڑے کے اس شدید موسم میں فرار ہونے والے قیدی برف سے ٹھنڈے اور تیز بہاؤ والے دریا کو عبور کریں گے۔ ابھی ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ دفعتاً سامنے سے دشمن کے آدمی ہمیں اپنی تلاش میں آتے ہوئے نظر آئے ہم سب فوراً چٹان کے پیچھے لیٹ گئے، دشمن کے آدمی دریا کے کنارے پہنچ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دریا کے کنارے کنارے آگے کی طرف چلے اور تھوڑی ہی دیر بعد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن یہاں جو قابل ذکر بات ہے وہ یہ ہے کہ جس جگہ پہرے دار کھیتوں سے نکل کر دریا کے کنارے پر پہنچے تھے وہ جگہ جہاں ہم چھپے ہوئے تھے اس کے بالکل سامنے تھی ہمارے اور ان کے درمیان چند میٹر پر

محیط صرف دریا کا پاٹ تھا جہاں سے دشمن تھوڑی سی کوشش کے بعد ہمیں دیکھ سکتا تھا ایسے میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا نقد کرشمہ ہم نے دیکھا کہ جونہی دشمن کے آدمی ہمارے سامنے کنارے پر پہنچے، بادل کا ایک بہت بڑا اور دبیز ٹکڑا ہمارے اور ان کے درمیان آ گیا جس سے ہم دشمن کی نظروں سے محفوظ ہو گئے، اس واقعہ سے ہمیں یقین ہو گیا کہ ان شاء اللہ ہم ضرور کامیابی سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

جب ہر چیز کو تاریکی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہر طرف ہو کا عالم ہو گیا تو ایسے میں ہم نے چٹان کی اوٹ سے نکل کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا، اس بلند و بالا پہاڑ پر ہم صبح تک چڑھتے رہے، صبح دم تک ہماری یہ حالت ہو چکی تھی کہ تھکن کی وجہ سے ٹانگیں ہمارا ساتھ نہیں دے رہی تھیں جس کی وجہ سے ہمیں ہر چند قدم چلنے کے بعد ستانے کے لیے بیٹھنا پڑتا، دراصل ایک لمبی مدت تک جیل میں بند رہنے اور ظلم و ستم کی چکیوں میں پسنے کے بعد دشوار گذار اور برف پوش پہاڑوں میں پر مشقت سفر کرنا ہمارے ناتواں اور لاغر جسموں کے بس کی بات نہیں تھی مگر آزادی کی آرزو اور دشمن کا خوف ہمیں ان پر خار اور برفانی پہاڑوں میں جانب منزل بڑھائے چلا جا رہا تھا، نیچے دور لرزہ خیز جیل ہمیں ایک نقطہ کی مانند نظر آ رہی تھی جسے ہم نے آخری مرتبہ نظر بھر کر دیکھا، جیل میں گزرے تلخ ایام ایک لمحہ کے لیے ہمارے سامنے آ گئے ہم نے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب ہم آزادی کے سفر پر گامزن تھے۔

جب انجانی راہوں پر مسلسل اور بغیر کچھ کھائے پیے سفر کرنے کی وجہ سے ہم تھک کر چور ہو گئے اور چند قدم چلنا بھی دو بھر ہو گیا تو ہم ایک محفوظ جگہ دیکھ کر وہاں پر لیٹ گئے، تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ جتنا جلدی ہو سکے جیل سے زیادہ سے زیادہ دور چلے جائیں کیونکہ دن کی روشنی میں جیل سے دوربین کے ذریعہ ہمیں دیکھے جانے کا ابھی تک احتمال موجود تھا چنانچہ ہم نے تنہا تنہا ہو کر اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا جس کی ترتیب یوں رکھی کہ ہم دو ساتھی ایک جگہ پر بیٹھ جاتے جبکہ تیسرا ساتھی آگے چلا جاتا اور کچھ دور جا کر آرام کرنے کے لیے بیٹھ جاتا پھر دوسرا ساتھی چل کر آگے والے ساتھی کے پاس پہنچ کر بیٹھ جاتا، اسی طرح تیسرا ساتھی بھی کچھ دیر بعد ان کے پاس پہنچ جاتا، چند گھنٹوں کے بعد جب ہم

جیل کے علاقہ سے بہت دور نکل آئے تو ہم نے اکٹھے چلنا شروع کر دیا۔

جوں جوں ہم بلندی کی طرف جا رہے تھے سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس پر مستزاد یہ کہ برفباری بھی شروع ہو گئی۔ جس نے ہمارے سفر کو مزید مشکل کر دیا، دور دور تک کوئی آبادی بھی نظر نہیں آ رہی تھی کہ جہاں برفباری سے بچنے کے لیے پناہ لی جا سکتی، ایسے میں سفر کے دوران ہمیں پہاڑوں کی سنگلاخ چوٹیوں پر چلنا پڑتا کیونکہ ایسی چوٹیوں پر برف جلدی نہیں ٹھہرتی تھی، پہاڑوں کی ڈھلوانی سطح پر اس لیے نہیں چل سکتے تھے کیونکہ ایسی جگہوں پر پھسل کر کھائیوں میں گرنے اور برف میں دب جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

رات کے وقت مطلع صاف ہو گیا اور چاند بھی نکل آیا جس سے ہمیں رات کے وقت سفر جاری رکھنے میں آسانی ہو گئی اور ہم نے سست روی سے اپنا سفر جاری رکھا، اب رک کر کچھ آرام کرنا بھی ہمارے لیے محال تھا کیونکہ رکنے سے جسم ٹھنڈے ہو جاتے تھے اور ٹانگیں حرکت کرنے سے انکار کر دیتی تھیں جبکہ مسلسل چلتے رہنے سے جسم گرم رہتے تھے اور سردی کا بھی بہت زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا اس لیے چلتے رہنا ہی ہمارے حق میں بہتر تھا۔

یہ چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور جس وقت ہم جیل سے فرار ہوئے تھے اس وقت ہمارے پاس زادراہ کے طور پر ایک عدد ماچس اور تھوڑے سے چنے تھے جو جلد ہی ختم ہو گئے۔ چنانچہ راستے میں سحری اور افطاری کے وقت بھوک اور پیاس مٹانے کے لیے ہمیں پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کھانا پڑتی تھی، مسلسل پہاڑی برف کھانے کی وجہ سے ہمارے ہونٹ پھٹ چکے تھے اور گلوں میں چھالے پڑ گئے تھے، جس کی وجہ سے ہمیں سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہونے لگی تھی۔

400 روپے میں مک مکا اور محمود عرب کی گمشدگی

جب بھوک نے کچھ زیادہ ہی ستانا شروع کیا اور بھوک کی وجہ سے بدن نے بھی ساتھ دینے سے انکار کرنا شروع کر دیا تو ایسے میں ہم نے کھانے اور پانی کی تلاش میں پہاڑوں سے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا۔

چاروں طرف پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پہاڑوں کو کسی

نے سفید چادر کے اندر چھپا دیا ہو اور جب پہاڑوں پر برف پڑی ہوئی ہو تو پہاڑوں سے نیچے اترنا انتہائی دشوار اور مشکل ہوتا ہے کیونکہ پہاڑی راستوں پر جا بجا پھیلے ہوئے قدرتی گھڑوں اور کھائیوں کو برف نے چھپا رکھا ہوتا ہے ایسے میں برف پر چلتے ہوئے کسی گڑھے یا کھائی میں پھنسنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہم انتہائی احتیاط کے ساتھ اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے نیچے اترنے لگے اتنی احتیاط کے باوجود بھی ہم قدم قدم پر پھسل جاتے ہم نیچے اترتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے جا رہے تھے کہ یا اللہ ہماری مدد اور رہنمائی فرما۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی اترائی کے بعد ہمیں سامنے کچھ دور چھوٹی سے ایک بستی کے آثار نظر آئے تو ہم نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے رسک لیتے ہوئے بستی میں جانے کا فیصلہ کیا لیکن ہمارا تیسرا ساتھی محمود عرب گرفتاری کے خوف سے نیچے بستی میں جانے پر تیار نہ ہوا اس کا کہنا تھا کہ شمالی اتحاد والے ڈالروں کے لالچ میں مجھے پکڑ کر ہماری حکومت کے حوالے کر دیں گے اس لیے میں ہرگز بستی میں نہیں جاؤں گا اور آپ لوگوں کو روکوں گا بھی نہیں، میں یہیں بیٹھ کر آپ لوگوں کا انتظار کروں گا، چنانچہ ہم دونوں عرب مجاہد کو وہیں ایک محفوظ جگہ پر بٹھا کر نیچے بستی کی طرف روانہ ہو گئے، تھوڑا سا نیچے گئے تو ایک جگہ پر میرا پاؤں پھسلا بھائی خیال محمد نے مجھے سنبھالنا چاہا لیکن وہ مجھے تو کیا سنبھالتا خود بھی پھسل گیا اور اس طرح ہم دونوں برف پر نیچے کی طرف کافی دور تک پھسلتے چلے گئے، خدا کا شکر ہوا کہ آگے ایک بڑی سی چٹان آ گئی جس کے ساتھ ہم پاؤں لگا کر رک گئے وگرنہ ہم یقیناً کسی گہری کھائی میں جا گرتے، یہاں سے اٹھ کر ہم دوبارہ نیچے کی طرف چلنے لگے، یہاں سے ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ دوبارہ پھسل گئے اور بہت نیچے بہتے ہوئے برفانی پانی کے ایک نالے میں جا رکے۔

جس وقت ہم نالے میں گرے اس وقت افطار کا وقت تھا چنانچہ ہم نالے کے کنارے بیٹھ کر روزہ افطار کرنے کے لیے پانی پینے لگے، ابھی ہم پانی پی ہی رہے تھے کہ اچانک دو افراد کہیں سے نمودار ہو کر ہمارے سروں پر سوار ہو گئے، آتے ہی انہوں نے ہماری تفتیش شروع کر دی، کون ہو؟............؟ کہاں سے آ رہے ہو............؟ کہاں جا رہے ہو............؟ یہ دونوں فارسی زبان تھے جو انتہائی تند اور درشت لہجے میں ہم سے مخاطب تھے، ہم نے بہانہ گھڑتے

ہوئے انہیں بتایا کہ "پہاڑوں میں ہماری بکریاں کہیں کھوگئی ہیں جنہیں ہم تلاش کرتے پھر رہے ہیں......" وہ دونوں چونکہ خود بھی چرواہے تھے اس لیے ہماری باتوں میں نہیں آئے اور کہنے لگے کہ "جن برف پوش پہاڑوں سے اتر کر تم آئے ہو ان پہاڑوں پر اگر ہمارے باپ کی لاش بھی پڑی ہو تو ہم لینے نہ جائیں اور تم محض بکریوں کی تلاش میں ان خطرناک پہاڑوں میں گھوم رہے ہو۔" انہوں نے لہجے کو مزید کرخت بناتے ہوئے کہا "بہانے مت بناؤ......! ہمیں پتہ ہے تم لڑدہ جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو...... تمہارے ساتھ ایک تیسرا قیدی بھی تھا جو اب تمہارے ساتھ نہیں ہے...... بتاؤ وہ کہاں ہے......؟ ہم کافی دیر سے تمہارے منتظر تھے کیونکہ جب تم لوگ پہاڑ سے اتر رہے تھے تو ہم نے تمہیں دور ہی سے دیکھ لیا تھا اس وقت تم تین تھے اور اب تمہارا تیسرا ساتھی تمہارے ساتھ نہیں ہے......! جب ہم نے انہیں کوئی جواب نہ دیا تو وہ دونوں ہمیں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے لگے، ہم انتہائی کمزور ولاغر تھے، بھوک اور پیاس نے ہمیں نڈھال کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہم کچھ مزاحمت نہ کر سکے اور ان کے ساتھ گھسٹتے چلے گئے۔

ہم نے منت سماجت کرتے ہوئے چرواہوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں گرفتار کروا کے تمہیں کیا ملے گا؟ جبکہ اگر تم ہمیں چھوڑ دو گے تو اس کے بدلے میں ہم تمہیں رقم دیں گے...... چرواہوں کو ہماری بات سمجھ میں آ گئی اور لالچ میں آتے ہوئے وہ ہماری بات مان گئے۔ میرے پاس لڑدہ جیل میں آنے والے طالبان نمائندے کا دیا ہوا ایک ہزار روپیہ موجود تھا چنانچہ میں نے ان چرواہوں کو ۴۰۰ روپے کے عوض راضی کر لیا جب میں نے انہیں چار سو روپے دیئے تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نوٹوں کو دیکھنے لگے، دراصل یہ خالص پہاڑی لوگ تھے اور کرنسی نوٹوں سے ان کو کم ہی واسطہ پڑتا تھا، رقم لے کر انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہم چلنے لگے تو ہمیں خیال آیا کہ ان سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے لینی چاہئیں چنانچہ میں نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ لوگوں نے ہمیں چھوڑ کر بہت بڑا احسان کیا ہے اب چھوٹی سی ایک اور مہربانی فرمائیں کہ کچھ کھانے پینے کے لیے ہمیں دے دیں کیونکہ ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ (پہاڑوں پر بکریاں چرانے والے چرواہے کھانے پینے کا بندوبست اپنے

ساتھ رکھتے ہیں) ہماری بات سن کر وہ ہمیں قریب ہی موجود اپنے جھونپڑے میں لے گئے جہاں پر انہوں نے کوئلے پر پکی ہوئی بڑی اور موٹی سی روٹی اور لسی ہمیں دی، روٹی پر اگرچہ راکھ اور مٹی لگی ہوئی تھی لیکن شدید بھوک کی وجہ سے یہ روٹی ہمیں بہت ہی لذیذ اور مزیدار لگی، ہم نے کچھ روٹی عرب مجاہد کے لیے بچالی اور وہاں سے رخصت ہوگئے، اب روٹی کھانے اور لسی پینے کی وجہ سے چلتے ہوئے بدن میں قوت اور توانائی کا احساس ہو رہا تھا، جب ہم اس پہاڑ پر چڑھنے لگے، جس پر ہم عرب مجاہد محمود کو بٹھا کر آئے تھے تو چرواہوں نے ہمیں اس پہاڑ پر چڑھنے سے منع کر دیا، جب ہم نے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے اصرار کیا تو انہوں نے ہمیں دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ ''اگر تم نے اس پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں پکڑ کر فوجیوں کے حوالے کر دیں گے۔'' انہوں نے منع کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ ''تم لوگ کوشش کرنے کے باوجود بھی رات گئے تک اس پہاڑ کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکو گے، صبح گدھوں والے (لکڑہارے) پہاڑ پر لکڑیاں چننے آئیں گے جو تمہیں دیکھ کر پکڑ لیں گے اور فوجیوں کے حوالے کر دیں گے اور اس طرح ہم بھی پھنس جائیں گے لہٰذا تم اس پہاڑ پر چڑھنے کا خیال دل سے نکال دو جہاں تک تمہارے ساتھی کا تعلق ہے اسے ہم خود ڈھونڈنے جاتے ہیں تم اس سامنے والی پہاڑی پر چڑھ کر ایک جگہ انتظار کرو جیسے ہی تمہارا ساتھی ملا ہم اسے تمہارے پاس پہنچا دیں گے چنانچہ مجبوراً ہم چھوٹی پہاڑی کی جانب روانہ ہوگئے اور اس پر چڑھنے لگے، چھوٹی پہاڑی بھی اتنی اونچی تھی کہ ہم صبح فجر کے وقت کہیں جا کر اس کی چوٹی پر پہنچے۔

ہم نے پورا دن اس پہاڑ کی چوٹی پر گزارا اور وقفے وقفے سے ہم عرب مجاہد کو زور زور سے آوازیں دیتے رہے کہ شاید وہ ہماری آواز سن لے لیکن دور دور تک اس کا کوئی پتہ نہ چلا اور نہ ہی چرواہوں نے آ کر اس ساتھی کے بارے میں کوئی اطلاع دی۔

عصر کے وقت اچانک کچھ بچے بکریاں لے جاتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرنے لگے، انہوں نے ہمیں دیکھ کر بڑے غور سے ہمارا مشاہدہ کیا اور آگے بڑھ گئے، اب مزید ہمارا یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ ان بچوں نے جا کر ضرور اپنے بڑوں کو بتانا تھا اس طرح ہمارے سب کیے کرائے پر پانی پھر جاتا اور پھر اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا

کیونکہ اب عرب مجاہد کے ملنے کی امید بھی دم توڑ چکی تھی، میرے اندازے کے مطابق جب چرواہوں نے ہمیں پکڑا تھا تو پہاڑ پر بیٹھے ہوئے عرب مجاہد محمود نے ہمیں چرواہوں کے ہاتھوں میں دیکھ کر یقین کر لیا ہوگا کہ ہم گرفتار ہو گئے ہیں چنانچہ وہ اپنی جان بچانے اور گرفتاری سے بچنے کے لیے برف پوش پہاڑوں میں کہیں غائب ہو گیا ہوگا عرب مجاہد کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انہیں پہاڑوں میں خوفناک سردی، بھوک اور پیاس کی وجہ سے شہید ہو گیا ہے۔

چرواہے بچوں کو دیکھ کر اوران کے گذر جانے کے بعد ابھی ہم یہاں سے چلنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ چرواہوں کے ایک اور گروہ نے یہاں قریب سے گذرتے ہوئے ہمیں دیکھ لیا، قبل اس سے کہ ہم پر کوئی مصیبت ٹوٹتی، ہم انتہائی عجلت میں وہاں سے چل پڑے اور ساری رات ہم نے بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھا، اب ہم چھوٹی پہاڑیوں کی بجائے بڑے پہاڑوں پر سفر کر رہے تھے کیونکہ چھوٹی پہاڑیوں پر دن کے وقت لوگوں کی آمد و رفت ہونے کی وجہ سے پکڑے جانے کا خطرہ تھا، ضلع ''کشم'' کی طرف جانے کے لیے ایک اونچے پہاڑ کو عبور کرنا ضروری تھا، چنانچہ ہم اگلی شام تک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے، پہاڑ کی چوٹی پر بہت زیادہ اونچائی ہونے کی وجہ سے ٹھنڈک بہت زیادہ تھی اور پھر مغرب کے بعد برفباری بھی شروع ہوگئی اور سردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا، برف باری نے ہمیں پریشانی میں مبتلا کر دیا کیونکہ رات کے اندھیرے میں اس طوفانی برفباری کے دوران سفر جاری رکھنا ناممکن تھا چنانچہ ہم نے تھوڑی سے کوشش کر کے ایک بڑی سے چٹان تلاش کر لی جو قدرے جھکی ہوئی تھی ہم چٹان کے نیچے ہاتھوں سے برف ہٹا کر بیٹھ گئے اور اللہ کا ذکر کرنے لگے۔

عشاء کی نماز ہم نے تیمّم کر کے ادا کی، نماز ادا کرنے کے بعد ہم چادریں اوڑھ کر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے، ہم چونکہ دو تین دنوں سے مسلسل سو نہیں سکے تھے اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہی بیٹھے بیٹھے ایسے سوئے کہ خطرناک برفباری اور بے پناہ سردی کے باوجود ہماری آنکھ صبح ہی کھلی۔

رات کو ہمارے اوپر جو سکینہ نازل ہوئی، صبح تک اس نے ہمیں چاک و چوبند کر دیا اور ہماری تھکن بھی دور ہوگئی، صبح نماز پڑھنے کے بعد جب ہم نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو ہر

طرف برف ہی برف تھی، پہاڑوں کی چوٹیوں، ندی نالوں، کھائیوں اور گھاٹیوں کو کئی کئی فٹ پڑنے والی برف باری نے برابر کر دیا تھا جس کی وجہ سے کوئی بھی راستہ تلاش کرنا ناممکن ہو چکا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد بادلوں اور دھند نے نیچے آ کر ہر چیز کو نظروں سے اوجھل کر دیا ایسے میں بھی ہم نے اپنا سفر جاری رکھنے کی کوشش کی اور لاٹھیوں کے ساتھ ٹٹول ٹٹول کر راستہ بناتے ہوئے آگے کی طرف چلنا شروع کر دیا، خیال محمد لاٹھی ٹیک ٹیک کر میرے پیچھے آ رہا تھا ایسے میں اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں ایک کھائی میں جا گرا اور گردن تک برف میں دھنس گیا، میں برف سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا لیکن اس کوشش کے نتیجے میں مزید برف میں دھنستا چلا گیا، برف کی ٹھنڈک نے میرے جسم کو سن کر کے رکھ دیا جس سے میرے بدن میں مزید جدوجہد کی سکت باقی نہ رہی اور میں اس ٹھنڈی قبر میں بے بس ہو کر رہ گیا اور اس بے بسی کے عالم میں اپنے ساتھی خیال محمد کو آوازیں دینے لگا، خیال محمد اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر کسی نہ کسی طرح کھائیکے کنارے پہنچ گیا اور کھائی کے کنارے ایک مناسب جگہ لیٹ کر اس نے اپنی لاٹھی میری طرف بڑھائی، میں نے لاٹھی کا سرا مضبوطی سے پکڑ لیا، خیال محمد نے پتھروں کا سہارا لے کر لاٹھی کے ذریعہ مجھے باہر کھینچنا شروع کیا، تھوڑی سی جدوجہد کرنے کے بعد آخر کار وہ مجھے اس ٹھنڈی قبر سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا، میں نے باہر نکل کر اللہ کا شکر ادا کیا جس نے مجھے برف سے بھری ہوئی ٹھنڈی قبر سے نجات عطا کی وگرنہ اگر میں تھوڑی دیر اور برف میں پھنسا رہتا تو یقیناً قلفی کی طرح جم جاتا۔

برف باری کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا، دھند اور بادلوں کی وجہ سے ہمیں کوئی سمت اور نہ کوئی راستہ نظر آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں ساتھی قریب کھڑے ایک دوسرے کی شکلیں تک نہیں دیکھ سکتے تھے برف باری تھمنے کا ہمیں دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا ایسے میں ہمارا ایک قدم بھی آگے بڑھانا ناممکن ہو چکا تھا اور برف میں جم کر فنا ہونا ہمیں صاف نظر آنے لگا۔

ہم دونوں انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنی چادریں نیچے رکھ کر بیٹھ گئے، خیال محمد بھائی نے مجھے اور اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

"کشمیری بھائی......!

غیبی مدد

جس رب نے ہمیں جیل سے دن کی روشنی میں عافیت کے ساتھ نکالا اور جس رب نے سنگلاخ پہاڑوں اور خطرناک راستوں میں قدم قدم پر ہماری مدد کی وہ رب ہمیں یہاں پر بھی بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا، وہ ضروری ہماری مدد کرے گا.........ضرور مدد کرے گا۔" ہم دونوں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دعا مانگنے لگے کہ اے اللہ کریم......تو نے ہمیں طاغوت کی جیل توڑنے کا حوصلہ بخشا......اور تیری ہی عطا کردہ ہمت اور مدد نے ہمیں کامیابی کے ساتھ یہاں تک پہنچایا.........اے اللہ.........ہم بے بس ہو چکے ہیں .... ہماری ہمتیں جواب دے چکی ہیں......... ہمارے حوصلے ہمیں بکھرتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں.........اے اللہ تو نے یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نجات عطا فرمائی......... ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی بڑھکائی ہوئی آگ سے نجات دینے والا بھی تو ہی ہے......... اے رب کریم ہمیں بھی اس ٹھنڈی جہنم اور برفباری سے نجات عطا فرما.........اے ابراہیم و یونس علیہ السلام کے رب ہمارے لیے یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا فرما دے.........

اچانک خیال محمد نے خوشی اور سردی سے کانپتی ہوئی آواز میں چیختے ہوئے کہا: "اٹھو کشمیری بھائی اٹھو.........ادھر دیکھو.........اللہ نے ہماری فریاد سن لی.........اللہ نے ہم پر رحم فرما دیا، میں نے جب ادھر دیکھا جدھر خیال محمد اشارہ کر رہا تھا، ادھر سے بادل بالکل غائب ہو چکے تھے۔

اور آگے جاتا ہوا راستہ صاف نظر آ رہا تھا چنانچہ ہم فوراً اٹھ کر بادلوں کے ہٹنے سے پیدا ہونے والی روشنی کی طرف چلنے لگے اس راستے کے علاوہ اردگرد ابھی تک گھرے بادل اور دھند موجود تھی، ہم سارا دن اسی روشن لکیر میں سفر کرتے رہے، چلتے چلتے عصر کے وقت ایک پہاڑ کی چوٹی سے ہم دونوں ایسے پھسلے کہ نیچے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے، اللہ کے فضل و کرم سے ہم پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتے ہوئے اس طرح دامن کوہ تک پہنچے کہ ہمیں پتا تک نہ چلا علاوہ ازیں وادی میں کچھ دور ایک چھوٹی سی بستی تھی جسے دیکھ کر ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ہم نے نیچے موجود چشمے سے برفیلہ پانی پینے اور وضو کرنے کے بعد بیٹھ کر عصر کی نماز ادا

کی اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ''یا اللہ اس سامنے والی بستی کے لوگوں کے دلوں کو ہمارے لیے نرم کر دے......... یہاں پناہ کے لیے ہمیں کوئی ایسا ٹھکانہ عطا فرما جہاں ہماری درماندگی اور تھکاوٹ جاتی رہے اور ہمیں آرام وسکون میسر آسکے.......... دعا مانگنے کے بعد ہم تھکاوٹ سے چور بدن کو گھسیٹتے ہوئے بستی کی جانب چلنے لگے۔

مسلسل سنگلاخ پہاڑوں اور برف پر چلنے کی وجہ سے ہمارے پاؤں نیچے سے خراب اور انگلیاں گل چکی تھیں، ہمارے پاؤں اب ہمارا وزن اٹھانے سے عاجز آچکے تھے، اسی انتہائی ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر ہی ہم نے بستی میں جانے کا خطرہ مول لیا اور گھسٹتے ہوئے پہاڑی ڈھلوان پر موجود ایک مکان کے سامنے جا پہنچے جہاں پر ایک باشرع آدمی ہمیں باہر کھڑا ہوا ملا جس نے غور سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہم سے پوچھا ''آپ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں......؟'' ہم نے کہانی گھڑتے ہوئے اسے بتایا کہ ''ہمارے گھوڑے پہاڑوں میں کہیں گم ہو گئے ہم انہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔'' میں نے مزید اس آدمی سے التجا کرتے ہوئے کہا ''گھوڑوں کی تلاش اور برفباری نے ہمیں تھکا کر رکھ دیا ہے، اوپر سے رات بھی سر پر آگئی ہے اس لیے براہ کرم ہم مسافروں کو رات گذارنے کے لیے کوئی مناسب ٹھکانہ مہیا فرما دیں، صبح ہوتے ہی ہم کوچ کر جائیں گے...... متذکرہ شخص نے ہماری بات بڑے غور سے سننے کے بعد کہا ''یہاں میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں میں آپ لوگوں کو ٹھہرا سکوں لہٰذا آپ میرے ساتھ نیچے والی بستی میں چلیں جہاں میرے بھائی کا گھر ہے وہاں آپ لوگوں کو شب بسری کے لیے جگہ مل سکے گی۔'' اتنا کہہ کر وہ ہمارے آگے چل پڑا۔

جب ہم متذکرہ شخص سے باتیں کر رہے تھے تو اوپر مکان کے باہر کھڑا ایک باریش آدمی ہمیں بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا، شاید یہ شخص ہمیں، پہلے ہی پہاڑ سے اترتے ہوئے دیکھ چکا تھا، جیسے ہی ہم پہلے والے شخص کے ساتھ آگے بڑھنے لگے اوپر والا شخص نیچے اتر کر ہمارے سامنے آگیا اور ہمارے ساتھ گوجری زبان میں باتیں کرنے لگا، گوجری زبان چونکہ پنجابی زبان سے ملتی جلتی ہے چنانچہ گوجری زبان میں ان کی باتیں سن کر ہمیں خیال گذرا کہ شاید ہم پہاڑوں میں سفر کرتے کرتے کسی پاکستانی علاقے میں پہنچ گئے ہیں لیکن جب ہم نے ان کی

باتوں پر توجہ سے غور کیا تو ہماری یہ غلط فہمی دور ہوگئی، اس آنے والے شخص نے غور سے ہمارا حلیہ دیکھتے ہوا پوچھا کہ ''آپ کون ہیں......؟'' ہم نے اس شخص کو بھی وہی گھوڑوں والی کہانی سنائی......اس آدمی نے دوبارہ ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''مجھے سچ سچ بتادو کہ آپ کون لوگ ہیں، اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے؟'' بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اس شخص نے ہم سے پوچھا ''کیا آپ لڑشدہ جیل سے بھاگے ہوئے طالبان قیدی ہو جن کے بارے میں ریڈیو پر بھی اعلان کیا جاتا رہا ہے۔ یہ دونوں شخص دراصل پہاڑوں پر رہنے والے گوجر قبیلے کے افراد تھے اور گوجر قبیلہ کے بارے میں اکثر یہی سننے میں آتا تھا کہ یہ طالبان کا حامی قبیلہ ہے لیکن مکمل یقین نہ ہونے کی وجہ سے اور اس خوف سے کہ شمالی اتحاد کے آدمی نہ ہوں ہم نے ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

جب ہم نے مکمل طور پر خاموشی اختیار کی اور اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ نہایت ہی ہمدردی اور شفقت کے ساتھ ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا: ''غم نہ کرو میں تمہارا دشمن نہیں ہوں بلکہ خیر خواہ ہوں اس لیے مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، خیال محمد نے اردو زبان میں آہستہ سے مجھے کہا کہ ''ہمارا ہمدرد معلوم ہوتا ہے اس لیے ہمیں سچ سچ بتا دینا چاہیے۔'' چنانچہ ہم نے اسے بتاتے ہوئے کہا کہ ''ہاں......! ہم وہی طالبان قیدی ہیں جو لڑشدہ جیل سے فرار ہوئے تھے ہمارا تیسرا ساتھی برف پوش پہاڑوں میں کہیں گم ہو کر ہم سے بچھڑ گیا ہے۔'' ہماری بات سن کر وہ جلدی سے ہمیں اپنے گھر لے گیا تا کہ یہاں ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے کیونکہ یہاں ان کی برادری کے علاوہ ان کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں فارسی بان بھی رہتے تھے اس نے ہمیں نہایت ہی عزت واحترام کے ساتھ لے جا کر اپنے خاص کمرے میں بٹھا دیا، گھر کے تمام لوگ محبت، عقیدت اور ہمدردی کے ساتھ ہمیں ملے، سب عورتیں اور بچے ہمیں دیکھنے کے لیے آگئے کہ ہمارے گھر میں طالبان آئے ہیں گویا کہ اتنا عرصہ طالبان کا نام سنتے رہے آج زیارت نصیب ہوئی ہے، ہمیں نرم قالین پر بٹھا کر بخاری (کمرہ گرم کرنے والا خاص چولہا) خوب گرم کردی گئی، انہوں نے ہمارے خون رستے زخمی پاؤں سے جوتے اتارے، عورتیں اور بچے ہمارے زخمی پاؤں کو دیکھ کر رونے لگے، بوڑھی عورتیں ہمارے پاؤں کو بوسے دیتیں اور

ہماری بلائیں لیتے ہوئے شمالی اتحاد والوں کو بددعائیں دینے لگیں جبکہ ہمیں وہ دعائیں دیتے نہیں تھک رہی تھیں۔

ہمارے میزبانوں نے فوراً ہمارے لیے مرغ ذبح کیے، گوشت اور گرما گرم یخنی کے ساتھ ہماری تواضع کی، کھانے کے بعد بھاپ اڑاتی ہوئی چائے اور خشک میوہ جات ہمارے سامنے پیش کیے گئے، گھر کا ہر فرد سعادت سمجھتے ہوئے بھاگ بھاگ ہماری خدمت کر رہا تھا، اپنے میزبانوں کا خلوص، ہمدردی اور شفقت دیکھ کر ہم بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے اور ہمارے دلوں سے بے اختیار اپنے فرشتہ صفت میزبانوں کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

محبت وہمدردی کی جذباتی کیفیت ختم ہوئی تو سب گھر والوں نے چھوٹا بڑا اسلحہ جو گھر میں موجود تھا نکالا اور مسلح ہو کر ہمارے سامنے آ گئے اور کہا کہ ''آپ لوگ چونکہ زخمی ہونے کی وجہ سے ابھی سفر کے قابل نہیں ہیں اس لیے موسم سرما ختم ہونے تک آپ لوگ ہمارے پاس رہیں گے، آپ لوگوں کی تلاش میں جو کوئی بھی ادھر آیا اسے ہم دیکھ لیں گے اور آپ لوگوں کو ہرگز کسی کے حوالے نہیں کریں گے اور نہ ہی بے یار و مددگار چھوڑیں گے اس کے لیے ہمارے گھر بار تباہ ہو جائیں یا ہماری جانیں قربان ہو جائیں ہم بالکل دریغ نہیں کریں گے، اب آپ لوگ ہماری پناہ میں ہیں، اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہیں، آپ لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

یہ لوگ اگرچہ شمالی اتحاد کے زیر کنٹرول علاقوں میں رہتے تھے لیکن ان کے دل طالبان کے ساتھ دھڑکتے تھے، ان کے بہت سے جوان طالبان کی صفوں میں شامل ہو کر داد شجاعت دے رہے تھے۔

رات کو ہم مردانہ حصے میں سوئے، گھر کے مرد ہمیں چارپائیوں پر سلاتے اور خود زمین پر سوتے، صبح ہمیں وضو وغیرہ کے لیے گرم پانی دیا گیا، ہم نے وضو کر کے نماز ادا کی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ گزشتہ شب برف میں پھنسنے کی تکلیف اور مشقت ہمارے لیے باعث رحمت ثابت ہوئی کیونکہ اگر ہم برف میں نہ پھنستے تو یقیناً ہم اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے آگے نکل جاتے تو یہ مہربان گھرانہ ہمیں نہ ملتا۔

ہمارے میزبانوں نے ناشتہ میں ہمیں مکھن اور گرما گرم چائے کے ساتھ روٹی کھلائی جبکہ

دوپہر کو انہوں نے بکرا ذبح کر کے اس کا بھنا ہوا گوشت کھلایا، ہمارے میزبان خود کم کھاتے ان کی کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ ہم کھائیں، گھر کے افراد نے نیچے بستی سے اپنے دو اور بھائیوں کو بھی بلا لیا یہ لوگ دن رات مسلح ہو کر پہرہ دیتے رہتے تھے، احتیاط کے پیش نظر یہ لوگ دن کی روشنی میں ہمیں گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے صرف فجر سے پہلے اور مغرب کے بعد ہمیں باہر نکلنے اور گھر کے قریب رہتے ہوئے گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔

ہمارے میزبانوں نے اپنے کچھ افراد بھیج کر ہمارے بتائے ہوئے راستوں اور نشانیوں کی مدد سے ہمارے گمشدہ عرب مجاہد کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ عرب ساتھی انہیں نہ ملا۔

برف پہ کئی روز تک مسلسل چلنے کی وجہ سے چونکہ ہمارے پاؤں گل گئے تھے اس لیے گھر کی بوڑھی عورتوں نے علاج کے لیے ہمارے پاؤں پر مہندی لگا دی تھی جو مسلسل ہمارے پاؤں پر لگی رہتی تھی، ان دور دراز کے بلند و بالا پہاڑی علاقوں میں نہ کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ ہی کوئی حکیم، یہاں پر ڈاکٹروں، حکیموں اور سرجنوں کی کمی کو یہاں کی بوڑھی عورتیں پورا کرتی تھیں صدیوں پرانے طریقوں سے جو پہاڑی جڑی بوٹیوں اور ٹوٹکوں کے ذریعے بیماروں کا علاج معالجہ کرتی تھیں اللہ تعالیٰ نے ان بوڑھی پہاڑی عورتوں کے ہاتھوں میں بے مثال شفاء رکھی تھی جس کی زندہ مثال ہم خود ہیں کہ ان کے علاج سے ہمارے برف سے جلے ہوئے پاؤں چند دنوں میں ٹھیک ہو گئے، ان بوڑھی عورتوں کے خلوص، شفقت و محبت میں سگی ماں جیسا پیار تھا جس نے ہمیں نئے حوصلے اور ولولے عطا کیے۔

یہ گجر قبیلہ بدخشان اور تخار کے پہاڑوں میں ہزاروں کی تعداد میں آباد ہے یہ لوگ اکثر دین دار ہوتے ہیں بھیڑ بکریاں پال کر اپنا گذر اوقات کرتے ہیں، مقامی حکمران ان لوگوں سے ہمیشہ تیسرے درجے کے شہریوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور انہیں نابود کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، شمالی اتحاد کے مسلح لوگ اکثر ان لوگوں پر حملہ آور ہو کر ان کے مال مویشی لوٹتے رہتے ہیں غرضیکہ مقامی حکومتیں ہر قسم کا ظلم و ستم ان پر روا رکھتی ہیں۔

شمالی اتحاد کی بے دینی، لسانی تعصب، غیر انسانی سلوک اور ظلم و ستم نے ان لوگوں کو

طالبان کا حامی بنا دیا تھا، یہ قبیلہ اگرچہ شمالی اتحاد کے زیر کنٹرول علاقوں میں رہتا تھا لیکن یہ لوگ طالبان ہی کو اپنے حقوق کا نگہبان اور نجات دہندہ سمجھتے تھے، ان لوگوں کی نہ صرف دلی تمنا تھی کہ طالبان کی اسلامی حکومت ان کے علاقوں میں بھی آ جائے بلکہ وہ اس کے لیے عملی کوشش میں بھی مصروف تھے، ان کے بہت سے جوان طالبان کی صفوں میں شامل ہو کر اس طرف آنے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، یہ لوگ طالبان کے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ہمہ وقت اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، یہ طالبان کے ساتھ عقیدت اور محبت ہی تھی کہ انہوں نے اپنے گھر بار اور بال بچوں کی پرواہ کیے بغیر اپنا سب کچھ داؤ پر لگاتے ہوئے ہمیں پناہ دی، یہ لوگ اس چیز سے اچھی طرح باخبر تھے کہ اگر شمالی اتحاد کے کسی بھی باشندے کو ہمارے بارے میں ذرا سی بھنک پڑ گئی تو ان کے گھروں کو بال بچوں سمیت تباہ و برباد کر دیا جائے گا لیکن انہوں نے کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں کی۔

ہم لوگوں نے گوجروں کے ہاں رہتے ہوئے دیکھا کہ ان کے بچے بوڑھے اور عورتوں تک سب طالبان کی آس لگائے پہاڑوں پر بیٹھے انتظار کرتے رہتے تھے کہ طالبان ہمارے نجات دہندہ بن کر ظالموں کے ظلم و ستم سے ہمیں نجات دلانے ضرور آئیں گے، بہر حال یہ گجر قبیلہ ہمارا محسن ہے، جن کے احسانات ہم تاعمر فراموش نہیں کر سکتے اس احسان عظیم کا اجر انہیں اللہ تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔

ہم نے تین دن بعد اس خطرے کے پیش نظر کہ ہمارے محسن ہماری وجہ سے کسی افتاد میں نہ پڑ جائیں جانے کی اجازت چاہی لیکن ہمارے عظیم میزبانوں نے یہ کہتے ہوئے ہمیں اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ ابھی تک آپ لوگوں کے پاؤں کے زخم مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئے ہیں جس کی وجہ اس سخت سردی اور برفباری کے موسم میں ابھی تک آپ لوگ سفر کے قابل نہیں ہیں اس لیے ہم آپ لوگوں کو ہرگز جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ہمارے اصرار پر ہمارے رحم دل اور جان نچھاور کرنے والے میزبانوں نے کم از کم پاؤں کے زخم ٹھیک ہونے تک ہمیں سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا۔

ہفتہ بھر آرام کرنے اور عمدہ مقوی غذا کھانے سے ہماری صحت اچھی ہوگئی، جسم تر و تازہ

اور توانائی بحال ہوگئی۔ مکھن دودھ اور گوشت کے استعمال نے ہمیں مکمل طور پر چاک و چوبند کر دیا علاوہ ازیں ہمارے پاؤں کے زخم بھی مکمل طور پر ٹھیک ہو چکے تھے، اب ہم ہر لحاظ سے دوبارہ سفر کرنے کے قابل ہو چکے تھے چنانچہ ہم نے اپنے میزبانوں سے دوبارہ جانے کی اجازت مانگی اب کی بار انہوں نے ہمیں اجازت دیتے ہوئے ہمیں سفر کی مکمل تیار کرا دی۔ ہمارا روپ پہاڑی چرواہوں کی طرح کر کے ہمیں پکولیں (ایسی چترالی ٹوپیاں جو شمالی اتحاد کے علاقوں میں لوگ پہنتے ہیں) پہنا دی گئیں، اب ہم ہاتھوں میں لمبے لمبے ڈنڈے تھامے مکمل طور پر چوپان (چرواہے) لگ رہے تھے، ہمارے میزبانوں نے بھنا ہوا مرغ اور بہت سی خمیری روٹیاں توشہ دان میں باندھ کر ہمارے حوالے کر دیں۔

نماز مغرب کے بعد رات کے اندھیرے میں ہم نے سفر شروع کرنا تھا ہمارے میزبانوں نے اپنے دو لاٹھی بردار آدمی ہمارے ساتھ کر دیئے تا کہ ہمیں حفاظت کے ساتھ طالبان کے علاقہ میں پہنچا آئیں۔

جب ہم اپنا سفر شروع کرنے کے لیے اہل خانہ کا شکریہ ادا کر کے رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلے تو خلوص، اپنائیت اور محبت بھرا ایک عجیب سا جذباتی ماحول پیدا ہو گیا، گھر کے تمام بچے بوڑھے، جوان اور عورتیں ہمیں رخصت کرنے کے لیے گھر کے باہر آ گئے، ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے ہماری آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو جاری ہو گئے، تمام اہل خانہ نے ہمیں پرنم آنکھوں اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، وقت رخصتی ہم نے ایک مرتبہ پھر اہل خانہ کا شکریہ ادا کیا اور کبھی نہ مٹنے والی محبت بھری یادیں لیے ایک مرتبہ پھر عازم سفر ہو گئے۔

راہبر ہمیں کچھ دور تک اسی راستے پر لے کر چلتے رہے جس راستے پر ہم ایک ہفتہ پہلے آئے تھے، تھوڑی دور آگے چل کر ہم اپنے راہبروں کی راہنمائی میں ایک نئے راستے پر چلنے لگے اور چلتے چلتے ایک تند و تیز دریا کے پاس پہنچ گئے، دریا کے تیز بہاؤ کی وجہ سے دریا کے اندر سے گذر کر دریا پار کرنا ناممکن تھا، راہبر نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور پل ہے جہاں پہ اگرچہ عسکر (فوجی) پہرے پر موجود ہوتے ہیں لیکن ہم اس پل کے ذریعہ دریا پار کرنے کی کوشش کریں گے، ہم نے ڈرتے ہوئے اپنے راہبروں سے کہا ”پل پر دشمن کے

ہاتھوں ہم کہیں دوبارہ گرفتار نہ ہو جائیں۔" راہبروں نے ہمارے خدشات دور کرنے کے لیے تسلی دیتے ہوئے کہا "خاطر جمع رکھو" "اللہ مہربان است" چنانچہ ہم چلتے ہوئے پل کے قریب پہنچ گئے وہاں پر کھڑے ہو کر ہم نے حالات کا جائزہ لیا اور پہرہ داروں کی نقل وحرکت دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں ہمیں دور دور تک کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کسی کی کوئی نقل وحرکت محسوس ہو رہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے شمالی اتحاد کے "جیالے" چرس کے نشے میں دھت ہو کر کہیں مدہوش پڑے ہوں گے کیونکہ شمالی اتحاد کے عساکر آزادانہ منشیات کا استعمال کرنے کے عادی تھے اور پھر چرس کو تو وہ فقیری نشہ کہتے تھے اور اس کے استعمال میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

اردگرد سے مکمل اطمینان کرنے کے بعد ہم ایک قطار کی صورت میں دبے پاؤں خاموشی کے ساتھ پل پار کر کے دوسری طرف جا پہنچے اور وہاں سے ہم راہبروں کی معیت میں اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے، ہم بغیر رکے رات بھر چلتے رہے، اب ہم چلنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں کر رہے تھے، گجر راہبروں کے ساتھ چلتے ہوئے رات کے آخری پہر راستے میں آنے والے ایک پہاڑی درے کے قریب ایک مکان میں پہنچے، صاحب مکان ہمارے راہبروں کا کوئی جاننے والا تھا، رات کا بقایا حصہ ہم نے اسی مکان میں سو کر گزارا، صبح ناشتہ کرنے کے بعد تقریباً صبح ۹ بجے ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا، ہمارے راہبروں نے راستے میں ہمیں کسی سے بھی بات کرنے سے منع کر دیا تھا، ہر ملنے والے سے راہبر خود ہی بات کرتے تھے۔

ہم چاروں چونکہ چرواہوں کے بھیس میں سفر کر رہے تھے اس لیے راستے میں عام پہاڑی لوگ ہماری طرف خاص توجہ نہیں دیتے تھے جس کی وجہ سے اب تک ہمارا سفر پرسکون گزر رہا تھا، عصر کے وقت جب ہم سفر کرتے ہوئے ایک پہاڑی چوٹی پر پہنچے تو اچانک ایک آدمی اوٹ سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا قریب آنے پر پتہ چلا کہ یہ شخص شمالی اتحاد کے مخالف قبیلہ کا کمانڈر ہے جو ان پہاڑوں میں روپوشی کی زندگی گذار رہا تھا، یہ کمانڈر کچھ عرصہ پہلے طالبان کی حمایت کے جرم میں گرفتار ہو کر لشدہ جیل میں لایا گیا تھا جہاں پر دوسری جیل میں منتقلی کے دوران یہ کمانڈر پہرے داروں کو جل دے کر فرار ہو گیا تھا، اس کمانڈر نے دیکھتے ہی

خیال محمد کو پہچانتے ہوئے کہا ''آپ طالبان کے فلاں ملا صاحب کے ساتھ نہ تھے، میں نے تمہیں محاذ پر دیکھا تھا، ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کمانڈر نے ہمیں لڑدہ جیل میں اچھی طرح نہیں دیکھا تھا جس کی وجہ سے وہ ہمیں قیدی کی حیثیت سے نہیں پہچان سکا اور ہم نے بھی اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم لڑدہ سے بھاگے ہوئے قیدی ہیں۔

یہ کمانڈر دراصل یہاں سے طالبان کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا، اس کمانڈر کے آدمی حالات کا جائزہ لینے اور ریکی کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے جنہوں نے کچھ دیر بعد آکر اطلاع دی کہ دشمن نے تمام علاقے کی ناکہ بندی کر رکھی ہے آگے پل پر بھی پہرے دار پہرہ دے رہے ہیں جو ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں ایسے میں جب ہم نے گجر راہبروں کی معیت میں آگے جانے کا ارادہ کیا تو متذکر کمانڈر گرفتاری کے خوف سے ہمارے ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوا۔

ہم نے مغرب کے بعد یہاں سے حرکت کی اور پل کی بجائے نالے کے اندر سے گزر کر پار چلے گئے اور عام راستے سے ہٹ کر چلنے لگے، رات کو تین بجے ہم راہبروں کی جان پہچان والے ایک شخص کے گھر میں پہنچے، ہمارے راہبروں نے ہمیں دیوار کی طرف منہ کر کے پڑے رہنے اور کوئی بات نہ کرنے کو کہا اور ہمیں اہل خانہ کے سامنے مریض ظاہر کیا تاکہ ان لوگوں کو ہمارے بارے میں اجنبی ہونے کا شک نہ ہو، اہل خانہ نے جب ہمارے راہبروں سے ہمارے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ دونوں مریض ہیں انہیں علاج کی غرض سے شہر لے جا رہے ہیں۔

صبح ناشتہ کے بعد ہم یہاں سے چل پڑے اس علاقہ میں اب ہم دن کے وقت بھی سفر کر سکتے تھے کیونکہ پچھلے راستوں کی نسبت یہاں پر خطرات قدرے کم تھے، سفر کرتے ہوئے ہم شام تک ضلع اشکمش کے پہاڑوں میں واقع ایک بستی میں پہنچ گئے، نماز مغرب ہم نے بستی کی مسجد میں ادا کی یہاں کی آبادی چونکہ فارسی بانوں پر مشتمل تھی اور اس لیے وہ ہمارے بارے میں تشویش کا اظہار کرنے لگے اور ہم بھی یہاں پر تشویش میں مبتلا ہو گئے کیونکہ ذرا سا شک گزرنے پر یہ لوگ ہمیں گرفتار کر سکتے تھے، ہم لوگوں سے بالکل بات نہیں کرتے تھے، اس لیے

بستی کے لوگ ہمارے راہبروں سے ہمارے بارے میں پوچھنے لگے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ راہبروں نے ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہیں بتایا کہ ''یہ ہمارے چرواہے ہیں انہیں گوجری زبان کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی، یہ دونوں مریض ہیں ان کو علاج کے لیے شہر لے جارہا ہوں، بستی کے لوگوں نے قدیم دستور کے مطابق مسجد میں ہمیں کھانا وغیرہ لاکر دیا ہم عشاء کی نماز پڑھنے اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد مسجد میں سو گئے اور صبح نماز فجر ادا کرنے کے بعد ہم دوبارہ اپنے سفر پر نکل کھڑے ہوئے اور ضلع اشکمش کے دیہی علاقوں سے گذرتے ہوئے ہم لوگ قندوز کی طرف بڑھنے لگے یہاں سے طالبان کا علاقہ خان آباد قریب ہی تھا۔ راستہ میں ہزارہ قبیلے کا ایک مسلح سپاہی ہمیں ملا ہم نے اس سے محاذ جنگ کے قریبی علاقوں کی صورت حال کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ آگے بہت زیادہ خطرہ ہے کیونکہ طالبان اچانک حملہ کر دیتے ہیں، پہلے صرف ہمارے پاس گھوڑے تھے، ہمارے اسپکی (گھڑسوار) تیزی سے حملہ کر کے طالبان کا محاصرہ کر لیتے تھے اب طالبان کے پاس بھی گھوڑے آگئے ہیں جس کی وجہ سے محاذ پر مشکلات بڑھ گئی ہیں اور ہمارے لیے اپنے علاقوں کا دفاع کرنا مشکل ہوگیا ہے، متذکرہ ہزارہ ہمیں معلومات دے کر کندھے پر بندوق لٹکائے آگے چلا گیا۔

ظہر کے وقت تک ہم طالبان کی حدود کے قریب پہنچ چکے تھے، یہاں پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی، ہمارے ساتھ کئی اور لوگ بھی مل گئے جو طالبان کے علاقوں میں خریداری وغیرہ کے لیے جا رہے تھے، بعض افراد کے پاس سواری اور بار برداری کے لیے گدھے بھی تھے، ہم سب کے اکٹھے چلنے سے ایک قافلہ کی شکل بن گئی اور ہم اس قافلہ کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے راستے میں آنے والی مختلف چوکیوں سے عافیت کے ساتھ گذر گئے لیکن ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے شمالی اتحاد والوں کا حفاظتی اور چیکنگ کا نظام سخت ہوتا جا رہا تھا، جب ہم آخری چوکی عبور کرنے لگے تو ایک سپاہی جو اونچی جگہ پر بیٹھا گزرنے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا ہمیں دیکھ کر فوراً نیچے آیا اور اس نے ایک گجر رہبر سمیت ہم تینوں کو قافلے سے الگ کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ آگے نہیں جا سکتے، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا، راہبر نے شور مچاتے ہوئے کہا ''چھوڑو مجھے دیر ہو رہی...... مجھے جانے دو چنانچہ اس نے اسے چھوڑ دیا اور ہم دونوں کو اپنے

ساتھ اپنی کمین گاہ میں لے گیا اور ہم سے پوچھ گچھ کرنے لگا، ہم نے اپنے آپ کو اشکمش کا چوپان (چرواہا) ظاہر کیا، مسلح سپاہی نے دھاڑتے ہوئے کہ ''تم طالبان کے جاسوس ہو، تمہیں صحیح طرح فارسی بھی نہیں بولنا آتا اور کہتے ہو کہ ہم اشکمش کے رہنے والے ہیں......؟ ہم نے ایک عذر گھڑتے ہوئے کہا کہ ''ہم چونکہ پہاڑوں میں بکریاں چراتے ہیں اور ہمارا شہروں میں آنا جانا کم ہے اس لیے مکمل فارسی نہیں بول سکتے۔'' ہمارے اس عذر پر وہ اور بھی غضبناک ہو کر کہنے لگا ''تمہاری شکل وصورت اور زبان چغلی کھا رہی کہ تم لوگ پاکستانی ہو...... سچ سچ بتاؤ کہ تم کون لوگ ہو یہ کہتے ہوئے اس نے ڈنڈا اٹھایا اور پانچ چھ ڈنڈے ہمیں رسید کر دیے، اتنے میں دوسرا سپاہی بھی آ گیا اور آتے ہی کہنے لگا کہ دونوں پاکستانی ہیں اب تو پہلے کو بھی یقین ہو گیا کہ ہم پاکستانی ہیں۔

ہر گزرتے لمحہ کے ساتھ ان لوگوں کے رویے میں سختی آتی جا رہی تھی، ہم سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ عین منزل کے قریب پہنچ کر پھر منزل ہم سے دور ہوتی نظر آنے لگی، پکڑے جانے سے ہمیں ہماری ساری محنت اکارت جاتی نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں ہم دل ہی دل میں نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ، رب کائنات کے حضور گڑ گڑاتے ہوئے دعا کرنے لگے ''اے رب کریم! تو نے کہاں کہاں ہماری مدد نہیں کی......... تو نے ہی ہمیں جیل کی اذیتوں سے نجات دی......... کٹھن راہوں میں تو نے ہی ہمارے مدد کی......... اور تیری ہی مدد و نصرت سے ہم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے......... اس نازک موقع پر کہ جب منزل ہمارے بالکل سامنے ہے ہماری مدد فرما......... اور ہمارے یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا فرما اور ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما، اچانک ایک سفید ریش بزرگ گھڑ سوار......... سامنے نمودار ہوا اور ہماری مظلومانہ حالت دیکھ کر انتہائی بارعب آواز میں مسلح سپاہیوں سے پوچھنے لگا کہ یہ کون لوگ ہیں......... انہیں آپ لوگوں نے کیوں پکڑ رکھا ہے......؟ سپاہیوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ طالبان کے جاسوس ہیں۔'' سفید ریش بزرگ نے گرجتے ہوئے کہا: ''کیا جاسوس ایسے ہوتے ہیں.........؟ ان کے جسموں میں جان دکھائی نہیں دیتی......... کمزوری سے یہ مرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں......... اور تم کہتے ہو کہ یہ جاسوس

ہیں.......... ماہ رمضان ہے اور افطار کا وقت بھی قریب ہے لہٰذا ظلم نہ کرو۔" یہ کہہ کہ سفید ریش بزرگ گھوڑے سے اترے اور ہمیں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا "اٹھو...... اور جدھر جانا چاہتے ہو جاؤ۔"

سفید ریش بزرگ کے جلال اور رعب کی وجہ سے سپاہیوں کو ان کے آگے کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ منہ ہی دیکھتے رہ گئے جبکہ ہم موقع غنیمت جانتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے حد بندی والے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے، ہم اس خوف سے تیز تیز چل رہے تھے کہ کہیں پھر نہ پکڑ لیے جائیں، جب ہم پھاٹک کی چوکی پر پہنچے تو چوکی والے نے ہم سے پوچھا: "کیا اجازت ہوگئی ہے" ہم نے جواب دیتے ہوئے کہا "ہاں ہوگئی ہے" چنانچہ اس نے ہمیں گذرنے دیا، اس سے آگے شمالی اتحاد کا کوئی آدمی نہیں تھا۔

طالبان کی حدود میں داخل ہونے کے لیے یہ چند گز کا فاصلہ ہمیں سینکڑوں میل لمبا محسوس ہو رہا تھا، ہم اپنے آپ کو جلد از جلد طالبان کی حدود میں پہنچانا چاہتے تھے اس لیے تیز تیز چل رہے تھے، جیسے ہی دشمن کی حد ختم ہوئی اور طالبان کی حدود شروع ہوئی تو ہماری جان میں جان آئی، ہم تھوڑا سا مزید آگے گئے تو وہاں پر دونوں گجر جوان کھڑے ہوئے تھے جو مسافروں کو کسی طریقے ہمیں چھڑوانے کے لیے تیار کر رہے تھے، ہمیں دیکھتے ہی دونوں بے پناہ خوشی سے اچھلتے ہوئے آئے اور ہم سے بغل گیر ہو گئے اور ہمیں آزادی کی مبارک باد دینے لگے، انہیں ہماری آزادی کی خوشی کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی خوشی تھی کہ ان کے قبیلے نے ان کو جو ذمہ داری سونپی تھی اب اس میں وہ سرخرو ہو چکے تھے، آگے چل کر ہمیں طالبان کے پہرہ دار ملے جنہوں نے ہمیں گاڑی میں بٹھا کر قندوز شہر میں پہنچا دیا جہاں ذمہ دار طالبان ہمارا حال احوال سن کر بہت زیادہ خوش ہوئے اور انہوں نے ہمیں قندوز محاذ کے بڑے کمانڈر سے ملوایا جنہوں نے ہم سے جیل اور جیل سے فرار کی مکمل روئیداد سنی، کمانڈر صاحب ہمارے فرار کی سرگزشت سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ہمیں بہت بہت مبارک باد دی۔

قندوز کے ذمہ دار طالبان نے ہمیں نئے کپڑے، پگڑی، جوتے اور نقد رقم انعام کے طور پر دی، ہم کچھ دن قندوز کے محاذ پر مجاہدین کے ساتھ ٹھہرے اور عید الفطر ان کے ساتھ منائی، عید

کے بعد طالبان نے ہمیں فوجی طیارے کے ذریعے کابل پہنچا دیا۔ کابل پہنچنے پر ہمارے ساتھیوں نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا اور ہمارے آزاد ہونے پر بہت زیادہ خوش ہوئے اور ہمیں مبارک باد دی، چند دن کابل میں گذارنے کے بعد ہم اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، تقریباً ایک مہینہ گھر پر گزارنے کے بعد میں دوبارہ افغانستان محاذ پر پہنچ گیا۔

ساتھیوں کے فرار کی داستان مکمل قلمبند کرنے کے بعد جیل کی داستان اسی جگہ سے دوبارہ شروع کرتے ہیں جہاں سے چھوڑی تھی۔

جب کئی دنوں تک فرار ہونے والے قیدیوں کو جیل سربراہ ایوب خان اور اس کا عملہ تلاش کرنے میں ناکام ہو گیا تو اعلیٰ حکام نے ایوب خان اور اس کے پورے عملے کو معطل کر دیا اور ان کی تفتیش شروع کر دی، اس عملہ کی جگہ تخار اور ضلع ورسج کے افراد پر مشتمل نیا عملہ آ گیا، یہ نیا عملہ دو گروپوں پر مشتمل تھا ایک گروپ تخاریوں کا تھا جن میں امیر خان سابقہ ذمہ دار تخار جیل، امیر خان کا چھوٹا بھائی، قاضی عثمان اور چند دیگر اہلکار شامل تھے جبکہ دوسرا گروپ ورسج کے لوگوں کا تھا جن میں مخدوم عبدالرقیب، مولوی عبدالخالق اور چند دیگر اہلکار شامل تھے۔ مخدوم رقیب تمام جیل انتظامیہ کا سرپرست اعلیٰ جبکہ امیر خان سپرٹینڈنٹ جیل تھا۔

نئے عملے نے آتے ہی قیدیوں کی تفتیش شروع کر دی، مخدوم عبدالرقیب نے سب سے پہلے ہم قیدیوں کے ذمہ دار بھائی رحمت اللہ سے تفتیش شروع کی، اس نے بھائی رحمت اللہ کو مختلف طریقوں سے حراسان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ ”بتاؤ.....! قیدی کس طرح بھاگے ہیں.....؟ بھائی رحمت اللہ نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ”میں نہیں جانتا کہ یہ قیدی کس طرح بھاگے ہیں.....؟“ مخدوم رقیب اور امیر خان نے زور دیتے ہوئے بھائی رحمت اللہ سے کہا ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں ان قیدیوں کے فرار کا علم نہ ہو حالانکہ تم تمام قیدیوں کے باشی (ذمہ دار) ہو..... تمہیں ان کے فرار ہونے کا ضرور علم ہوگا..... بلکہ ان کے فرار میں یقیناً تمہارا بھی ہاتھ ہے.....! بھائی رحمت اللہ نے ان کے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے انتہائی جرأت اور بے باکی سے کہا کہ ”اگر مجھے ان قیدیوں کے فرار کے منصوبے کا علم ہوتا تو اس وقت میں آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا بلکہ میں بھی ان کے ساتھ فرار ہو چکا ہوتا

اور آپ تین کی بجائے چار قیدیوں کو تلاش کر رہے ہوتے، میرا یہاں آپ لوگوں کے سامنے موجود ہونا ہی میرے سچا ہونے کے لیے کافی ہے لہٰذا سچ یہی ہے کہ میں ان قیدیوں کے فرار کے منصوبے سے لاعلم ہوں۔"

تحقیق و تفتیش کا یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا اور ساتھیوں کو زدوکوب کیا جاتا رہا، آخر کار تین چار دنوں کے بعد تفتیش کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور حالات معمول پر آ گئے، بھائی رحمت اللہ کو ساتھیوں کی ذمہ داری سے ہٹا کر بھائی بنیامین کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی، بھائی بنیامین کو بھائی رحمت اللہ نے در پردہ خود ہی نامزد کر کے آگے کیا تھا، بھائی بنیامین بھی بھائی رحمت اللہ کی طرح تمام قیدیوں سے ہمدردی رکھنے اور ہر طرح ان کا خیال رکھنے والے ساتھی تھے۔

جیل کے نئے عملے کا رویہ میرے ساتھ قدرے بہتر تھا کیونکہ ورجی عملے کے لوگ اکثر اپنے مریضوں کو چیک اپ کے لیے میرے پاس لاتے رہتے تھے اور کلینک سے اپنے مریضوں کو دوائیاں بھی دلوانے کی کوشش کرتے تھے، میرے پاس ادویات چونکہ طالبان قیدیوں کی امانت تھیں جس کی وجہ سے میں امانت میں خیانت کر کے دوائیاں ان لوگوں کو جن کو یہ لوگ باہر سے لاتے تھے نہیں دے سکتا تھا لیکن جب مخدوم رقیب اور اس کے عہدیدار مجھے اپنے باہر سے لائے گئے مریضوں کو ادویات دینے پر مجبور کرتے تو مجھے ڈاکٹری کے اس مقدس پیشے میں خیانت کرنا پڑتی کیونکہ میں ایسے زبردستی کے مریضوں کو مجبوراً ایکسپائر شدہ رنگ برنگی دوائیاں دیتا، اگر میں یہ غیر انسانی اور غلط کام جس پر یہ لوگ خود مجھے مجبور کرتے تھے نہ کرتا تو مریض قیدیوں کے لیے چند ہفتوں میں کچھ بھی نہ بچتا اور پھر یہ ادویات شمالی اتحاد کی طرف سے بھی فراہم کردہ نہیں تھیں جن پر ان کا کچھ حق ہوتا بلکہ یہ ادویات جو کلینک میں میرے پاس تھیں طالبان کی فراہم کردہ تھیں جن کو میں اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا مجاز نہیں تھا البتہ جیل کے پہرے داروں وغیرہ کو جو بیمار ہوتے ان کا علاج کرنے اور انہیں مناسب دوائی دینے کی مجھے اجازت تھی اور انہیں میں بوقت ضرورت دوائیاں دیتا بھی تھا، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ جن باہر کے مریضوں کو مجبوراً میں ایکسپائر شدہ اور رنگ برنگی دوائیاں دیتا تھا وہ انہیں خراب دوائیوں سے تندرست ہو جاتے تھے اور میری تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے، میں ان لوگوں کو نقصان

پہنچانے کی غرض سے یہ خراب دوائیاں نہیں دیتا تھا بلکہ میں اپنے قیدی ساتھیوں کا حق بچانے کے لیے ایسا کرتا تھا کہ جن کا یہاں کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

نئے عملے کے آنے کے ۱۸ دن بعد جب عیدالفطر کا دن آیا تو عبدالحکیم باورچی جیل انتظامیہ کی منت سماجت کے بعد اجازت لے کر مجھے اپنے گاؤں لے گیا جہاں پر ہم نے جامع مسجد میں نماز عید ادا کی، بعد ازیں عبدالحکیم مجھے اپنے گھر لے گیا، عبدالحکیم اور اس کے اہل خانہ نے میری خوب خاطر مدارت کی، عصر تک میں وہاں رہا جہاں پر گاؤں کے بہت سے لوگ بھی مجھے آ کر ملے، میرے ساتھ آنے والا پہرے دار گاؤں کے سیر سپاٹے کو نکلا ہوا تھا جو عصر کے وقت مجھے لینے کے لیے آ گیا، واپسی کے وقت میں نے کچھ افغانی روپے عبدالحکیم کے بچوں کو عیدی کے طور پر دیئے جو بڑی مشکل سے انہوں نے لیے اور پھر میں گدھے پر سوار ہو کر پہرے دار کے ساتھ جیل میں آ گیا، کئی سالوں کے بعد نماز عید پڑھنے اور عید کے روز آزاد لوگوں سے ملنے اور عید گزارنے کا اپنا ہی مزہ تھا اگر چہ میں اپنے قیدی ساتھیوں کو چھوڑ کر عید منانے کے لیے گاؤں میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن عبدالحکیم جس نے میرے لیے رسک لیا جیل افسران کی کڑوی کسیلی باتیں سنیں اور ان کی منت سماجت کی، انکار کر کے اس کا دل توڑنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں عید منانے اس کے ساتھ گاؤں چلا گیا۔

ایک دن منشیات کے سمگلر سخی داد نے طالبان کے بارے میں کچھ ہتک آمیز باتیں کیں، بھائی رحمت اور دوسرے ساتھیوں نے اسے سمجھایا کہ آپ ہمارے سامنے ہمارے بڑوں کی توہین نہ کریں بجائے اس کے کہ وہ ساتھیوں کے سمجھانے سے سمجھ جاتا الٹا اس نے اور زیادہ بکواس کرنا شروع کر دی اور کچھ جرائم پیشہ قیدی بھی اس کے ساتھ مل گئے، سخی داد اور اس کے جرائم پیشہ ساتھیوں نے ہمارے ساتھیوں کے آرام اور تحمل سے سمجھانے کو ان کی کمزوری سمجھا اور مزید بکواس کرنے لگے جب ان کی بکواس حد سے بڑھنے لگی تو بھائی رحمت اللہ، بھائی قاری امین اللہ، بھائی سلطان اور دیگر کئی ساتھی ان بدمعاشوں سے ٹکرا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سخی داد اور اس کے چمچوں کی اچھی خاصی درگت بنا دی اور ان کی خوب ٹھکائی لگائی جب یہ لوگ طالبان مجاہدین کے ہاتھوں اچھی طرح بے بس ہو گئے تو انہوں نے پہرہ داروں کو آوازیں دینا شروع

کر دیں۔ چنانچہ ہمارے تمام ساتھی اچھی طرح اپنی بھڑاس نکال کر پہرہ داروں کے آنے سے پہلے پہلے اپنے کمروں میں چلے گئے، جب پہرہ دار نیچے آئے تو یہ لوگ شرمندگی کے مارے پہرہ داروں کو کچھ بھی نہ بتا سکے کیونکہ ان کو اپنی درگت بنوانے کے بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ طالبان قیدیوں کو چھیڑنا بھڑوں کے چھتوں میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے لیکن سخی داد نے کینہ اپنے دل میں چھپائے رکھا، سخی داد دراصل اس وہم میں مبتلا تھا کہ جس طرح وہ پہرہ داروں پر اپنی دولت اور چرس کے بل بوتے پر رعب جمائے رکھتا تھا اسی طرح طالبان قیدی بھی اس کے رعب میں آ جائیں گے اور اس کے سامنے کچھ نہیں بولیں گے لیکن سخی داد کو کسی دانا نے شاید یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ درویش صفت لوگ تو بڑے بڑے بادشاہوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے تو ایک ہیروین کا سمگلر عادی مجرم سخی داد کس باغ کی مولی ہے۔

میری مصنوعی ٹانگ کچھ دن پہلے ٹوٹ گئی تھی جسے بھائی قاری اقبال نے تاروں وغیرہ کی مدد سے جوڑ دیا تھا چنانچہ میں نے جیل کے سرپرست اعلیٰ مخدوم رقیب کو اپنی تکلیف کے بارہ میں آگاہ کیا اور ٹانگ بنوانے کے لیے تخار جانے کا کہا، کئی دن تک مخدوم رقیب مجھے ٹرخاتا رہا لیکن جب میں نے حد سے زیادہ اصرار اور اس کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کیے تو آخر کار جس دن اس نے جیل کے مواد غذائی کے لیے تخار جانا تھا مجھے بھی سواریوں والے ٹرک پر بٹھا کر تخار لے گیا اور تخار میں شمالی اتحاد کی خفیہ ایجنسی کے ہیڈ کوارٹر میں مجھے جا اتارا اور خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں کے حوالے کر دیا اور انہیں بتا دیا کہ سویڈش کمیٹی کے ہسپتال سے اس قیدی کی ٹانگ بنوانی ہے۔

مین قندوز روڈ پر واقع ایجنسی کی عمارت کے ایک کمرے میں مجھے بند کر دیا گیا، یہ کمرہ عمارت کے صدر دروازے کے بالکل ساتھ اور سڑک کے کنارے پر واقع تھا۔ اگلے دن پہرے دار مجھے ہسپتال لے گئے جہاں پر میں نے ڈاکٹر عبدالحمید صاحب جن کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے سے مل کر انہیں صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ ”ڈاکٹر صاحب! میری یہ ٹانگ جو آپ نے بنوائی تھی نازک ہونے کی وجہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس لیے مہربانی فرما کر مجھے ایسی مضبوط ٹانگ بنوا دیں جو کافی عرصہ تک میرا ساتھ دیتی رہے

اور قید میں رہتے ہوئے مجھے دوبارہ ٹانگ کے بارے میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو کیونکہ ایک قیدی کی اپنی تو کوئی مرضی نہیں ہوتی کہ اپنی مرضی سے وہ اپنے مسائل حل کر سکے۔'' ڈاکٹر عبدالحمید صاحب نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ''اس دفعہ آپ کی مصنوعی ٹانگ اچھے میٹریل سے اور اپنے نگرانی میں بنواؤں گا تا کہ آپ کو دوبارہ کوئی مسئلہ پیش نہ آئے۔'' چنانچہ انہوں نے بہت جلدی صرف دو دنوں میں مضبوط قسم کی ٹانگ میرے لیے بنوا دی اور مجھے فارغ کر دیا علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب نے میڈیکل کی چند کتابیں بھی مجھے تحفہ کے طور پر دیں۔

شمالی اتحاد کی ایجنسی کے اس ہیڈ کوارٹر میں جس میں مجھے بند کیا گیا تھا چند ایسے عہدیدار بھی تھے جنہوں نے پاکستان سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہ اردو بھی اچھی طرح بول لیتے تھے اسی وجہ سے یہ لوگ میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے اور میرے کمرے کا دروازہ بھی کھلا رکھتے تھے چنانچہ میں عمارت کے اندر بھی گھوم پھر آتا تھا جس کی وجہ سے اندر کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کسی حد تک مجھے اندازہ ہوتا رہتا تھا، یہاں پر ایسے روسی اور انڈین لوگ بھی بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے جاتے نظر آتے تھے جو حلیوں اور چال ڈھال سے اعلیٰ فوجی آفیسر معلوم ہوتے تھے اس کے علاوہ فرانسیسی اور ایرانی ایجنسی کے لوگوں کی بھی یہاں آمدورفت لگی رہتی تھی۔

ایک دن صبح کے وقت میں اپنے کمرے کے دروازہ میں کھڑا ہوا تھا کہ اچانک باہر سے شمالی اتحاد کی ایجنسی کا سربراہ جنرل امام الدین آ گیا، اس نے مجھے دروازے میں کھڑا ہوا دیکھا تو مجھے اور پہرہ داروں کو گالیاں دینے لگا، اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ ''اگر دوبارہ میں نے تجھے باہر دیکھا تو شوٹ کر دوں گا۔'' جنرل امام الدین کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر میں کمرے کے اندر جا کر بیٹھ گیا اور پہرہ دار نے دروازہ باہر سے بند کر دیا، اسی دن نماز مغرب کے بعد ایک پہرہ دار نے آ کر مجھے پیغام دیا کہ جنرل صاحب اوپر بالاخانے میں آپ کو بلا رہے ہیں، جنرل صاحب کا بلاوا سن کر میں ڈر گیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ خدا خیر کرے، میں مختلف خدشات دل میں لیے پہرہ دار کے ساتھ اوپر بالاخانہ میں جنرل امام الدین صاحب کے پاس جا پہنچا، میرے خدشات کے بالکل برعکس جنرل امام الدین انتہائی خوش اخلاقی سے ملا

اور مجھے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے حال احوال پوچھنے کے بعد کہنے لگا:

''ڈاکٹر صاحب مجھے پاکستان اور پاکستانیوں سے بہت زیادہ محبت ہے، میں نے عسکری ٹریننگ بھی افغان جہاد کے دوران پاکستان ہی سے حاصل کی ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے ایک آٹھ دس سالہ بچے کو جو قریب ہی موجود تھا اپنے پاس بلایا اور مجھے بتاتے ہوئے کہا ''یہ میرا بیٹا ہے اس کا نام ضیاء الحق ہے، اس کا نام میں نے اپنے محسن اور تمہارے شہید صدر ضیاء الحق کے نام پر رکھا ہے کیونکہ میں اس عظیم شخص سے بہت زیادہ محبت اور عقیدت رکھتا ہوں اور ہر پاکستانی میرے لیے قابل احترام ہے لیکن آج ہم اور ہمارے محسن ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں جس کا مجھے بہت زیادہ دکھ ہوتا ہے۔'' اس وقت جنرل امام الدین صبح والے جنرل امام الدین سے بالکل الگ شخص نظر آرہا تھا کیونکہ صبح کے وقت جب غصہ میں اس نے مجھے ڈانٹا اور گالیاں دی تھیں تو وہ ایک وحشی درندہ نظر آتا تھا مگر اس وقت جنرل امام الدین انتہائی مہذب، شفیق اور مہربان بنا ہوا تھا۔

رات کا کھانا جنرل صاحب نے مجھے اپنے ساتھ کھلایا اور تاکید کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ کھانے کے وقت بلا روک ٹوک اوپر آجایا کریں اور کھانا ہمارے ساتھ مل کر کھایا کریں۔'' کھانا کھانے کے بعد جب میں اجازت لے کر نیچے اپنے کمرے میں جانے لگا تو جنرل امام الدین نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں کہیں باہر جارہا ہوں اور ممکن ہے کہ ہماری دوبارہ یہاں ملاقات نہ ہوسکے اگر لشٔدہ جیل میں آپ کو کوئی مشکل درپیش ہو یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو لشٔدہ جیل کے فلاں آدمی کے ذریعہ مجھے ضرور بتانا اس کے علاوہ میں میں مخدوم رقیب صاحب کو بھی آپ کا خیال رکھنے کا کہوں گا۔

دو دن مزید یہاں رکھنے کے بعد مخدوم رقیب مجھے واپس مواد غذائی والے ٹرک پر بٹھا کر لشٔدہ جیل کی طرف روانہ ہوگیا، راستے میں مخدوم رقیب نے مجھ سے مذاق کرتے ہوئے پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب! جنرل امام الدین کو آپ نے کیا بوٹی سنگھائی ہے وہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے حالانکہ جنرل صاحب تو ہم جیسے عہدیداروں کو بھی منہ نہیں لگاتے۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''مخدوم صاحب......! یہ تو ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں کہاں اس

قابل......!

اس سفر کے دوران جیل انتظامیہ کی ایک کمزوری میرے ہاتھ آ گئی یعنی وہ یہ کہ جیل سپریٹنڈنٹ امیر خان اور اس کا تخاری عملہ گورنر تخار داؤد خان گروپ کے لوگ تھے اور مخدوم عبدالرقیب اور اس کا ورسجی عملہ جنرل فہیم خان کے گروپ کے لوگ تھے اور ان دونوں گروپوں کے درمیان اختلافات موجود تھے، مخدوم رقیب کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ یہ لوگ امیر خان اور اس کے عملے کو پسند نہیں کرتے، رات نو دس بجے کے قریب ہم لڑہ جیل میں پہنچ گئے۔

آنے والے دنوں میں میں نے جیل انتظامیہ کی متذکرہ بالا کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی یعنی میں غیر محسوس طریقہ سے دونوں گروپوں کو ایک دوسرے کے خلاف بڑھکانے کی کوشش کرتا رہتا اور مجھے اپنی اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی اور امیر خان اور مخدوم رقیب کے گروپوں میں اختلافات حد سے بڑھنے لگے، پہلے وہ قیدیوں کو ستانے کے منصوبے سوچتے رہتے تھے لیکن اب وہ ایک دوسرے کو زچ کرنے اور نیچا دکھانے کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتے، اس طرح تمام قیدی جیل انتظامیہ کی منافقانہ سازشوں سے کسی حد تک محفوظ ہو گئے، اب چونکہ میں چوبیس گھنٹے باہر کلینک ہی میں رہتا تھا اور ہر وقت جیل انتظامیہ سے میل جول نے میرا کام آسان کر دیا تھا اور میں انہیں ایک دوسرے کے خلاف بڑھکانے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں جانے دیتا تھا۔

جیل میں بغاوت کا منصوبہ

قید و بند کی صعوبت میں مبتلا ہر قیدی کے ذہن میں فطری طور پر جیل کی سلاخیں توڑ کر بھاگ نکلنے کی سوچ کارفرما رہتی ہے۔ ہر قیدی یہ چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح جیل کی دکھوں اور اذیت بھری زندگی سے نجات حاصل کر کے آزاد فضاؤں میں گھومے پھرے اور آزادی کی نعمتوں سے بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو، ہمارے جیل کے ساتھی بھی اکثر ایسا ہی سوچا کرتے تھے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے جیل سے بھاگ نکلیں۔ چنانچہ قاری امین اللہ، قاری رحمت اللہ، قاری سلطان، باہر باورچی خانے میں کام کرنے والے ساتھیوں اور چند دیگر طالبان قیدیوں نے اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ ان

ساتھیوں نے بجائے صرف خود بھاگنے کے تمام قیدیوں کو یہاں سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ منصوبہ اس طرح بنایا گیا کہ اندر والے ساتھی دوپہر کے وقت جب تمام پہرے دار کھانا کھانے کے لیے چھت پر بنے ہوئے بڑے کمرے میں چلے جاتے ہیں تو کھڑکیوں کے ذریعے چھت پر چڑھ کر اوپر موجود تمام پہرہ داروں کو قابو کر کے باندھ دیں گے اور ان کے اسلحے پر قبضہ کر لیں گے، جبکہ باورچی خانے والے ساتھی عین اس وقت جب اوپر والے ساتھی اپنے کام میں مصروف ہوں گے باہر موجود جیل کے دیگر عملے کو بے بس کر کے باندھ دیں گے ان دونوں کا رروائیوں کے بعد جیل کے اسلحہ خانہ پر قبضہ کر کے ساتھیوں میں اسلحہ تقسیم کرنا تھا اور ان تمام مراحل کو کامیابی سے عبور کرنے کے بعد جیل کے سامنے پہاڑوں پر موجود گجر قبیلہ کے لوگوں سے رابطہ کرنا تھا اور ان کے ذریعہ تمام قیدیوں کو یہاں سے نکالنا تھا۔

منصوبے کے تمام پہلوؤں پر مکمل طور پر غور وخوض کرنے کے بعد متذکرہ بالا ساتھیوں نے عملی اقدام اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک دن دوپہر کے وقت جب تمام پہرے دار کھانا کھانے کے لیے چھت پر موجود کمرے میں چلے گئے تو اندر والے ساتھیوں نے منصوبہ پر عمل کی ابتداء کر دی، سب سے پہلے بھائی سلطان کھڑکی کے ذریعہ چھت پر چڑھا جبکہ دوسرا ساتھی ابھی کھڑکی پر چڑھ کر چھت پر جانے ہی لگا تھا کہ دفعتاً منشیات کا سمگلر قیدی سخی داد کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے کمرے سے باہر نکلا تو اس نے چھت پر چڑھے ہوئے بھائی سلطان اور چھت پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے دوسرے ساتھیوں کو دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا پہرے دار ہوشیار.......... قیدی ہابالائے بام آمدند.......... ہوشیار (پہرے دار و قیدی چھت پر چڑھ گئے ہیں ہوشیار ہو جاؤ) سخی داد کا واویلا سن کر پہرہ داروں کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی سلطان بھائی چھت سے نیچے اندر کی طرف کود گئے اور دیگر تمام ساتھی بھی انتہائی پھرتی سے اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام سے بیٹھ گئے جب پہرے دار کمرے سے باہر نکلے تو کوئی بھی قیدی انہیں کمروں سے باہر نظر نہ آیا، سخی داد نے اوپر چڑھتے ہوئے ایک ساتھی کی ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچا تھا جس سے اس ساتھی کا جوتا واپس کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے وہیں رہ گیا تھا، چنانچہ سخی داد نے وہ جوتا پہرے داروں کو دکھاتے ہوئے کہا کہ "ایک قیدی سلطان

اور چھت پر چڑھ گیا تھا جب کہ دوسرے قیدی کو جو اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اسے میں نے ٹانگ سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا یہ جوتا اسی کا ہے.......... میرے شور کرنے پر سلطان چھت سے چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا اور اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں جا گھسا ہے۔ سخی داد پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پہرے داروں کو قسمیں اٹھا اٹھا کر بتا رہا تھا کہ ''بخدا! اگر میں بروقت دیکھ نہ لیتا تو طالبان قیدیوں نے تمہیں قتل کر دینا تھا، دیگر جرائم پیشہ افراد بھی اس واقعہ کی گواہی دے رہے تھے اور پھر کھڑکی کے عین نیچے کچی زمین پر ساتھیوں کے چھلانگیں لگانے کے تازہ نشان بھی سخی داد کو سچا ثابت کر رہے تھے۔

جب اس معاملہ کی تحقیق شروع ہوئی تو سخی داد نے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور کینہ نکالتے ہوئے جیل کے سرپرست مخدوم رقیب کو بتایا کہ ''رحمت اللہ، قاری امین اللہ، سلطان (اور چند دیگر قیدی) تمام طالبان قیدیوں کے سرغنہ اور فساد کی جڑیں، تفتیش کے دوران مخدوم رقیب نے اپنے پہرے داروں کے ساتھ جیل کے تمام کمروں کی تلاشی شروع کر دی دوران تلاشی مخدوم رقیب نے جہاں قیدیوں کا سامان اٹھا اٹھا کر کمروں سے باہر پھینکا وہیں پر اس بدبخت ملعون نے قرآن کریم اور حدیث کی کتابوں کو بھی اٹھا کر باہر پھینک دیا جس پر ساتھیوں نے سخت احتجاج کیا، مخدوم رقیب اور اس کی انتظامیہ نے طالبان قیدیوں کے احتجاج کی کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ تمام قیدیوں کو زدوکوب کر کے کمروں میں بند کر دیا گیا اور کئی دن تک طالبان قیدیوں کا کھانا پانی بند کر دیا گیا۔

تفتیش کے آخر پر منشیات کے سمگلر سخی داد کے بھاری رشوت پیش کر کے اکسانے کے سبب جیل سرپرست مخدوم رقیب نے بھائی رحمت اللہ، بھائی سلطان، بھائی قاری امین اللہ اور دو دیگر طالبان قیدیوں کو تمام قیدیوں کے سامنے گولیوں سے اڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں چونکہ باہر جیل انتظامیہ کے قریب ہوتا تھا اس لیے مجھے جیل انتظامیہ کے بہیمانہ فیصلے کی سن گن مل گئی۔ چنانچہ میں نے فوراً جیل کے اندر قیدیوں کو کھانا دینے والی کھڑکی کے ذریعہ بھائی رحمت اللہ کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا، بھائی رحمت اللہ نے فوراً کسی دوسرے ساتھی کو بتائے بغیر جیل میں بند اپنے دوست شمالی اتحاد کے کرنل دین محمد کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا تو کرنل دین محمد نے بھائی

رحمت اللہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''بے فکر ہو جاؤ...... میرے ہوتے ہوئے آپ لوگوں کا کوئی بال تک بیگا نہیں کر سکتا.........۔

کرنل دین محمد اسی دن پہرہ دار کے ذریعہ مخدوم رقیب کے دفتر میں جا پہنچا اور مخدوم رقیب کو سمجھایا کہ طالبان قیدیوں کے بارے میں نرمی اختیار کرے اور حد سے نہ بڑھے، کرنل صاحب کی اس نصیحت کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے مخدوم رقیب نے انتہائی نخوت سے جواب دیتے ہوئے کہا ''کرنل صاحب میں ان فسادی قیدیوں کو نشانِ عبرت بنا کر چھوڑوں گا تا کہ دوبارہ کسی کو ایسی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہو۔'' کرنل دین محمد نے انتہائی تحمل سے مخدوم رقیب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''مخدوم صاحب! میں ایک بار پھر آپ کو برادرانہ طور پر درخواست کرتا ہوں کہ ان قیدیوں کے بارے میں کہ جن کی حمایت کے شبہ میں، میں یہاں بند ہوں کوئی بھی انتہائی اقدام اٹھانے سے گریز کریں اور اگر آپ ان منتخب قیدیوں کو مارنا ہی چاہتے ہیں تو پہلے اچھی طرح اپنے اور اپنی قوم کے انجام کے بارے میں ضرور سوچ لینا کیونکہ رحمت اللہ کو میں اپنا بھائی کہہ چکا ہوں اب اس کے دوست میرے دوست ہیں اور اس کے دشمن میرے دشمن ہیں، میرے تین ہزار مسلح سپاہی اور میری قوم کے ہزاروں افراد آپ کی ولسوالی (ضلع) ورنج کے اوپر والے علاقہ ہی میں رہتے ہیں اور پھر آپ ہماری اور اپنی تاریخ کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں علاوہ ازیں آپ کی حکومت بھی ہماری طاقت وقوت سے اچھی طرح واقف ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں طالبان کا حامی ہونے کے باوجود آپ کے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں۔'' کرنل دین محمد کی حقیقت پر مبنی دھمکی آمیز باتیں سن کر مخدوم رقیب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ (کیونکہ ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے) اور وہ چاپلوسی کرتے ہوئے کرنل دین محمد سے کہنے لگا ''کرنل صاحب آپ تو ناراض ہو گئے......... اب بھی حکومت میں آپ کا ایک مقام ہے اور آپ ہمارے اعلیٰ افسر ہیں......... آپ کی بات ہم کہاں رد کر سکتے ہیں......... آپ بے فکر ہو کر جائیں......... کسی کو کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔'' (قبائل میں صدیوں سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ زیادہ افرادی قوت اور طاقت رکھنے والے قبیلے چھوٹے قبیلوں پر حاوی ہوتے ہیں اور چھوٹے اور کمزور قبیلے بڑے قبیلوں سے بگاڑ پیدا کرنے سے بچنے

کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور بڑے قبیلوں سے بنا کر رکھتے ہیں بصورت دیگر ان کی بقا تک خطرے میں پڑ جاتی ہے)

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ساتھیوں کے سروں پر منڈلاتے ہوئے خطرات ٹل گئے، اللہ رب العزت کرنل دین محمد کو جزائے خیر عطا فرمائے جس نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے ہمارے ساتھیوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا اور جیل سربراہ مخدوم رقیب کو اپنے فیصلے پر عمل نہ کرنے پر مجبور کیا۔

علی عرب کی آزادی اور دوبارہ جیل میں آمد

اس واقعہ کے کچھ دن بعد پنجشیری اعلیٰ عہدیداروں کا ایک وفد ہیلی کاپٹر کے ذریعہ لڑدہ جیل میں آیا اور ہمارے ایک عرب ساتھی علی عرب اور منشیات کے سمگلر سخی داد کو ہیلی کاپٹر میں سوار کرا کے پنجشیر لے گیا جہاں سے علی عرب کو سعودی عرب سے آئے ہوئے اس کے عزیزوں کے حوالے کرتے ہوئے آزاد کر دیا گیا جب کہ سخی داد کو کچھ عرصہ بعد احمد شاہ مسعود کے حکم سے گولی مار کر مار دیا گیا، اس طرح وہ شخص جس نے ہمارے طالبان قیدی ساتھیوں کو مروانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا خود ہی شمالی اتحاد کے فوجیوں کے ہاتھوں قید ہی کے دوران موت کا شکار ہو گیا اور جو گڑھا اس نے ہمارے ساتھیوں کے لیے کھودا تھا اس میں وہ خود جا گرا۔

علی عرب انتہائی متقی اور پرہیز گار جوان تھا وہ اکثر ساتھیوں کو تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کرنے کا درس دیتا رہتا تھا علاوہ ازیں وہ اسلام کا بطل عظیم تھا اور پوری دنیا پر اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہمیشہ سرگرم رہنے والا ساتھی تھا اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر علی عرب جیل میں رہتے ہوئے بھی کڑھتا رہتا تھا۔

علی عرب آزاد ہونے کے تقریباً دو مہینے بعد جیل میں بند ایک عرب ساتھی عبید الیمنی کے بھائی کے ساتھ ایک بار پھر لڑدہ جیل میں آ پہنچا.......... مگر اس بار وہ قیدی کی حیثیت میں نہیں بلکہ معزز ملاقاتی بن کر آئے تھے، یہ دونوں یعنی علی عرب اور عبید یمنی کے بھائی عبید عرب اور ہم چند ساتھیوں کے لیے تحائف اور نقد رقم بھی لائے تھے، یہ دونوں دو دن تک میرے پاس کلینک

میں رہے اس دوران قیدی ساتھی عبید عرب بھی ان کے ساتھ رہا، دو دن بعد یہ دونوں ملاقاتی محمود عرب کی شہادت کی خبر لے کر اور ہم تمام قیدیوں کو صبر، استقامت اور آزاد ہونے کی دعائیں دے کر رخصت ہو گئے۔

علی عرب آزاد فضاؤں میں پہنچ کر بھی ہم قیدیوں کو نہیں بھولا بلکہ تمام تر مشکلات مصائب اور رکاوٹوں کے باوجود وہ ہم قیدیوں کو ملنے کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے لڑدہ جیل میں آ پہنچا، علی عرب سعودی عرب سے کس طرح اور کن حالات میں ہماری ملاقات کے لیے لڑدہ جیل میں پہنچا یہ وہی جانتا ہے۔

طالبان وفد کی لڑدہ جیل میں آمد

طالبان کی خفیہ ایجنسی کے سربرہ قاری احمد اللہ کی قیادت میں طالبان کا ایک نمائندہ وفد شمالی اتحاد سے مذاکرات کے بعد ایک دن ہم قیدیوں کی ملاقات کے لیے لڑدہ جیل تشریف لائے۔ یہ وفد طالبان قیدیوں کے لیے اپنے ساتھ ایک خطیر رقم ادویات، کپڑے اور جوتے وغیرہ لائے تھے۔ وفد کے افراد نے لباس، جوتے اور ادویات وغیرہ تو تمام قیدیوں میں اپنے ہاتھ سے تقسیم کر دیں لیکن نقد رقم کے بارے جیل انتظامیہ اور شمالی اتحاد کا اعلیٰ حکومتی وفد جو طالبان کے وفد کے ساتھ آیا تھا تحفظات کا شکار ہو گئے اور انہوں نے وہ تمام نقد رقم جو طالبان نمائندے قیدیوں کے لیے لائے تھے یک مشت قیدیوں کو دینے سے انکار کر دیا۔ بحث مباحثے کے بعد شمالی اتحاد کے وفد نے یہ فیصلہ کیا کہ ۶ لاکھ پاکستانی روپوں کی بقدر افغانی کرنسی ڈیڑھ سو کے قریب طالبان قیدیوں میں تقسیم کر دی جائے اور بقیہ ۱۰ لاکھ پاکستانی روپوں کی بقدر افغانی کرنسی جیل کے سرپرست مخدوم رقیب کے پاس جمع کرا دی جائے تاکہ جب قیدیوں کے پاس موجود رقم ختم ہو جائے تو وہ مخدوم رقیب سے لے سکیں، طالبان وفد کے ارکان نے قیدیوں کے نمائندوں رحمت اللہ بنیامین، مولوی عبدالجلیل اور مولوی عبدالصمد وغیرہ سے مشورہ کرنے کے بعد 10 لاکھ پاکستانی روپے کی بقدر افغانی کرنسی مخدوم رقیب کے پاس امانت رکھ دی جبکہ بقیہ رقم تمام طالبان قیدیوں میں مساوی تقسیم کر دی۔

جہاں رقم ملنے پر تمام قیدی خوشحال ہو گئے وہیں پر مخدوم رقیب نے بھی قیدیوں کو دونوں

ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا۔ مخدوم رقیب باہر سے سستی چیزیں جیل میں منگواتا اور دس گنا زیادہ قیمت پر قیدیوں میں فروخت کرتا۔

ان دنوں تخار کا محاذ خوب گرم تھا جس کی چیدہ چیدہ خبریں ہمیں ہمارے پاس موجود ریڈیو کے ذریعہ حاصل ہوتی رہتی تھیں جبکہ میرے پاس جیل وارڈن (باشی) حامد ورنجی کی صورت میں خبریں حاصل کرنے کا ایک ذریعہ موجود تھا، حکومتی باشی (جیل وارڈن) حامد اگرچہ مخدوم رقیب کے گروپ کا رکن تھا، لیکن وہ ان سب سے مختلف قسم کا اور انتہائی اچھا انسان تھا، یہ قیدیوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتا اور ان کے ساتھ ہمدردی اور شفقت سے پیش آتا، یہ شخص مجھے طالبان کے محاذوں کی تازہ خبریں اکثر فراہم کرتا رہتا تھا، علاوہ ازیں اردگرد کے دیہاتوں کے لوگ بھی جو طبی معائنہ کروانے کے لیے میرے پاس کلینک میں آتے تھے وہ بھی مجھے طالبان کی فتوحات کی خبریں سناتے رہتے تھے، اسی طرح ایک دن لڑدہ گاؤں کے ایک قریبی دیہات کے آدمی نے طالبان کی تازہ فتوحات کے بارے میں مجھے خبر دیتے بتایا کہ ”طالبان نے طالقان کے اردگرد کے تقریباً اکثر علاقے فتح کر لیے ہیں علاوہ ازیں طالبان نے دفاعی لحاظ سے شمالی اتحاد کے تخار کے اہم ضلع بہارک پر بھی قبضہ کرلیا ہے، مفتوحہ علاقوں اور دائیں بائیں کے دیگر علاقوں کے لوگ طالبان کے عدل انصاف اور ہمدردی ومحبت سے متاثر ہو کر جوق درجوق طالبان کے ساتھ آ کر شامل ہو رہے ہیں جبکہ احمد شاہ مسعود کی فوجیں روسی، انڈین اور ایرانی جنگی ماہرین کی مشاورت اور راہنمائی کے باوجود ہر محاذ سے پسپا ہوتی جا رہی ہیں۔“ متذکرہ شخص نے مزید معلومات دیتے ہوئے بتایا کہ ”احمد شاہ مسعود کی فوجیں پے در پے شکست کھانے کے بعد طالقان شہر تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں، احمد شاہ مسعود طالقان شہر کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے، اس نے طالقان کی طرف آنے والے تمام راستوں کو بارودی سرنگوں سے بھر دیا ہے علاوہ ازیں راستے میں آنے والے تمام ندی نالوں کے پلوں کو احمد شاہ مسعود کے فوجیوں نے بارود لگا کر اڑا دیا ہے تاکہ طالبان کی طوفانی یلغار اور پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ پیش بندی کے طور پر مسعودی فوجیوں نے اپنے بھاگنے کے راستے پہلے سے نظر میں رکھے ہوئے ہیں اور تنگی فرخار تک جگہ جگہ گولہ بارود کے ڈھیر لگائے ہوئے ہیں تاکہ شکست کی

صورت میں تمام راستوں کو بارود سے اڑا دیا جائے اور ولسوالی فرخار (ضلع فرخار) جو صوبہ تخار میں اتحادیوں کی آخری پناہ گاہ ہے کو محفوظ بنایا جا سکے۔" مجھے اس دیہاتی کے منہ سے طالبان کی فتوحات اور پیش قدمی کے بارے سن کر بڑا حوصلہ اور خوشی ہوئی کیونکہ ہم تمام قیدیوں کو یقین تھا کہ طالبان طالقان کو فتح کرنے کے فوراً بعد فرخار کا رخ کریں گے اور پہلی فرصت میں ہم قیدیوں کو آزاد کرانے کی کوشش کریں گے، مفتوحہ علاقوں میں طالبان سب سے پہلے وہاں کے قید خانوں ہی کا رخ کرتے ہیں، کچھ عرصہ پہلے جب طالبان نے مزار شریف اور شبرغان وغیرہ فتح کیے تھے تو جنگ کے دوران ہی طالبان کے مخصوص دستوں نے جیلوں میں پہنچ کر اپنے قیدیوں کو آزاد کرایا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جوں جوں طالبان فتح پہ فتح حاصل کرتے ہوئے ہمارے قریب آتے جا رہے تھے ہماری آزاد ہونے کی امنگیں بڑھتی جا رہی تھیں اور ہر قیدی طالبان کے جلد از جلد یہاں پہنچنے کی رو رو کر دعائیں مانگ رہا تھا۔

طالبان کی خفیہ ایجنسی کے سربراہ قاری احمد اللہ کا پلان

متذکرہ بالا خبروں کے موصول ہونے کے تقریباً بیس پچیس دن بعد صبح کے وقت گجر قبیلے کے دو افراد ایک لاغر سے مریض کو اٹھائے جیل کے مین گیٹ کے پاس آئے اور پہرے داروں کی منت سماجت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "ہمیں اس مریض کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے دو۔" پہرہ داروں نے سختی سے انہیں ڈانٹتے ہوئے وہاں سے بھگانے کی کوشش کی، گجروں نے جب رو رو کر پہرہ داروں کو یقین دلایا کہ "ہم اگر اس مریض کو فوراً ڈاکٹر کے پاس نہ لے گئے تو یہ مریض تکلیف سے مر جائے گا۔" گجروں کے رونے دھونے اور اٹھائے ہوئے مریض کی آہ و بکا کو دیکھ کر پہرے داروں نے انہیں میرے پاس کلینک میں آنے کی اجازت دے دی اور دو تین پہرے دار بھی ساتھ ہی کلینک میں آ گئے (شمالی اتحاد کے لوگ گجروں پر طالبان کا حامی ہونے کی وجہ سے اعتماد نہیں کرتے تھے) میں نے گجروں سے مریض کی تکلیف کے بارے میں پوچھا کہ اسے کیا تکلیف ہے، ایک گجر نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "اس کے پیٹ میں سخت تکلیف ہے جس کی وجہ سے یہ مرا جا رہا ہے پہرے دار بدستور گجروں کے سر پر سوار کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے جونہی مریض کا معائنہ کرنے کے لیے اس کے پیٹ پر ہاتھ

لگایا تو اس نے ایک نازیبا حرکت کر ڈالی اور زور زور سے چیخیں مارنے لگا، مریض کی اس حرکت پر وہاں پر کھڑے پہرہ دار اپنے ناکوں پر رومال رکھ کر مریض کو گالیاں بکتے ہوئے جلدی سے کلینک سے باہر نکل گئے، پہرہ داروں کے باہر نکلتے ہی ایک گجر نے معذرت کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''ڈاکٹر صاحب اس مریض کی جو مریض نہیں ہے غیر اخلاقی حرکت پر ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں لیکن پہرے داروں کو کلینک سے نکالنے کے لیے یہ ضروری تھا، اب آپ مریض کا معائنہ کرتے رہیں اور ہماری باتیں غور سے سنتے رہیں۔'' متذکرہ گجر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''طالبان نے ملا فضل کی قیادت میں بیس پچیس روز کے محاصرے کے بعد طالقان شہر اور گرد و نواح کے تمام علاقے فتح کر لیے ہیں اب طالبان فرخار کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں لیکن طالبان کی پیش قدمی جا بجا دشمن کی بچھائی ہوئی بارودی سرنگوں، ٹوٹے ہوئے پلوں اور تباہ کیے گئے راستوں کی وجہ سے انتہائی سست پڑ گئی ہے جس کی وجہ سے طالبان کی خفیہ ایجنسی کے سربراہ قاری احمد اللہ آپ لوگوں کی سلامتی کے بارے میں فکر مند ہیں اور آپ لوگوں کو آزاد کروانے کے لیے مختلف منصوبوں پر غور کر رہے ہیں جن میں ایک منصوبہ یہ بھی زیر غور ہے کہ رات کی تاریکی میں ہیلی کاپٹر یہاں جیل کے باہر اتارے جائیں اور تیز ترین کمانڈو ایکشن کرتے ہوئے طالبان قیدیوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ یہاں سے نکال لیا جائے، بہرحال جو بھی کارروائی ہو اس کے لیے چند ذمہ دار قیدیوں کو پہلے سے معلوم ہونا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آپ لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے ہمارے بڑوں سے رابطہ کیا جنہوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیج دیا۔'' اس دوران متمرض مسلسل زور زور سے آہ و بکا کر رہا تھا اور میں اس متمرض کا معائنہ کرتے ہوئے پوری توجہ کے ساتھ اس گجر کی باتیں سن رہا تھا جو سرگوشیوں میں مجھ سے مخاطب تھا، اس شخص نے آخر میں مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

''خبردار! ان باتوں کا تذکرہ چند ذمہ دار طالبان قیدیوں کے علاوہ کسی سے نہ کرنا۔ تاکہ رازداری برقرار رہ سکے۔'' اپنا کام پورا کرنے کے بعد جب یہ لوگ جانے لگے تو میں نے ایک لمبا سا نسخہ لکھ کر ان کو پکڑا دیا تاکہ جاتے ہوئے یہ لوگ پہرہ داروں کو مطمئن کر سکیں، دونوں گجروں نے مریض کو بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا اور باہر چلے گئے، مریض حسب سابق

مسلسل چیخے چلائے جا رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ باہر گیٹ پر موجود پہرہ داروں سے چند باتیں کرنے اور انہیں نسخہ دکھانے کے بعد جیل سے باہر چلے گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے، میں نے ان کے جانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کیا کہ آنے والے اپنا کام کرنے کے بعد خیر و عافیت سے چلے گئے اور ان پر کسی کو شک نہیں ہوا۔

طالبان کے انصاف کی کہانی شمالی اتحاد کی زبانی

جس صبح یہ گجر میرے پاس آئے تھے اسی دن ظہر کے بعد جیل وارڈن (باشی) حامد ورسجی اپنی ماہانہ چھٹی گذارنے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر آن پہنچا اور آتے ہی تازہ خوبانیوں کی ایک ٹوکری لیے وہ کلینک میں میرے پاس آ گیا، خوبانیوں سے بھری ٹوکری مجھے دینے اور سلام دعا کرنے کے بعد باشی حامد مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''دکتور صاحب (ڈاکٹر) مبارک ہو! طالبان نے طالقان فتح کر لیا ہے اور عن قریب وہ یہاں بھی پہنچنے ہی والے ہیں۔'' علاوہ ازیں باشی حامد نے طالبان کی عدل و انصاف پر مبنی تازہ ترین کارروائی سناتے ہوئے کہا ''دکتور صاحب! چند روز پہلے میں ولسوالی (ضلع) بہارک گیا تھا جہاں طالبان نے تازہ تازہ علاقے کا کنٹرول سنبھالا تھا، وہاں پر میں نے طالبان کے عدل و انصاف کا ایک ایسا واقعہ دیکھا جس نے مجھے اور تخار کی عوام کو طالبان کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ ''جب طالبان نے درہ بنگی فتح کرنے کے بعد ولسوالی بہارک پر حملہ کر کے اسے بھی فتح کر لیا تو طالبان نے عوام میں اعلان کیا کہ وہ سرکاری اور غیر سرکاری اسلحہ مقررہ مدت تک رضا کارانہ طور پر جمع کروا دیں جبکہ طالبان نے اپنے مسلح افراد کو بھی سختی سے حکم دیا کہ وہ قطعاً کسی کے گھر میں داخل نہ ہوں۔ شین ڈنڈ (ہرات کے قریب ایک ضلع جہاں افغانستان کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے) کے دیہات کا ایک جلبیزار باشندہ (طالبان کے حامی قبائل محاذ جنگ کے لیے باری باری جو رضا کار روانہ کرتے ہیں انہیں جلبیزار کہتے ہیں) اپنی دو ماہ کی باری پوری کرنے طالبان کے لشکر میں شامل ہوا تھا، وہ ولسوالی بہارک کی ایک بستی کے گھر میں تلاشی کے بہانے اکیلا جا گھسا، گھر میں فقط تین خواتین تھیں، اس بدبخت نے دو عورتوں کو قتل کر دیا جبکہ تیسری کو زبردستی اپنے علاقے میں لے جانے کے لیے چل پڑا، طالبان ہر فتح ہونے والے علاقہ میں عوام کے جان و مال کے تحفظ

اور مفتوحہ علاقوں کے گھروں کو لوٹ مار سے بچانے کے لیے خصوصی انتظامات کرتے ہیں اور تمام راستوں کی سختی سے ناکہ بندی کر دیتے ہیں اور تمام گاڑیوں اور پیدل جانے والوں کی تلاشی لیتے ہیں تا کہ کوئی کسی کا سامان وغیرہ لوٹ کر نہ لے جا سکے۔ شین ڈنڈ کا یہ باشندہ اغوا شدہ عورت کو لے کر عام راستوں سے ہٹ کر سفر کر رہا تھا تا کہ طالبان کی نظروں میں نہ آسکے لیکن ایک جگہ یہ شخص طالبان کے غزمہ والے دستے (پیٹرولنگ دستہ) کی نظروں میں آ گیا طالبان کے غزمہ والے افراد نے اس شخص کے پاس جا کر پوچھا کہ وہ عام راستہ سے ہٹ کر سفر کیوں کر رہا ہے۔ شین ڈنڈ کا یہ باشندہ طالبان کو اپنے سر پر سوار دیکھ کر گھبرا گیا اور کوئی معقول جواب نہ دے سکا جس کی وجہ سے طالبان اس شخص کو عورت سمیت اپنی نزدیکی چوکی پر لے گئے اور وہاں جا کر اس سے برقعہ پوش عورت کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے اس عورت کو اپنی بیوی بتایا جب برقعہ پوش خاتون سے مرد کے متعلق پوچھا گیا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور دہائی دیتے ہوئے اس نے طالبان کو بتایا کہ اس ظالم نے میرے گھر کی دو عورتوں کو زیادتی کرنے کے بعد قتل کر دیا ہے اور مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ اغوا کر کے لے جا رہا ہے، وہاں پر موجود طالبان اس مظلوم عورت کی داستان سن کر کانپ اٹھے انہوں نے قاتل کو پکڑ کر فوراً قاضی کی عدالت میں لے جا کر پیش کر دیا جہاں پر شرعی عدالت نے تحقیق کا حکم دیا، تحقیق سے اسی دن اس مجرم کا جرم ثابت ہو گیا بعد ازیں مجرم نے بھی اقبال جرم کر لیا، چنانچہ قاضی نے مظلوم عورت کی فریاد پر خون کا بدلہ خون، کا فیصلہ صادر کر دیا۔

طالبان کے غیور سپہ سالار ملا فضل اخوند نے بہارک میں داخل ہو کر جشن فتح منانے کی بجائے مظلوم عورت کو انصاف دلا کر اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی اور ظالم قاتل کو طالقان جانے والی سڑک کے کنارے ''قبر قاضی'' کے مقام پر ٹینک کے بیرل پر لٹکا دیا، اگر چہ اس وقت تک طالقان فتح ہو چکا تھا لیکن طالبان کے سپہ سالار اعلیٰ نے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے طالقان میں داخل ہونے سے پہلے ہی قصاص لے لیا اور وہ بھی اپنے ہی ایک ساتھی سے، شین ڈنڈ کے اس ظالم باشندے کی لاش کئی دن تک طالبان کے سالار اعلیٰ کے

حکم سے ٹینک کے بیرل کے ساتھ لٹکتی رہی، ایک پرچہ پر اس کے جرم کی مکمل تفصیل لکھ کر اس کے گلے میں ڈال دیا گیا تاکہ ہر آنے جانے والا اس سے عبرت حاصل کرے۔"

باشی حامد (جیل وارڈن) نے بتایا کہ "میں نے اس واقعہ کی تفصیل لاش کے گلے میں لٹکے ہوئے پرچے سے اور بہارک کی عوام کی زبانی خود سنی ہے۔" طالبان کے عدل وانصاف کا یہ واقعہ سنا کر باشی حامد نے طالبان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے بتایا کہ "ہمارے علاقوں کی غریب عوام بھی شدت سے طالبان کا انتظار کر رہے ہیں۔

طالبان کے طالقان فتح کرنے سے کچھ دن پہلے طالبان کے مایہ ناز جنگی پائلٹ جنرل اللہ داد بھی گرفتار ہو کر ہمارے پاس جیل میں پہنچ گئے تھے جنہیں کچھ دن تک باہر کلینک میں میرے ساتھ بند کیا گیا تھا۔ ایک روز میرے پوچھنے پر جنرل اللہ داد نے اپنی گرفتاری کی داستان سناتے ہوئے بتایا کہ "میں طالقان کے ایک اہم فوجی مرکز کو کامیابی سے نشانہ بنا کر واپس جا رہا تھا کہ میرے جہاز کا پر پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرا گیا جس کی وجہ سے جہاز کو آگ لگ گئی اور اس کا توازن بگڑ گیا چنانچہ میں پیراشوٹ کے ذریعے نیچے کود گیا، میں آخر وقت تک جہاز میں رہا تاکہ طالبان کے زیر کنٹرول علاقہ میں کود سکوں لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ جب میں جہاز سے پیراشوٹ کے ذریعے نیچے کی طرف آیا تو بدقسمتی سے میں شمالی اتحاد کے علاقہ میں پہنچ گیا، گرفتاری سے پہلے میں نے اپنے سروس پسٹل کے ذریعہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور آخرکار گولیاں ختم ہو جانے کی وجہ سے گرفتار ہو گیا۔

جیل کے سرپرست مخدوم عبدالرقیب اور اس کے عہدیداروں کے مقابلہ میں جیل سپریٹنڈنٹ امیر خان اور اس کے نائبین کسی حد تک اصول پسند واقع ہوئے تھے، امیر خان اور اس کے نائب قاضی عثمان نے مجھے کبھی بھی بے جا تنگ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان لوگوں نے میرے سے کبھی کوئی دوائی طلب کی اگر ان کو کبھی کسی دوائی کی ضرورت پڑتی تو یہ لوگ دوائی کا معاوضہ دینے کی کوشش کرتے یا بدلے میں مجھے طالقان شہر سے ایسی دوائی لا کر دے دیتے تھے جو کلینک میں موجود نہیں ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں قاضی عثمان نے قیدیوں کی منتقلی کے دوران قیدیوں پر ایک ایسا احسان بھی کیا جسے میں تاعمر یاد رکھوں گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس کی

ہدایت کے لیے دعا کرتا رہوں گا، مخدوم عبدالرقیب کے نائبین میں ایک شخص مولوی عبدالخالق ایسا تھا جسے ابتداء میں ہم اپنا ہمدرد سمجھتے تھے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کی اصلیت سامنے آ گئی، یہ شخص انتہا درجہ کا منافق، آدمی تھا، ہمدردی کی آڑ میں قیدیوں کی جڑیں کاٹنے کی اور ان کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتا، ورنجیوں میں ہاشی حامد جسے قیدیوں سے ہمدردی کے جرم میں نوکری سے نکال دیا گیا تھا کے علاوہ ایک بیس پچیس سالہ لڑکا نجیب اللہ ایسا تھا جو قیدیوں سے ہمدردی رکھتا تھا جس کا دل قیدیوں کے دلوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔

طالبان کے ہاتھوں طالقان کی فتح کے اثرات یہاں جیل میں بھی محسوس ہو رہے تھے کیونکہ جیل کی سیکورٹی پہلے سے کئی گنا بڑھا دی گئی تھی اور قیدیوں پر بھی کافی زیادہ سختی شروع ہوگئی تھی اسی دوران مخدوم رقیب نے ایک روز مجھے بھی کلینک سے اندر دوسرے قیدیوں کے ساتھ منتقل ہونے کا حکم صادر کر دیا، چنانچہ میں نے اندر جانے سے پہلے کلینک کو تالہ لگا دیا اور جب میں پہرے دار کے ساتھ اندر جانے لگا تو مخدوم رقیب نے کلینک کی چابی مجھ سے مانگتے ہوئے کہا: ''ڈکتور صاحب! کلینک کی چابی مجھے دے جاؤ اور ضرورت کے وقت مجھ سے لے لیا کرنا'' میں نے مخدوم رقیب کو جواب دیتے ہوئے کہا ''مخدوم صاحب! کلینک میں ہماری ذاتی ادویات پڑی ہوئی ہیں اور میں نہیں چاہوں گا کہ اس کی چابی کسی اور کو دوں اور اگر آپ جبراً مجھ سے کلینک کی چابی لینا چاہیں تو میں آپ کو منع نہیں کر سکتا کیونکہ ایک قیدی ہوں اور قیدی کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔'' میری یہ باتیں سن کر مخدوم رقیب نے کچھ سوچنے کے بعد کلینک کی چابی میرے پاس ہی رہنے دی اور شام کے وقت مجھے اندر دوسرے قیدیوں کے ساتھ بند کر دیا۔

قاضی عثمان کی انسانیت اور...... مخدوم رقیب کی حیوانیت

جس روز مجھے اندر جانے کا حکم ملا اسی روز میں نے باورچی خانے میں کام کرنے والے ساتھیوں کی مدد سے راز داری کے ساتھ ضرورت کی اہم ادویات قیدیوں کو کھانا دینے والی کھڑکی کے ذریعہ اندر بھیج دیں جہاں پر مختلف ساتھیوں میں یہ ادویات تقسیم کر دی گئیں تا کہ بوقت ضرورت استعمال میں لائی جا سکیں۔

ان مخدوش حالات میں شمالی اتحاد کے جنگجوؤں نے جیل کے اردگرد پہاڑی ٹیکریوں پر

مورچے بنا لیے اور تمام راستوں پر ناکے لگا دیئے، جہاں پہ ہر آنے جانے والے اور گاڑیوں کی تلاشی لی جانے لگی، جیل کے اردگرد مورچہ بندیوں کو دیکھ کر اور جیل انتظامیہ کی طرف سے روز بروز بڑھتی ہوئی سختی کی وجہ سے جہاں تمام قیدی پریشانی اور تشویش میں مبتلا تھے وہیں پر مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں جیل انتظامیہ کو گجر قبیلہ کی طرف سے قیدیوں کو چھڑانے کی سازش کا پتا نہ چل گیا ہو کیونکہ میں بھی اس سازش میں کسی حد تک شامل تھا ایسے میں جب بھی کوئی پہرے دار جیل میں داخل ہوتا تو میرا دل دھک دھک کرنے لگ جاتا۔

جیل میں جہاں طالبان کے تنگی فرخار (وہ تنگ گزرگاہ جہاں پر بلند و بالا پہاڑ اور انتہائی گہرائی میں موجود دریا کے درمیان فقط سڑک ہے جس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی ہے کہ اس تنگ راستے کو احمد شاہ مسعود کی سپاہ نے طالقان سے پسپا ہونے کے بعد بارود لگا کر اڑا دیا تھا جس کی وجہ سے یہاں تک پہنچ کر طالبان کی پیش قدمی رک گئی تھی) تک پہنچ جانے کی خبریں مل رہی تھیں وہیں پر پہرہ داروں کی زبانی ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ شمالی اتحاد کے حکام قیدیوں کو طالبان کے حملے کے پیش نظر کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

ایک دن صبح کے وقت پہرہ داروں نے قیدیوں کو آ کر بتایا کہ "آپ لوگ تیاری کر لیں کیونکہ آپ لوگوں کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے گاڑیاں جیل میں پہنچنے والی ہیں۔" ہم تمام قیدی پہلے ہی اپنا سامان وغیرہ باندھ کر تیاری کی حالت میں تھے کیونکہ ہمیں پتا تھا کہ کسی بھی وقت اچانک ہمیں کوچ کا حکم مل سکتا ہے، نماز ظہر کے بعد ڈپٹی سپرٹینڈنٹ جیل قاضی عثمان چند پہرہ داروں کے ساتھ قیدیوں کو گننے اور ان کو لے جانے کی ترتیب بنانے کے لیے جیل میں آئے، قاضی عثمان نے جب مجھے قیدیوں کے درمیان دیکھا (قاضی عثمان اپنی چھٹی گذار کر آج ہی جیل میں پہنچے تھے) تو مجھ سے پوچھنے لگے "دکتور صاحب! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں......؟ آپ نے اپنی ادویات وغیرہ لے جانے کے لیے پیک کر لی ہیں یا نہیں۔" میں نے قاضی عثمان کو جواب دیتے ہوئے کہا "قاضی صاحب! میں تو تین چار روز سے مخدوم رقیب کے حکم سے یہاں دوسرے قیدیوں کے ساتھ بند ہوں اور مخدوم صاحب دوائیاں پیک کرنے اور

لے جانے کی بھی اجازت نہیں دے رہے۔'' میری بات سن کر قاضی عثمان نے غصہ میں کھولتے ہوئے لہجے میں کہا ''مخدوم رقیب کون ہوتا ہے قیدیوں کے ذاتی مال پر قبضہ کرنے والا......! دکتور صاحب! آپ پہرہ دار کے ساتھ فوراً باہر جائیں اور کلینک میں جا کر اپنا سامان جلدی سے پیک کریں، مخدوم رقیب کو میں خود دیکھ لوں گا۔'' میں جب پہرے دار کے ساتھ اندرونی راستے کے ذریعے باہر جانے لگا تو قاضی عثمان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''دکتور صاحب! باہر آپ کے دوست جنرل امام الدین صاحب بھی آئے ہوئے ہیں اور وہ آپ کا پوچھ رہے تھے، ان سے بھی مل لینا۔''

میں نے جلدی جلدی کلینک میں پہنچ کر پہرے دار کی مدد سے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا، ابھی میں نے کلینک کا سامان پیک کرنا شروع ہی کیا تھا (کہ قاضی عثمان کے جس احسان کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کیا وہ یہی تھا کہ اس نے ہماری دوائیاں مخدوم رقیب کے قبضہ میں جانے سے بچائیں۔) مخدوم رقیب کلینک میں آ دھمکا اور آتے ہی میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھ سے کہنے لگا ''دکتور صاحب (ڈاکٹر صاحب) اچھا ہوا آپ آ گئے...... میں ابھی آپ کو بلانے ہی والا تھا۔'' بعد ازیں یہ کمینہ شخص انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ مجھ سے دوائیاں طلب کرنے لگا، مخدوم رقیب کی باتیں سن کر وہاں پر موجود قاضی عثمان کے گروپ کا پہرے دار چپکے سے باہر نکل گیا اور اس نے جا کر قاضی عثمان کو صورت حال سے آگاہ کر دیا چنانچہ تھوڑی دیر بعد جب مخدوم رقیب مجھ سے دوائیاں ہتھیانے میں حد سے بڑھ رہا تھا قاضی عثمان اور جنرل امام الدین کلینک میں آ پہنچے، میں نے کھڑے ہو کر جنرل امام الدین کا استقبال کیا اور ان سے حال احوال پوچھا، جنرل امام الدین خندہ پیشانی سے مجھے ملا بعد ازیں انہوں نے باہر نکلتے ہوئے مخدوم رقیب سے تحکمانہ لہجے میں کہا ''مخدوم صاحب! آپ ذرا باہر آئیں۔'' علاوہ ازیں قاضی عثمان نے اپنے دو پہرے داروں کو حکم دیتے ہوئے کہا کہ ''دکتور صاحب کا سامان جلدی سے پیک کروا دو۔'' ان لوگوں کے جانے کے بعد پہرہ داروں نے تیزی کے ساتھ کلینک کا سارا سامان پیک کر دیا اس دوران قیدیوں کو بھی ایک قطار میں لا کر باہر کھڑی گاڑیوں میں بٹھایا جانے لگا چنانچہ میں نے دو قیدی ساتھیوں بھائی عبید اللہ شاہین عبید اللہ سندھی کو بلا کر ان سے

کلینک کا سامان اٹھوا کر باہر کھڑی گاڑی میں رکھوا دیا اور خود کلینک میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا اتنے میں مخدوم رقیب کا نائب مولوی عبدالخالق ورنجی کلینک میں آ دھمکا اور آتے ہی مجھے کہنے لگا ''دکتور صاحب! آپ انتہائی زہریلے ناگ ہیں.......... آپ نے ہم ورنجیوں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا..........؟ آپ نے جو نفاق کا بیج امیر خان کے تجارتی گروپ اور ہم ورنجیوں کے درمیان بویا تھا آج وہ تناور درخت بن گیا ہے، آپ کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر آج ہم باہم دست وگریبان ہو چکے ہیں علاوہ ازیں تمہاری ہی وجہ سے آج جنرل امام الدین جو ہمارا ہی ہم وطن ہے نے مخدوم رقیب اور ہمیں بہت ذلیل و رسوا کرتے ہوئے سب لوگوں کے سامنے ہماری اچھی خاصی بے عزتی کر دی۔''

میں نے مولوی عبدالخالق کو جواب دیتے ہوئے کہا ''مولوی صاحب! مکافات عمل تو ہوتا ہے، آپ جو کچھ بوئیں گے وہی کاٹیں گے اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔'' مولوی عبدالخالق نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''دکتور صاحب یہ آپ کے اور ہمارے درمیان ایک غیر مرئی اور غیر محسوس مقابلہ تھا جس میں کسی ایک فریق کو تو جیتنا ہی تھا چنانچہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہم سب کے مقابلہ میں آپ اکیلے جیت گئے اور ہماری صفوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی دراڑیں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے، اپنے اور اپنے ساتھیوں کی بہتری کے لیے کچھ بھی کرنا آپ کا حق تھا، میں آپ کی اس چالاکی کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

اتنا کہنے کے بعد مولوی عبدالخالق کلینک سے باہر نکل گیا اس کے پیچھے میں بھی کلینک سے باہر آ گیا جہاں پر عبدالحکیم باورچی میرے انتظار میں کھڑا تھا، عبدالحکیم مجھ سے گلے ملتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا اور روتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''دکتور صاحب! اگر آپ یہاں سے آزاد ہو کر جاتے تو مجھے اور میرے گھر والوں کو بہت زیادہ خوشی ہوتی لیکن یہ ظالم لوگ نجانے آپ لوگوں کو کہاں لے جائیں گے اور آپ لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔'' عبدالحکیم نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ پہرے دار مجھے بلانے کے لیے آ گیا، عبدالحکیم ایک بار پھر مجھے گلے ملا اور پرنم آنکھوں اور خلوص بھری دعاؤں کے ساتھ مجھ سے جدا ہو گیا، میں باہر فوجی ٹرکوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا وہیں پر قریب ہی

جنرل امام الدین اور لڑدہ گاؤں کے سربراہ ملا عطا کھڑے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی جنرل امام الدین نے مخدوم رقیب کو بلا کر حکم دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو آگے گاڑی کے کیبن میں بٹھانا، مخدوم کو یہ حکم دے کر جنرل صاحب آگے کھڑی اپنی جیپ کی طرف چلے گئے، تھوڑی دیر بعد مخدوم رقیب نے مجھے ٹرک کے پچھلے حصے میں جہاں دوسرے طالبان ساتھیوں کو زنجیروں میں جکڑا جا رہا تھا بٹھا دیا، ساتھیوں کی حالت زار کو دیکھ کر میرا دل کڑھ رہا تھا کیونکہ ان کے ہاتھوں کو بہت زیادہ سختی کے ساتھ آہنی زنجیروں سے جکڑا جا رہا تھا جس سے تمام ساتھی اذیت میں مبتلا ہو رہے تھے۔ مجھے گاڑی میں بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ کمانڈر ملا عطا ادھر آ نکلے اور مجھے ٹرک کے پچھلے حصے میں دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگے ''دکتور صاحب آپ کو آگے کیبن میں بیٹھنا تھا یہاں آپ کو کس نے بٹھایا ہے؟'' میں خاموش رہا جبکہ میرے قریب بھائی رحمت اللہ نے انتہائی جرأت کے ساتھ ملا عطا کو بتایا کہ مخدوم رقیب ڈاکٹر صاحب کو یہاں بٹھا کر گئے ہیں۔'' ملا عطا نے فوراً مخدوم رقیب کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ اس نے ڈاکٹر صاحب کو یہاں کیوں بٹھایا ہے اس پر مخدوم رقیب نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے کہا ''کماندان صاحب کوئی پہرے دار اسے یہاں بٹھا گیا ہے حالانکہ اسی گاڑی کے کیبن میں میں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے جگہ بنا دی ہے۔'' چنانچہ مجھے ٹرک کے پچھلے حصے سے اتار کر اسی ٹرک کے کیبن میں بٹھا دیا گیا جہاں پر مولوی عبدالخالق اور نجیب اللہ ورسجی بھی میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔

جب قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر انجانی راہوں پر دھکیل دیا گیا

۱۹ دسمبر ۲۰۰۰ء کو نماز عصر کے قریب جب تمام قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر فوجی ٹرکوں میں بٹھایا جا چکا تو چار فوجی ٹرکوں اور تین جیپوں پر مشتمل یہ قافلہ فرخار کی طرف چل پڑا اور شام ۵ بجے ہمارا یہ قافلہ فرخار شہر کو عبور کر کے دوراہی فرخار سے طالقان شہر کو جانے والے راستے کو چھوڑ کر ''ولسوالی آہن قلعہ'' کی طرف مڑ گیا اور یہاں سے چند کلومیٹر آگے جا کر سڑک کے کنارے ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے قافلے کی گاڑیاں روک دی گئیں۔ یہاں پر چند

نئے گرفتار شدہ قیدیوں کو ٹرکوں سے اتار کر عمارت میں موجود شمالی اتحادی فوجیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ دراصل ان قیدیوں کو یکم ستمبر ۲۰۰۰ء کو جب طالبان نے طالقان فتح کیا تھا مسعودی فوجیوں نے کہیں سے گرفتار کر کے لڑ دہ پہنچا دیا تھا، طالقان میں موجود ان قیدی طالبان کے ساتھیوں نے شمالی اتحاد کے چند اہم افراد کو قید کر لیا اور شمالی اتحاد کے کمانڈروں کو پیغام بھیجا کہ اگر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہو تو ہمارے فلاں فلاں آدمی کو جن کو تم نے حال ہی میں گرفتار کیا ہے چھوڑ دو چنانچہ مسعودیوں نے اپنے قیدی چھڑانے کے لیے ان نو گرفتار شدہ طالبان قیدیوں کو تبادلے میں آزاد کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہاں پر اتار دیا تا کہ یہاں پر موجود شمالی اتحاد کے ذمہ دار افراد ان قیدیوں کے بدلے میں اپنے قیدی چھڑا سکیں۔

ٹرکوں میں بیٹھے ہوئے قیدی ساتھی سختی سے باندھی گئی زنجیروں کی وجہ سے انتہائی اذیت میں مبتلا تھے، کئی ساتھی تو اس نا قابل برداشت تکلیف کی وجہ سے رو رہے تھے (اور آہ وزاری کرتے ہوئے ٹرکوں پر موجود پہرے داروں کی منتیں کر رہے تھے کہ ہمارے ہاتھ کچھ ڈھیلے کر دو) لیکن پہرہ داروں پر قیدیوں کی تکلیف اور آہ وزاری کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا، مجھے ٹرک کے کیبن میں بیٹھے قیدیوں کی آہ وزاری صاف سنائی دے رہی تھی، میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے نجیب اللہ ورجی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''نجیب اللہ! خدا کا خوف کرو.......... تمام قیدی ہاتھ سختی سے بندھے ہونے کی وجہ سے تکلیف کا شکار ہیں.......... خدا کے لیے قیدیوں کے ہاتھ کچھ ڈھیلے کروا دو۔'' میری التجا سن کر نجیب اللہ ورجی فوراً گاڑی سے نیچے اتر گیا اور گاڑی کے بالکل قریب کھڑے مولوی عبدالخالق ورجی سے کہنے لگا کہ ''مولوی صاحب قیدیوں کی زنجیروں کے تالوں کی چابیاں مجھے دو تا کہ میں ان کے ہاتھوں کو ڈھیلا کر دوں۔'' مولوی عبدالخالق نے پہلے تو سختی سے انکار کر دیا لیکن نجیب اللہ نے جب بہت زیادہ اصرار اور سخت لہجہ اختیار کیا تو مولوی عبدالخالق نے چاروں ٹرکوں کے قیدیوں کی چابیاں جو پہلے علیحدہ علیحدہ تھیں خلط ملط کر کے نجیب اللہ کو دے دیں، نجیب اللہ کافی دیر تک ٹرکوں پر چڑھ کر قیدیوں کے ہاتھوں میں بندھی ہوئی زنجیروں کے تالے کھولنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اتنی زیادہ چابیاں خلط ملط ہونے کی وجہ سے وہ صرف چند قیدیوں کے ہاتھ ڈھیلے کرنے میں کامیاب ہو سکا، اسی دوران

قافلے کی گاڑیاں حکم ملنے پر دوبارہ محو حرکت ہو گئیں اور نجیب اللہ کو مجبوراً گاڑی میں واپس آنا پڑا، نجیب اللہ کیبن میں آتے ہی مولوی عبدالخالق پر برس پڑا اور اسے سیدھی سناتے ہوئے پرنم آنکھوں اور انتہائی کرب زدہ لہجے میں کہنے لگا "تم انسان نہیں ہو اور نہ ہی تمہارے ساتھیوں میں کوئی انسانیت ہے.......... قیدی تکلیف سے مر رہے ہیں.......... چیخ و پکار کر رہے ہیں.......... اور.......... تم لوگ ہو کہ پتھر بنے ہوئے ہو" یہ باتیں کرتے ہوئے نجیب اللہ ورسجی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے جبکہ مولوی عبدالخالق انتہائی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختلف بہانے بنا کر مجھے اور نجیب اللہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جن ساتھیوں کے ہاتھ نجیب اللہ ڈھیلے کرنے میں کامیاب ہوا تھا ان میں بھائی سلطان بھی شامل تھا۔ جب بھائی سلطان کے ہاتھ کچھ حرکت کرنے کے قابل ہوئے تو اس نے پہرے داروں سے نظریں بچا کر اپنے پاس موجود سیفٹی پن کے ذریعہ کئی ساتھیوں کی زنجیروں کے تالے کھول کر ان کے ہاتھ ڈھیلے کر دیئے۔

جس جگہ کچھ دیر کے لیے ہم قیدیوں کا قافلہ ٹھہرا تھا اس سے صرف پانچ' چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر طالقان روڈ پر تنگی فرخار کی پہاڑی چوٹیوں پر طالبان لشکر کے مجاہد مورچہ زن تھے۔ اور قیدیوں تک پہنچنے اور انہیں آزاد کرانے کی پلاننگ میں مصروف تھے۔ (آزاد ہونے کے بعد ہمیں معلوم ہوا) لیکن شمالی اتحاد کے لوگ ہمیں ایسی راز داری اور خفیہ طریقہ سے عین طالبان کی ناک کے نیچے سے گذار کر لے گئے کہ طالبان کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، آزادی کے بعد تنگی فرخار پر وقت گذارنے والے ساتھیوں نے بتایا کہ "اگر آپ لوگوں کو اس راستے سے لے جانے کی طالبان کو بروقت خبر مل جاتی تو جہاں آپ لوگوں کو گھنٹہ بھر کے لیے ٹھہرایا گیا تھا وہاں پر طالبان کمانڈو دستہ پہاڑوں سے اتر کر کمانڈو کارروائی کے ذریعہ آسانی سے آپ لوگوں کو آزاد کروا سکتا تھا لیکن طالبان کو آپ لوگوں کے دوسری جگہ منتقل کیے جانے کے دو دن بعد معلوم ہوا کہ شمالی اتحاد والے قیدیوں کو یہاں سے گذار کر لے گئے ہیں۔

ساری رات سفر کرتے ہوئے تہجد کے وقت ہم لوگ ولایت (صوبہ) بدخشان کی ولسوالی (ضلع) "کشم" میں پہنچ گئے اور بغیر رکے ہماری گاڑیاں بدخشان کے شہر "کشم" کو پیچھے چھوڑتی

ہوئیں دریائے ''کوکچہ'' کو عبور کر کے دوبارہ ولایت (صوبہ) تخار کی حدود میں داخل ہو گئیں۔

ولایت بدخشاں کے شہر ''کشم'' کے آگے پیچھے اور بائیں جانب ولایت تخار کی حدود تھیں جبکہ دائیں جانب ولایت بدخشاں کا علاقہ تھا۔

دریائے کوکچہ عبور کرتے ہی ولایت (صوبہ) تخار کی ولسوالی (ضلع) ''روہستاک'' کی حدود شروع ہوگئی جونہی ہم قیدیوں کے قافلہ کی گاڑیاں دریا عبور کر کے ''روہستاک'' کی حدود میں داخل ہوئیں تو وہاں پر موجود مسلح لوگوں نے گاڑیوں کو اسلحہ کے زور پر رک جانے پر مجبور کر دیا۔

روہستاک کی حدود میں داخل ہوتے ہی زبردستی روکے جانے پر ہم تمام قیدی بہت خوش ہو رہے تھے اور مجھ سمیت اکثر ساتھیوں کو یہ امید ہوگئی تھی کہ اب یہاں سے ہم لوگ ضرور آزاد ہو جائیں گے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ روہستاک کا آزاد حکمران ''پیرم کول'' جو ازبک قوم سے تعلق رکھتا تھا احمد شاہ مسعود کا بہت بڑا دشمن ہے اور اسی دشمنی کی وجہ سے چند ماہ قبل احمد شاہ مسعود کی طرف سے طالبان کے خلاف مدد اور آپس میں مفاہمت کے لیے آئے ہوئے آٹھ افراد کے وفد کو پیرم کول نے ذبح کر کے دریائے کوکچہ میں پھینک دیا تھا لیکن ہمیں اس وقت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب تین گھنٹے ریڈیو (وائرلیس) کے ذریعہ جنرل امام الدین کے پیرم کول کے ساتھ مذاکرات کرنے کے بعد پیرم کول نے ہمارے قافلہ کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔

۲۴ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہمارا قافلہ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۰ء کو سہ پہر ۳ بجے دریائے ''آمو'' کے قریب آباد ولایت تخار کی ولسوائی ''چاہِ آب'' شہر کی ایک بڑی سی عمارت میں جا اترا جہاں قیدیوں کو زنجیروں سے آزاد کر کے مختلف کمروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جب قیدیوں کی حوالگی کی تمام کاغذی کارروائی مکمل ہوگئی تو بھائی بنیامین، بھائی رحمت اللہ، مولوی عبدالجلیل، مولوی عبدالصمد اور راقم اسی وقت ایک وفد کی صورت میں جیل کے مقامی ذمہ دار کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ ہم قیدیوں کے دس لاکھ پاکستانی روپے مخدوم رقیب کے پاس ہیں جو امانت کے طور پر ہم نے اس کے پاس رکھوائے تھے اب چونکہ ہم آپ لوگوں کی تحویل میں ہیں اور مخدوم

رقیب اور اس کا عملہ واپس جانے کی تیاری کر رہا ہے لہٰذا آپ مخدوم رقیب کو کہیں کہ وہ ہمارے روپے ہمیں دے کر جائے کیونکہ پھر کہاں ہم اسے ڈھونڈتے پھریں گے...... مقامی ذمہ دار نے ہماری بات سن کر ہمیں، مخدوم رقیب اور اس کے دو تین عہدیداروں کو ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا اور ہمارا معاملہ مخدوم کے سامنے پیش کر دیا، مخدوم رقیب نے چاپلوسی کرتے ہوئے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمیں اچانک لڑدہ سے اس طرف آنا پڑا جس کی وجہ سے میں آپ لوگوں کی رقم ساتھ نہیں لا سکا۔ لہٰذا...... چند دنوں تک میں آپ کی امانت آپ لوگوں تک پہنچا دوں گا۔'' بھائی رحمت اللہ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقامی ذمہ دار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''محترم! اگر آپ مخدوم رقیب کی ضمانت دیتے ہیں کہ یہ ہمارے روپے لوٹا دے گا تو ٹھیک ہے وگرنہ ہمیں اس شخص پر قطعاً اعتبار نہیں ہے کہ یہ واپس آئے گا۔'' مقامی ذمہ دار نے مخدوم رقیب سے چند باتیں کرنے کے بعد ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''میں ضمانت دیتا ہوں کہ مخدوم صاحب دو ہفتوں کے اندر اندر آپ لوگوں کی امانت لا کر آپ کے حوالے کر دے گا، مجلس برخاست ہونے کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں آ گئے جبکہ مخدوم رقیب اور اس کا عملہ واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا، جنرل امام الدین اور اس کے آدمی چاہ آب شہر میں داخل ہوتے ہی کسی اور طرف نکل گئے اور ہمارے ساتھ اس عمارت میں نہیں آئے تھے۔

چاہِ آب کی یہ عمارت جس میں لا کر ہمیں بند کیا گیا تھا آج سے چند سال قبل پاکستانی مجاہدین کی قرارگاہ ہوا کرتی تھی اور اس بات کی گواہی اس عمارت کے در و دیوار دے رہے تھے کیونکہ اسی عمارت کے دروازوں اور دیواروں پر جگہ جگہ ''حرکت المجاہدین'' اور ہمارے پاکستانی مجاہد ساتھیوں کے نام لکھے ہوئے اور آج اسی عمارت میں ہم قیدیوں کی حیثیت سے بند تھے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب روس افغانستان سے شرمناک شکست کھا کر واپس بھاگا تھا، روس کی اس ہزیمت اور پسپائی نے روس کی دوسری مقبوضہ مسلم ریاستوں کے مجاہدین کو جو برسوں سے روسی استبداد کی چکیوں میں پس رہے تھے ایک نیا ولولہ اور حوصلہ بخشا اور انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں آزادی کی تحریکیں شروع کر دیں، ''چاہ آب'' سے کچھ فاصلہ پر دریائے آمو کے اس پار روس کے مقبوضہ تاجکستان میں ''نضہت اسلامی'' نامی ایک تحریک نے سید

عبداللہ نوری کی قیادت میں روسی استعمار کے خلاف علم جہاد بلند کیا چنانچہ پاکستان سے شمع توحید کے پروانے جوق در جوق مولانا عبدالجبار کی قیادت میں تاجکستان کا رخ کرنے لگے، تاجکستان محاذ پر جانے والے پاکستانی مجاہدین کی اس علاقہ میں پہلی قرار گاہ یہی عمارت تھی جس میں آج ہم قید تھے۔

''نہضت اسلامی'' کی تحریک جہاد کو ختم کرنے کے لیے احمد شاہ مسعود نے اپنے آقا روس کے حکم پر ۹۰ کی دہائی میں کارروائیاں شروع کیں اور سب سے پہلے اس نے چاہ آب کے ہر دلعزیز کمانڈر اور تاجکستان کے جہاد کے روح رواں انجینئر بشیر کو چاہ آب ہی کے ایک علاقہ میں دھوکہ سے شہید کرا دیا اس کے علاوہ کئی اور اہم کمانڈر بھی احمد شاہ مسعود کی شقاوت قلبی کا نشانہ بنے۔

۱۹۹۴ء میں حرکت المجاہدین کے مایہ ناز کمانڈر اسلم شاہین اور ایک عرب کمانڈر کو بھی چاہ آب شہر کے ایک گھر میں احمد شاہ مسعود کے حکم پر شہید کر دیا گیا، علاوہ ازیں تاجکستان کے امیر سید عبداللہ نوری اور اس کے ساتھیوں کو بھی احمد شاہ مسعود نے بہت دھوکے دیئے جس کی وجہ سے تحریک جہاد تاجکستان چند سالوں میں ہی دب گئی۔ ''چاہ آب'' میں عام لوگوں کے دلوں میں احمد شاہ مسعود کے لیے بہت زیادہ نفرت پائی جاتی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ اس نے ''چاہ آب'' کے محبوب کمانڈر انجینئر بشیر اور اس کے ساتھیوں کو شہید کروایا تھا۔

چاہ آب شہر کی اس عمارت میں رات گذارنے کے بعد اگلے دن یعنی ۲۱ ستمبر ۲۰۰۰ء کو ایک اور مشکل ترین سفر ہمارا منتظر تھا، چنانچہ ۲۱ ستمبر کی صبح ہمیں دوبارہ ٹرکوں پر سوار کرا دیا گیا اور ٹرک ہمیں لے کر ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے، دوپہر کے وقت پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی جگہ پر جہاں آگے گاڑی جانے کا راستہ ختم ہو جاتا تھا وہاں پر ہمیں ٹرکوں سے اتار دیا گیا۔ تمام قیدی گاڑیوں سے اتر کر نیچے ادھر ادھر ہو کر پتھروں پر بیٹھ گئے اور پہرے دار بھی ہمارے اردگرد پھیل کر کھڑے ہو گئے جبکہ پہرے داروں کے دو آفیسر ہمارے دائیں طرف دور نظر آنے والی بستی میں چلے گئے، آدھے گھنٹے بعد جب یہ ذمہ دار بستی سے واپس آئے تو ان کے ساتھ آٹھ دس گدھے اور گدھوں کو چلانے والے نوعمر لڑکے بھی تھے۔

ہم تمام قیدی اس صورت حال میں بہت زیادہ اضطراب کا شکار تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کرنا کیا چاہ رہے ہیں اور ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں، اپنی پریشانی کو رفع کرنے کے لیے میں نے ایک پہرے دار سے پوچھا ''قوماندان! ما مردم را کجا مے بری'' یعنی ہم لوگوں کو کہاں لے جا رہے ہو۔'' پہرے دار نے جواب دیتے ہوئے کہا ''واللہ مانمی دانم'' (واللہ میں نہیں جانتا) ابھی میں پہرہ دار کی اس لاعلمی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بستی سے گدھے لانے والے ایک کمانڈر نے سب قیدیوں کو اپنا سامان گدھوں کے پاس جمع کرنے کا حکم دیا جب سارا سامان جمع ہوگیا تو گدھوں کے ساتھ آئے ہوئے نوعمر لڑکوں نے سامان گدھوں پر لادنا کرنا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ سو قیدیوں کا سامان صرف ۴ گدھوں پر پورا آ گیا بقایا بچ جانے والے گدھوں میں سے ایک گدھے پر زین ڈال کر دو لڑکوں نے مجھے احتیاط کے ساتھ سوار کرا دیا بقیہ چار گدھوں پر مریض اور لاغر ساتھیوں کو سوار کرا دیا گیا بعد ازیں تمام قیدیوں کو ایک قطار میں ہو کر آگے پہاڑوں کی طرف چلنے کا حکم ملا چنانچہ تمام قیدی ایک قطار میں ہو کر چلنے لگے اور پہرے دار بھی کچھ قیدیوں کی قطار کے شروع میں اور کچھ قطار کے آخر میں قیدیوں کے ساتھ چلنے لگے اور اس طرح انجانی راہوں کا پر خطر سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

میں ایک توانا گدھے پر سوار تھا، گدھے کو کنٹرول کرنے کے لیے دو ۱۶، ۱۷ سال کی عمر کے لڑکے گدھے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، گدھا جب کہیں سست پڑتا تو لڑکے اسے ہانک لگاتے ہوئے کہتے ''زود بورو مسعودا'' ان کی یہ ہانک عجیب سی تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی چنانچہ میں نے ایک لڑکے سے پوچھا ''برادر! تو خر را چی میگوئی'' (بھائی تم گدھے کو کیا کہتے ہو) دونوں لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا: ''ما خر را مسعود میگوئیم'' میں نے نہ سمجھتے ہوئے ان لڑکوں سے پھر پوچھا ''مسعود چہ معنی'' (مسعود کا کیا مطلب) میرے اس سوال پر ایک لڑکے نے شوخی سے کہا ''احمد شاہ مسعود'' میں نے لڑکوں کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ کسی انسان کو گدھا نہیں کہنا چاہیے دوسرے لڑکے نے فی البدیہہ میری بات اچکتے ہوئے کہا کیونکہ اس سے گدھا ناراض ہو جاتا ہے.........لڑکے کی یہ بات سن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

پوری زندگی میں گدھے پر سواری کرنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا.......... اس لیے میں گدھوں کی عادتوں سے واقف نہیں تھا۔ میرا گدھا اگرچہ بڑے سکون سے پہاڑوں کی چڑھائی چڑھ رہا تھا لیکن ایک قباحت اس میں تھی کہ وہ سینکڑوں فٹ کی گہری کھائیوں کے عین کنارے پر چلتا تھا...... گدھے کو میں راستے کے درمیان چلانے کی کوشش کرتا لیکن گدھا پھر گدھا تھا.......... گدھے کی ضد تو مشہور ہے اسی ضد کی بنا پر میرا یہ گدھا گہری کھائیوں کی عین زیر ولائن پر ہی چلنے کو بضد تھا.......... گدھے کی اس ضد نے میرے پسینے چھڑا دیئے تھے کیونکہ گہری سنگلاخ کھائیوں کو دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا، یہ کھائیاں میں پہلی دفع نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس سے خطرناک اور گہری کھائیوں سے جنگوں کے دوران اکثر واسطہ پڑتا رہتا تھا ایسی جگہوں سے میں اتنا خوف زدہ کبھی بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت میں ایک ضدی گدھے پر سوار تھا علاوہ ازیں مصنوعی ٹانگ کی وجہ سے مجھے گدھے پر بیٹھے اپنا توازن برقرار رکھنے میں بھی کافی محنت کرنا پڑ رہی تھی اس دوران بار بار میرے ذہن میں یہی خیال آتا کہ اگر کھائی کی زیر ولائن پر چلتے ہوئے گدھے کا پاؤں تھوڑا سا بھی سلپ ہو گیا تو.......... میں سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں گدھے سے پہلے جا گروں گا.......... یہ سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آ رہی تھی چنانچہ میں نے مجبور ہو کر لڑکوں سے کہا کہ گدھے کو راستے میں چلانے کی کوشش کرو! میری اس بات پر ایک لڑنے نے کہا: ''برادر! ہمارے گدھے سدھائے ہوئے ہیں اس لیے یہ اپنی سائیڈ پر ہی چلتے ہیں اور یہ اپنے سوار کو کبھی گراتے بھی نہیں...... اس لیے آپ بے فکر ہو کر بیٹھے رہیں، علاوہ ازیں ہمارے یہ گدھے روزانہ ان راستوں پر پر آتے جاتے ہیں اس لیے یہ راستوں کے نشیب فراز سے خوب واقف ہیں اور کہیں ٹھوکر نہیں کھاتے اور پھر یہ گدھا جس پر آپ سوار ہیں تمام گدھوں سے زیادہ تیز اور طاقتور ہے'' لڑکے کی باتیں سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی اور میرا خوف قدرے کم ہو گیا۔

پہاڑی نشیب وفراز کا سفر کرتے ہوئے شام ۴ بجے آگے چلنے والے پہرے دار ہمیں اپنے پیچھے لے جا کر پہاڑوں کے درمیان بنی ہوئی خندق میں جا داخل ہوئے کیونکہ اردگرد اس خندق کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا چنانچہ تمام قیدی قد آدم بنی ہوئی خندق میں چلنے لگے

ابتداء میں خندق قدرے ہموار تھی اس لیے میں گدھے پر سوار آسانی سے جا رہا تھا لیکن جوں جوں ہم خندق میں آگے بڑھ رہے تھے خندق تنگ ہوتی جا رہی تھی پیدل چلنے والے تو تنگ جگہ سے بھی آسانی سے گذر رہے تھے لیکن ہم گدھا سواروں کے لیے آگے بڑھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا کیونکہ خندق کی دیواروں کے ساتھ ہماری ٹانگیں ٹکرانا شروع ہوگئی تھیں چنانچہ ہم گدھا سواروں کو بھی گدھوں سے اتر کر پیدل چلنا پڑا، میں ایک ٹانگ کے ساتھ زیادہ دور تک نہ چل سکا، مجھے ایک تھکے ماندے افغانی طالب نے اپنے کندھوں پہ اٹھا لیا لیکن کچھ دور چلنے کے بعد اس کی ہمت بھی جواب دے گئی اور اس نے مجھے نیچے اتار دیا اسی دوران قریب کی کسی بستی سے قیدیوں کو دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ایک آدمی نے بھاگ کر مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور تیز تیز آگے کی طرف چلنے لگا، تھوڑی دیر مزید چلنے کے بعد شام ۷ بجے ہم ایک بستی ''خرسنگان'' کی لگاٹ (بارشی پانی کی گذرگاہ) میں جا اترے، یہاں اترنے کے بعد پہرہ داروں کے کمانڈر کی طرف سے ہمیں حکم موصول ہوا کہ رات یہیں گذارنی ہے چنانچہ تمام قیدی ساتھی عشاء کی نماز وغیرہ پڑھ کر بھوکے پیٹ پتھروں پر لیٹ گئے، تھکاوٹ کی وجہ سے لیٹتے ہی سب ساتھی گہری نیند سو گئے۔

☆☆☆☆

آٹھواں حصہ:

الواسا جنگل

۲۲ اکتوبر ۲۰۰۰ء کی صبح فجر کی نماز کے بعد ایک بار پھر ہمیں کوچ کرنے کا حکم ملا چنانچہ تمام قیدی حسب سابق ایک قطار کی صورت میں پہرے داروں کے پیچھے چلنے لگے جبکہ میں اور چند دیگر مریض ساتھی گدھوں پر سوار قیدیوں کی قطار کے درمیان میں چل رہے تھے۔

گرتے پڑتے ہم قیدی سنگلاخ پہاڑوں، ندی نالوں اور مختلف گھاٹیوں کو عبور کرتے آخر کار ظہر کے وقت دریائے آمو کے کنارے ''الواسا'' نامی ایک جنگل نما درے میں جا اترے جس کے دونوں جانب بلند و بالا پہاڑ تھے جبکہ درے کے آخر میں شمال کی سمت دریائے آمو بہہ رہا تھا۔ درے کے دونوں راستوں پر پہرے دار بیٹھ گئے اور درمیان کی کشادہ جگہ پر قیدیوں کو محصور کر کے اس جگہ کو جیل قرار دے دیا گیا۔

یہ درہ الواسا دیکھنے کو بہت خوبصورت اور سرسبز تھا، میٹھے پانی کے چشموں کی بھی یہاں بہتات تھی لیکن یہ سرسبز درہ قیدیوں کے لیے ایک عذاب ثابت ہوا کیونکہ یہاں سر چھپانے کے لیے کوئی کمرہ وغیرہ نہیں تھا اور پھر ہم قیدیوں کے پاس نیچے بچھانے کے لیے کوئی چٹائی تھی نہ اوڑھنے کے لیے کمبل اس لیے تمام قیدی سردی اور بارش کے دوران ٹھٹھرتے ہوئے کھلے آسمان تلے ہی بیٹھنے پر مجبور تھے، رات کو ساتھی سردی سے بچنے کے لیے مرغی کے چوزوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھ جاتے اور اکثر رات جاگ کر گذارتے کیونکہ سمت شمال کی سخت سردی میں بغیر چھت اور بغیر لحاف کے کہاں سویا جا سکتا تھا، دن کے وقت سورج نکلنے پر ساتھی سو کر اپنی نیند پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے اور جب کبھی بارش ہو جاتی تو دن کے وقت بھی گیلی جگہ پر سونا ناممکن ہو جاتا، کھانا بھی یہاں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا، چوبیس گھنٹوں میں فی کس ایک پتلی سی اور خشک روٹی ملتی جسے قیدی چشمے کے پانی کے ساتھ نرم کر کے کھاتے تھے۔

''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کے مصداق کچھ دنوں کے بعد قیدی ساتھیوں نے پتھروں

اور درختوں کی ٹہنیوں کی مدد سے بارش اور سردی سے بچنے کے لیے ٹھکانے بنانے شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے درے میں جا بجا جھونپڑیوں کی صورت کے یہ ٹھکانے نظر آنے لگے علاوہ ازیں کچھ باہمت ساتھیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت پہاڑ کی بغل میں پہاڑ کو کھود کر چھوٹے چھوٹے غار بنا لیے ان غاروں میں ایک ایک دو دو آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔

ایک دن درہ الواسا میں بھائی رحمت اللہ کے نئے سروس کے بوٹ چوری ہو گئے، بھائی رحمت اللہ رات گئے تک اپنے بوٹوں کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہے، اس بے چھت جیل کے ذمہ دار ''دولت مند'' سے لے کر پہرے داروں تک سے بھائی رحمت اللہ نے اپنے انداز میں پوچھ گچھ کی لیکن ہر آدمی سے یہی جواب ملا کہ ''ہمیں آپ کے بوٹوں کے بارے میں کوئی علم نہیں۔'' بھائی رحمت اللہ کو جیل کے ذمہ دار دولت مند پر شک تھا لیکن قیدی ہونے کی وجہ سے اسے برمال کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آخر کار بھائی رحمت اللہ نے اپنے گاؤں کے ایک گھر کی چوری پکڑنے کے تجربہ کو یہاں پر دہرانے کا فیصلہ کیا اور کرنل (قیدی) دین محمد کے پاس جا کر اسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ کل آپ مجھے ایک بکری کا بچہ عارتاً منگوا دیں اور پہرہ داروں میں یہ بھی مشہور کر دیں کہ پاکستانیوں کے مولوی عبدالصمد صاحب بکری کے اس بچے پر کوئی عمل کریں گے جس سے بکری کے بچے کا پیٹ پھولنا شروع ہو جائے گا اور جیسے جیسے بکری کے بچے کا پیٹ پھولے گا ویسے ہی بوٹ چوری کرنے والے کا بھی پیٹ پھولنا شروع ہو جائے گا اور اگر چور نے عمل سے پہلے یا عمل کے دوران بوٹ واپس نہ کیے تو جیسے ہی بکری کے بچے کا پیٹ پھولتے پھولتے آخر پھٹ جائے گا اسی وقت چور کا پیٹ بھی ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا جس سے چور کا پتا بھی چل جائے گا اور وہ اپنے انجام کو بھی پہنچ جائے گا۔''

کرنل دین محمد کو اپنا پلان بتا کر بھائی رحمت اللہ اپنی جگہ پر چلے گئے اور صبح ہوتے ہی بھائی رحمت اللہ اور کرنل دین محمد نے پہرے داروں میں اسی پلان کی تشہیر کرنا شروع کر دی ادھر کرنل دین محمد نے پہرے دار سے بکری کا بچہ بھی منگوا لیا جو وہ قریب کی کسی بستی سے عارتاً لے آیا تھا۔ بھائی رحمت اللہ اور دیگر ساتھیوں نے پہرے داروں میں یہ بات مشہور کر دی کہ

آج رات ہمارے مولوی صاحب بکری کے اس بچے پر اپنا عمل شروع کریں گے۔

اسی دن مغرب کی نماز ایک کھلی جگہ پر باجماعت ادا کرنے کے بعد جب ساتھی اپنی اپنی جھونپڑیوں کا رخ کرنے لگے تو ایسے میں بھائی رحمت اللہ، بھائی بنیا مین اور دیگر چند ساتھی جب اپنے مشترکہ خیمے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بھائی رحمت اللہ کے سروس کے بوٹ خیمے میں پڑے ہوئے ہیں، پیٹ پھول کر پھٹنے کے خوف سے چور جو قوماندان دولت مند ہی تھا (ہمیں بعد میں پہرہ داروں کی زبانی معلوم ہو گیا تھا) قیدیوں کو نماز میں مصروف دیکھ کر چپکے سے بوٹ واپس بھائی رحمت اللہ کے خیمے میں رکھ گیا اور اس طرح بھائی رحمت اللہ کا حربہ کامیاب ثابت ہوا اور بھائی رحمت اللہ کے چوری شدہ بوٹ دستیاب ہو گئے۔

شمالی اتحاد والے ہمیں اس درہ میں کسی باقاعدہ پلان یا منصوبہ بندی کے تحت نہیں لائے تھے بلکہ جب طالبان طالقان فتح کرنے کے بعد تنگی فرخار پر آ کر مورچہ زن ہوئے تو ایسے میں یہ لوگ طالبان کے خوف سے انتہائی افراتفری کے عالم میں قیدیوں کو ٹرکوں میں ٹھونس کر لڑدہ سے نکل کھڑے ہوئے اور ''چاہ آب'' کی طرف چل پڑے، خود جیل کے عملہ کو بھی معلوم نہیں تھا کہ قیدیوں کو کہاں لے جا کر ٹھہرایا جائے گا یہی وجہ تھی کہ تین دن تک شمالی اتحاد کے فوجی ہمیں پہاڑوں کی سیر کرواتے مارے مارے پھرتے رہے دراصل طالبان کی دہشت اور خوف نے ان کی عقلوں کو ماؤف کر دیا تھا اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ قیدیوں کو کہاں رکھا جائے، طالبان کے ہاتھوں شکست پر شکست کھانے کی وجہ سے شمالی اتحاد کی اکثر سپاہ منتشر ہو چکی تھی جس کی وجہ سے ان کا آپس میں رابطے کا نظام بھی سست پڑا ہوا تھا اسی وجہ سے یہ لوگ ہم قیدیوں کو ایسی جگہ لے گئے جہاں دور دور تک گاڑیوں کا راستہ نہیں تھا لیکن اس دور افتادہ درے میں بھی شمالی اتحاد والوں کو یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں طالبان ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ آ کر اپنے قیدیوں کو نکال کر نہ لے جائیں۔

☆☆☆☆

نواں حصہ:

انجیز جیل چاہ آب ولایت تخار

پورا ایک مہینہ اس درہ میں آسمان تلے گذارنے کے بعد ہمیں ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو دریائے آموہی کے کنارے ''انجیز'' گاؤں کے علاقہ کی ایک بڑی سی حویلی میں منتقل کر دیا گیا، حویلی کیا تھی فقط چار دیواری تھی اور چار دیواری کے اندر کوئی کمرہ وغیرہ نہیں تھا چنانچہ چاہ آب کے سرحدی آفیسر اور اس جیل کے سرپرست اعلیٰ معاون عبدالاحد نے قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''بارش کا موسم شروع ہونے والا ہے اگر آپ لوگ بارش اور سردی سے بچنا چاہتے ہیں تو جتنی جلدی ہو سکے یہاں پر کمرے تعمیر کر لو، کمروں کی تعمیر کے لیے سارا سامان ہم آپ لوگوں کو مہیا کر دیتے ہیں اور تعمیرات کے ماہر دو تین مستری بھی آپ کی مدد کریں گے، اگر آپ لوگوں نے سستی کی اور کمروں کی تعمیر سے پہلے بارشیں شروع ہوگئیں تو یہ بارشیں آپ کو کمرے تعمیر نہیں کرنے دیں گی اور پھر آپ لوگوں کو اگلی گرمیوں تک آسمان کے نیچے ہی گذارا کرنا پڑے گا کیونکہ بارشوں کے بعد برف باری بھی شروع ہو جائے گی اور یہ سلسلہ موسم سرما ختم ہونے تک مسلسل چلتا رہے گا، اب یہ آپ لوگوں نے سوچنا ہے کہ تھوڑی سی محنت و مشقت بہتر ہے یا آسمان تلے برفانی موسم سے مقابلہ۔''

قیدی ساتھیوں نے بے پناہ مشقت برداشت کر کے اور انتہائی تیزی کے ساتھ صرف بیس پچیس دنوں کے اندر ۱۴ کمروں پر مشتمل جیل کی عمارت تعمیر کر ڈالی قیدی ساتھیوں کی اس پھرتی کو دیکھ کر جیل سرپرست معاون عبدالاحد اور گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے، دراصل قیدیوں کے ساتھ اللہ رب العزت کی مدد بھی شامل حال تھی اور اسی وجہ سے قیدی بھوک کمزوری اور ناتوانی کے باوجود بہت کم وقت میں کمرے تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

''انجیز' میں ہماری یہ نئی تیار شدہ جیل دریائے آمو کے کنارے پر واقع تھی جبکہ دریا کے اس پار شمال کی طرف ملک تاجکستان کی سرحدی چوکی اور مورچے وغیرہ تھے جہاں پر روسی اور تاجکی فوجی تعینات تھے، جب طالبان کی فتوحات کا سلسلہ قندھار سے ہوتا ہوا دریائے آمو تک

جا پہنچا تو روس نے انجانے خدشات کا شکار ہو کر اپنی ۲۰ ہزار تازہ دم فوج افغانستان کی سرحد پر لگا دی، ہمارے انجیز میں منتقل ہونے کی باقاعدہ اطلاع غالباً روسی فوجیوں کو کر دی گئی تھی کیونکہ ہمارے انجیز منتقل ہونے کے بعد روسی فوجی اکثر ہماری جیل کی طرف ہوائی فائرنگ کرتے رہتے تھے گویا کہ روسی فوجی ہمیں اپنی موجودگی اور چوکسی کا احساس دلا رہے ہوں، علاوہ ازیں رات کے وقت وقفے وقفے سے روسی فوجی اپنے مورچوں سے ہماری جیل کی فضاء میں روشنی کے گولے بھی پھینکتے رہتے تھے جس سے ہر طرف روشنی پھیل جاتی اور سورج نکلنے کا گمان ہوتا، ہم شمالی اتحاد سے زیادہ روسی فوجیوں کے نرغے میں یہاں پر موجود تھے۔ دریا کے اس پار روسی فوجی اونچائی پر بیٹھے ہر وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے تھے۔

اس جیل میں بھی ہم قیدیوں کو کھانا بہت کم ملتا تھا جس کی وجہ سے قیدیوں کو بھوک مٹانے کے لیے پتے کھانے پڑتے تھے۔ قیدیوں کو جب باہر بیگار پر لے جایا جاتا تو قیدی باہر جنگل سے پتے وغیرہ توڑ لاتے اور جیل میں آ کر پانی میں ابال کر کھا لیتے۔

ایک دن ایک پہرے دار نے ایک ایسے پودے کے بارے میں قیدیوں کو بتایا جس کی ترش ذائقہ جڑ مقامی لوگ شوقیہ کھایا کرتے تھے اس جڑ کو مقامی زبان میں ''چکری'' کہتے تھے۔ اس پودے کے دریافت ہونے سے قیدیوں کو گویا ہفت اقلیم ہاتھ لگ گئی کیونکہ جب بھی قیدی جنگل میں لکڑیاں وغیرہ کاٹنے جاتے تو جنگل میں جا بجا اگے ہوئے اس پودے کو جڑوں اور اس کے بڑے بڑے پتوں سمیت بہت زیادہ مقدار میں اکھاڑ کر لے آتے، مقامی لوگ تو صرف اس پودے کی نرم جڑ کبھی کبھار کھاتے تھے لیکن قیدیوں نے اس جڑ کے بڑے سائز کے پتوں کو بھی کھانا شروع کر دیا ان پتوں کا ذائقہ بھی جڑ کی طرح ترش ہی ہوتا تھا، قیدی ساتھی اس چکری کے پتوں کا ساگ کی مانند سالن تیار کرتے اور مزے لے لے کر کھاتے حالانکہ ان پتوں میں تیزابیت کا یہ حال تھا کہ پتوں کا سالن جس برتن میں ڈالتے وہ برتن اندر سے تیزابیت کی وجہ سے بالکل سفید ہو جاتا لیکن بھوک جب اپنے زوروں پر ہو تو ایسی چیزوں کی طرف کم ہی دھیان جاتا ہے۔

جنوری ۲۰۰۱ء میں صوبہ بدخشان سے تعلق رکھنے والے چند طالبان قیدیوں کو ہیلی کاپٹر

کے ذریعہ جیل میں لایا گیا، ان قیدیوں میں تحریک طالبان بدخشان کے امیر مولوی بشیران کے جنگی کمانڈر ملا علقمہ، قاری ضیاء الرحمٰن اور قاری عطاء الرحمٰن شامل تھے، احمد شاہ مسعود نے انہیں بدخشان سے شمالی اتحاد کے خلاف بغاوت کرنے کی کوشش کے جرم میں گرفتار کیا تھا، علاوہ ازیں ان کے ساتھ انجیز ہی کے کسی قریبی علاقہ سے تعلق رکھنے والا طالب ملا عادل بھی تھا جسے زخمی حالت میں والسوالی (ضلع) امام صاحب کے محاذ سے گرفتار کیا گیا تھا۔

جیل انتظامیہ نے کلینک کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کمروں سے باہر جیل کے صحن میں مجھے ایک خیمہ لگا کر دیا تھا، گرفتار ہو کر آنے والے زخمی ملا عادل کا میں نے اپنے کلینک یعنی خیمے میں علاج شروع کیا، اس کی ٹانگ پر کلاشنکوف کی دو گولیاں لگی ہوئی تھیں، زخم کافی گہرے تھے مگر ہڈی وغیرہ ٹوٹنے سے بچی ہوئی تھی اس لیے چند ہفتوں کے بعد مولوی عادل کے زخم بھر گئے اور وہ ٹھیک طریقے سے چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا، یہاں جیل میں چونکہ کوئی قابل ذکر ادویات موجود نہیں تھیں اس لیے زخموں کا علاج گرم پانی اور پائیوڈین ہی سے کرنا پڑتا تھا لیکن اللہ رب العزت کے خاص فضل و کرم سے قیدیوں کے بڑے بڑے اور خطرناک زخم صرف گرم پانی ہی سے بہت جلدی ٹھیک ہو جاتے تھے۔

ملا عادل چونکہ پاکستان کے مدارس کا پڑھا ہوا تھا اس لیے اردو بالکل صاف بول لیتا تھا اسی وجہ سے وہ تمام پاکستانیوں اور خصوصاً میرے گروپ (عبیداللہ شاہین، عبیداللہ سندھی، ابوعبیدہ اور چند دیگر ساتھی) کے ساتھ گھل مل گیا، ساتھیوں نے ملا عادل کی بہت زیادہ خدمت کی اور اس کا خاص خیال رکھا۔

انجیز جیل کا عملہ دو گروپوں پر مشتمل تھا جن میں ایک گروپ انجیز گاؤں کے مقامی لوگوں پر مشتمل تھا جن کا کمانڈر پہلے دولت مند نامی ایک شخص تھا، بعد میں دولت مند کی جگہ کمانڈر بشیر انجیزی آ گیا جبکہ دوسرا گروپ ازبک قوم سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا جو چاہ آب کے کسی دور دراز کے علاقہ کے رہنے والے تھے، اس گروپ کے کمانڈر کا نام مجھے یاد نہیں رہا اس لیے جہاں ضرورت پڑی میں اسے ازبک کمانڈر لکھوں گا، ان دونوں گروپوں کی ایک ایک مہینے کی باری تھی یعنی ایک گروپ ایک مہینہ ڈیوٹی کرتا اور دوسرا ایک مہینے کے لیے رخصت پر چلا

جاتا دوسرا گروپ رخصت پوری کر کے آتا تو پہلا رخصت پر چلا جاتا۔

انجیز جیل کے ابتدائی دنوں میں رات کو دو دو قیدیوں کے ہاتھوں میں ایک ایک زنجیر باندھ کر تالے لگا دیئے جاتے، زنجیر کچھ اس طرح باندھی جاتی تھی کہ دو قیدیوں کے ایک ایک ہاتھ میں زنجیر باندھ دی جاتی تھی جبکہ ایک ایک ہاتھ آزاد رہتا اس سے رات کو قیدیوں کو بیت الخلاء جانے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ ہاتھ اکٹھے بندھے ہونے کی وجہ سے اکیلا قیدی تو بیت الخلاء میں جا نہیں سکتا تھا جبکہ دو قیدیوں کا اکٹھا بیت الخلاء میں جانا کسی کو بھی پسند نہیں تھا اس مشکل کا حل بھائی سلطان اور بھائی اقبال نے اس طرح نکالا کہ جب صبح کے وقت پہرے دار قیدیوں کو زنجیروں کے تالے کھولنے کے لیے چابیاں دیتے تو وہ چابیوں کے نقش صابن پر اتار لیتے اور لوہے کی میخوں جو انہیں بیگار پر گاؤں جاتے ہوئے کہیں نہ کہیں سے مل جاتی تھیں کو پتھروں سے کوٹ کوٹ کر صابن پر لیے گئے نقش کے مطابق تیار کر لیتے اس طرح انہوں نے بہت سی چابیاں تیار کر لیں، چابیاں تیار ہونے کے بعد بھی قیدی ساتھی دو دو ہو کر ہی بیت الخلاء کی طرف جاتے تاکہ برجوں پر موجود پہرہ داروں کو شک نہ ہو سکے لیکن بیت الخلاء کے قریب جا کر دونوں ساتھی سیلف میڈ چابیوں کی مدد سے تالے کھول کر الگ الگ بیت الخلاء میں داخل ہو جاتے اور واپس آتے ہوئے قیدی پھر زنجیریں اپنے ہاتھوں میں ڈال لیتے۔

قیدی ساتھی اس سہولت کے دستیاب ہونے کے بعد کچھ غفلت کرنے لگے یعنی سوتے وقت زنجیریں ہاتھوں سے نکال کر سرہانے رکھ لیتے ایک رات ازبک کمانڈر نے جیل میں چھاپا مارا اور بہت سے قیدیوں کو بغیر زنجیر کے سوئے ہوئے پکڑ لیا اور ازبک کمانڈر نے اس وقت تو قیدیوں کو کچھ نہ کہا لیکن اگلے دن عصر کے وقت ازبک کمانڈر نے تمام قیدیوں کو میدان میں جمع کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہو کر کہا "برادران من! میں جانتا ہوں کہ یہ زنجیریں اور یہ بڑی بڑی دیواریں آپ لوگوں کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں لیکن خدا را میری عزت کا خیال کرو...... میں آپ لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہوں۔ آپ لوگوں کا بھی حق ہے کہ میرے ساتھ تعاون کریں...... آپ لوگ زنجیریں بے شک کھول لیا کریں...... لیکن سوتے وقت زنجیریں ہاتھوں میں ڈال کر سویا کریں تاکہ رات کو اگر کبھی کوئی افسر آپ لوگوں کو آ کر چیک

کرے تو آپ کو زنجیروں سے آزاد نہ پائے علاوہ ازیں میں معاون عبدالاحد صاحب کو سفارش کروں گا کہ آپ لوگوں سے زنجیروں کی پابندی اٹھا دیں۔

یہ ازبک کمانڈر کی شرافت داری تھی کہ اس نے جیل کا قانون توڑنے پر کسی قیدی کو سزا نہیں دی اگر یہاں مخدوم رقیب یا پنجشیر کے لوگ ہوتے تو انہوں نے ایسے میں قیدیوں کو مار مار کر ادھ موا کر دینا تھا۔

ہم قیدی مخدوم رقیب کے پاس امانتاً رکھوائی ہوئی اپنی رقم کو بھولے نہیں تھے بلکہ یہاں جیل میں جب بھی کوئی شمالی اتحاد کا ذمہ دار، ریڈ کراس کے لوگ یا کوئی صحافی آتے ہم اس کے آگے مخدوم رقیب سے اپنی رقم دلوانے کا مطالبہ رکھ دیتے اور خوب شور کرتے لیکن ہمارے واویلا کرنے اور شور مچانے سے شمالی اتحاد کے لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا حالانکہ بھوک کے ان دنوں میں ہمیں اپنی رقم کی اشد ضرورت تھی لیکن کہیں بھی ہماری شنوائی نہیں ہوتی تھی۔

بھوک سے تنگ آ کر ایک دن رحیم یار خان سے تعلق رکھنے والا ساتھی بھائی طیب جنگل میں کام کے دوران فرار ہو گیا اور گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح ''چاہ آب'' شہر میں جا پہنچا جہاں پر وہ دوبارہ شمالی اتحاد کے فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا، طیب کو گرفتار کرنے والے فوجیوں نے جب طیب سے پوچھا کہ تم جیل سے کیوں بھاگے ہو تو طیب نے انہیں بتایا کہ ''مجھے صرف بھوک نے جیل سے بھاگنے پر مجبور کیا ہے کیونکہ جیل کا عملہ ہمیں مناسب کھانا نہیں دیتا۔'' طیب کو گرفتار کرنے والے فوجیوں نے خوب پیٹ بھر کر اسے کھانا کھلایا اور واپس انجیز جیل میں پہنچا دیا، انجیز جیل میں کمانڈر بشیر کے عملہ نے طیب کے جیل میں پہنچتے ہی اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے اور اسے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ اس بیہمانہ ظلم وستم کی وجہ سے کئی دن تک بھائی طیب چلنے پھرنے سے معذور رہا اور سر پھٹ جانے کی وجہ سے اس کے سر پر کئی ٹانکے مجھے لگانے پڑے۔

امانت کی واپسی

مارچ ۲۰۰۱ء میں ایک دن شمالی اتحاد کے چند افراد پر مشتمل ایک وفد جیل میں آیا جنہوں نے آتے ہی ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ ''ہم مخدوم رقیب کے پاس رکھوائی ہوئی آپ لوگوں کی رقم

مخدوم رقیب سے لے کر آپ حضرات کو دینے آئے ہیں، یہ خوشخبری سن کر تمام قیدیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس آنے والے وفد میں ایک مکمل طور پر باشرع شخص بھی تھا جو کسی طور بھی شمالی اتحاد کا فرد نہیں لگتا تھا اس باشرع آدمی نے ساتھیوں میں مخدوم رقیب سے لی ہوئی رقم برابر برابر تقسیم کی اور ہم چند قیدیوں کو اس شخص نے قرآن کریم کے جیبی نسخے، تسبیحیاں اور عطر وغیرہ اپنی طرف سے بھی ہدیتاً دیا۔ یہ متذکرہ شخص جب تنہائی میں میرے ساتھ خیمے میں بیٹھا تو اس نے مجھے بتایا کہ ''میرا تعلق شمالی اتحاد سے نہیں ہے بلکہ میں طالبان کی طرف سے خفیہ طور پر یہاں آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں کیونکہ طالبان ساتھیوں کو ان لوگوں پر بالکل اعتبار نہیں تھا کہ یہ آپ لوگوں کی امانت پہنچا دیں گے۔'' شمالی اتحاد کے افراد کے روپ میں آئے ہوئے اس ساتھی نے مخدوم رقیب سے رقم حاصل کرنے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ''میرے ساتھ آئے ہوئے افراد آپ لوگوں کو جو یہ کہانی سناتے ہیں کہ آمر صاحب احمد شاہ مسعود نے مخدوم رقیب کے پاس رکھوائی رقم کی مقدار میں اپنے پاس سے قیدیوں کے لیے رقم بھیجی ہے یہ سب جھوٹ ہے اور ان لوگوں کی اپنی طرف سے گھڑی ہوئی کہانی ہے بلکہ مخدوم رقیب سے رقم حاصل کرنے کا اصل قصہ اس طرح ہے کہ ''ایک دن مخدوم رقیب اپنے اہل خانہ کے ساتھ طالقان شہر کے اڈے پر کابل کی طرف جانے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ آپ کی اس انجیز جیل سے تبادلے میں آزاد ہو کر جانے والے طالبان کے ایک چھوٹے قوماندان حاجی عبداللہ نے مخدوم رقیب کو گاڑیوں کے اڈے پر کھڑے دیکھ کر پہچان لیا، چنانچہ حاجی عبداللہ دو مسلح طالبان کو اس کی نگرانی پر چھوڑ کر پہلے قریب ہی موجود پاکستانیوں کے اوطاق (عمارت) میں گیا جہاں پر اس نے پاکستانی ساتھیوں جن میں بھائی کشمیری جو لشرہ دہ جیل سے فرار ہوا تھا بھی شامل تھا، کو مخدوم رقیب کے بارے میں تفصیل سے بتایا بعد ازیں کشمیری سمیت دو تین مزید پاکستانیوں کو لے کر حاجی عبداللہ طالقان شہر کے طالبان ذمہ دار کے پاس جا پہنچا اور اسے مخدوم رقیب کے بارے میں تفصیلات بتا کر اسے گرفتار کرنے کی اجازت چاہی تا کہ قیدیوں کی امانت اس سے واپس لی جا سکے، اجازت ملنے پر حاجی عبداللہ پاکستانی ساتھیوں اور طالبان امنیت (پولیس) کے چند مسلح افراد کے ساتھ اڈے پر جا پہنچا جہاں پر انہوں نے مخدوم رقیب اور اس

کے دو بیٹوں کو گرفتار کر لیا جبکہ مخدوم کی بیوی کو طالقان میں موجود ان کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا، تفتیش کے دوران مخدوم رقیب نے بتایا کہ وہ طالبان قیدیوں کی رقم لے کر ایران جا رہا تھا، دریں اثناء حاجی عبداللہ نے مخدوم رقیب کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ ''تم نے ہم قیدیوں پر جو ظلم و ستم کیے تھے ہم ان کا بدلہ تم سے نہیں لیتے لیکن جب تک قیدیوں کے روپے جو تم نے ضبط کر رکھے ہیں قیدیوں تک نہیں پہنچتے ہم تم لوگوں کو نہیں چھوڑیں گے، اس دھمکی کے بعد مخدوم رقیب نے رقم والا تھیلا حاجی عبداللہ کو دیتے ہوئے کہا کہ ''میرا رابطہ ہمارے (شمالی اتحاد) کے ذمہ دار افراد سے کروادو تا کہ میں قیدیوں تک ان کی امانت پہنچانے کا بندوبست کر سکوں، اس طرح اس نے اپنے ذمہ دار افراد سے رابطہ کر کے اور اپنی گرفتاری کا بتا کر یہ رقم آپ لوگوں تک پہنچانے کا انتظام کر دیا اور آج آپ لوگوں کی امانت حاجی عبداللہ کی محنت اور کوشش سے آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔'' اس متذکرہ شخص نے مجھے مزید بتاتے ہوئے کہا کہ ''جب میں آپ لوگوں کے ذمہ دار افراد کے دستخطوں والا خط طالبان کے پاس لے کر جاؤں گا تو اسی وقت مخدوم رقیب کو رہا کر دیا جائے گا کیونکہ اس سے یہی وعدہ کیا گیا ہے۔

مخبر

کچھ عرصہ سے جیل میں ایک ایسا کام ہونا شروع ہو گیا تھا جس کے بارے میں ہمارا کوئی ساتھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا یعنی جیل کی خبریں جیل انتظامیہ تک پہنچنا شروع ہو گئیں تھیں، اسی وجہ سے ہمارا ریڈیو بھی جو تین سال سے محفوظ تھا پکڑا گیا، ہمارے سب ساتھی حیران اور متفکر تھے کہ ہمارے درمیان ایسا کونسا آستین کا سانپ پیدا ہو گیا ہے جو اندر کی باتیں باہر پہنچاتا ہے، اکثر ساتھی نئے آنے والے قیدی قاری عطاء الرحمٰن پر شک کرتے تھے کیونکہ اس کے جیل انتظامیہ خصوصاً ازبک کمانڈر کے ساتھ ہم قوم ہونے (قاری عطاء الرحمٰن ازبک قوم سے تعلق رکھتا تھا) کی وجہ سے بڑے اچھے تعلقات تھے اور وہ ازبک کمانڈر کے ساتھ جیل سے باہر بھی گھومنے پھرنے چلا جاتا تھا اسی شک کی بنا پر اکثر ساتھی قاری عطاء الرحمٰن کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس سے کھچے کھچے رہتے تھے، کسی طرح قاری عطا الرحمٰن کو پتا چل گیا کہ پاکستانی قیدی اس

پر مخبر ہونے کا شک کر رہے ہیں، چنانچہ ایک دن قاری عطا الرحمٰن نے میرے خیمے (کلینک) میں آ کر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! آپ پاکستانی لوگ میرے سے کھچے کھچے کیوں رہتے ہیں......؟...... کیا آپ لوگ مجھے مخبر سمجھتے ہیں............؟'' قاری عطا الرحمٰن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''ڈاکٹر صاحب میں سب کچھ ہو سکتا ہوں لیکن اپنے ہی ساتھیوں کی جاسوسی کرنے والا مخبر نہیں ہو سکتا۔ میں حیران ہوں کہ آپ سب پاکستانیوں کی نظروں اور عقلوں پر پردے کیوں پڑے ہوئے کہ وہ اصل مخبر نہیں پہچان پا رہے اور خواہ مخواہ مجھ پر ہی شک کر رہے ہیں۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے قاری عطاء الرحمٰن سے پوچھا ''قاری صاحب کیا آپ اصل مخبر کو جانتے ہیں............ کون ہے وہ............'' قاری عطاء الرحمٰن نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''ہاں............ میں جانتا ہوں............ لیکن اس مخبر کا نام نہیں بتاؤں گا............ بلکہ آج رات میں آپ کے خیمے میں رہوں گا اور آدھی رات کے قریب اس مخبر کا آپ کو مشاہدہ کروا دوں گا۔''

رات گیارہ بجے کے قریب قاری عطاء الرحمٰن چپکے سے میرے خیمے میں آ گیا اور آہستہ آواز سے میرے ساتھ گپ شپ لگانے لگا۔ رات ۱۲ بجے کے قریب جس وقت تمام قیدی گہری نیند سو چکے تھے ایک چادر پوش آدمی جیل کی عمارت سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے بیت الخلاؤں کی طرف جانے لگا۔ قاری عطاء الرحمٰن نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''ڈاکٹر صاحب اس چادر پوش آدمی پر نظر رکھو کہ یہ کہاں جا رہا اور کیا کر رہا ہے کیونکہ یہی آپ کا مطلوبہ آدمی ہے۔'' رات کے اندھیرے میں یہ چادر پوش آدمی بالکل پہچانا نہیں جا رہا تھا لیکن اتنا تھا کہ ایک سائے کی طرح بیت الخلاؤں کی طرف جاتا ہوا نظر ضرور آ رہا تھا۔ یہ چادر پوش بیت الخلاء کی دیوار کے ساتھ جا کر رک گیا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا، آس پاس کسی ذی روح کو نہ پا کر یہ شخص بالکل قریب موجود جیل کے بیرونی صدر دروازے میں جا پہنچا، باہر شائد کوئی پہرے دار اسی چادر پوش کے انتظار میں تھا کیونکہ یہ شخص جونہی دروازے کے قریب پہنچا دروازہ کھل گیا اور یہ آدمی فوراً دروازے سے باہر چلا گیا اور دس منٹ بعد جس طرح چپکے سے باہر نکلا تھا اسی طرح اندر آ گیا اور ایک بیت الخلاء میں جا گھسا۔ قاری عطاء الرحمٰن نے مجھ سے

مخاطب ہو کر کہا ''ڈاکٹر صاحب اس چادر پوش کے بیت الخلاء سے نکلنے سے پہلے آپ عمارت کی داخلی راہداری میں جا کر اندھیرے میں کھڑے ہو جائیں تا کہ آپ اپنے ''محسن'' کو دیکھ سکیں۔ میں جلدی سے اپنی بیساکھی سنبھالے تاریک راہداری میں جا کھڑا ہوا مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، تھوڑی دیر بعد ہی مجھے چادر پوش گیلری کی طرف آتا دکھائی دیا، یہ شخص جلدی سے جب میرے قریب سے گذرنے لگا تو میں نے اسے پہچانتے ہوئے روک لیا اور دھیمے لہجے میں اس سے مخاطب ہو کر کہا ''ملا عادل! کہاں سے آرہے ہو......؟'' ہاں یہ وہی ملا عادل تھا جو چند ہفتے پہلے گرفتار ہو کر زخمی حالت میں جیل میں پہنچا تھا اور ہم پاکستانیوں نے اس کی بے پناہ خدمت کی تھی، ملا عادل نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا مجھ سے سوال کرتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب! آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں......؟ میں نے ذرا سخت مگر دھیمے لہجے میں ملا عادل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اس بات کو چھوڑو کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں، جو تم سے میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ کہ کہاں سے آرہے ہو......؟'' اس پر ملا عادل نے جواب دیتے ہوئے کہا ''میرے پیٹ میں کچھ گڑبڑ تھی اس لیے بیت الخلاء میں گیا تھا......'' میں نے پھر ملا عادل سے سوال کرتے ہوئے کہا ''ملا صاحب! آپ کا بیت الخلاء جیل سے باہر کب کا بنا ہے......؟'' میری بات سن کر مولوی عادل گڑبڑا گیا اور ہکلاتے ہوئے کہنے لگا: ''کک...... کک...... کیا مطلب'' میں نے ملا عادل کو سرزنش کرتے ہوئے کہا ''ملا صاحب! جو بات میں نے کہی ہے اس کا مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو...... اور آج مجھے بھی اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ تم ہی وہ آستین کے سانپ اور احسان فراموش ہو جو آئے روز جیل انتظامیہ کو مخبری کر کے ہمارے ساتھیوں کو تشدد کا نشانہ بنواتے ہو اور تم ہی وہ بے حس اور بے غیرت انسان ہو جس نے ہمارا باہر کی دنیا کی معلومات کا واحد ذریعہ ریڈیو پکڑوایا......... ملا عادل یاد کرو......... ذہن پر زور دو......... زیادہ پرانی بات نہیں ہے صرف چند ہفتے پہلے کی بات ہے......... یاد کرو......... جب تم زخمی حالت میں جیل میں آئے تھے تو چلنے سے بھی معذور تھے، ہم پاکستانیوں نے تمہیں سہارا دیا......... جیل میں بھوک کا راج تھا، تمہارے زخمی ہونے کی وجہ سے ہم نے خود بھوکا رہ کر تمہارا پیٹ بھرنے کی کوشش کی تا کہ تم جلد از جلد صحت یاب ہو

سکو.........ہم پاکستانیوں نے تمہارے لیے دوائی خریدنے کے لیے اپنی بچی کھچی جمع پونجی تک خرچ کردی.........لیکن تم نے ہمارے سہارے چلنا سیکھ کر اور روبصحت ہوتے ہی ہمیں ہی ڈسنا شروع کر دیا......؟'' میری ان تمام باتوں کا ملا عادل کوئی معقول جواب نہ دے سکا بلکہ وہ اپنی چوری پکڑے جانے سے اتنا حواس باختہ ہو چکا تھا کہ اس کے منہ سے ٹھیک طرح سے کوئی بات بھی نہیں نکل رہی تھی اور ہکلاتے ہوئے فقط آئیں بائیں شائیں ہی کیے جا رہا تھا، میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا ''ملا صاحب......! جاؤ اپنے کمرے میں......لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات بہت غور سے سن لو اور اسے پلے باندھ لو کہ آئندہ رات تو کیا دن کو بھی تم اگر باہر یا پہرہ داروں کے برجوں کے نیچے کھڑے نظر آ گئے تو جہاں تم نے ہمارا ایثار، ہمدردی اور شفقت دیکھی ہے وہیں پر تمہیں ہمارے قہر کا بھی سامنا کرنا پڑ جائے گا اور ہم ہر قسم کے نتائج سے بے پرواہ ہو کر تمہیں نشان عبرت بنا دیں گے۔'' اپنی بات ختم کر کے میں ملا عادل کو وہیں کھڑا چھوڑ کر واپس اپنے خیمے میں آ گیا، جہاں قاری عطاء الرحمٰن میرا انتظار کر رہا تھا میرے خیمے میں داخل ہوتے ہی قاری عطاء الرحمٰن نے ہنستے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''کیوں ڈاکٹر صاحب کیسی رہی ملاقات۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے قاری عطاء الرحمٰن سے کہا ''قاری صاحب! واللہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس شخص پر ہم پاکستانیوں نے اتنے احسانات کیے وہی ہماری جڑیں کاٹے گا'' میں نے قاری عطاء الرحمٰن سے معذرت کرتے ہوئے کہا ''قاری صاحب میں اپنے تمام ان ساتھیوں کی طرف سے جو آپ پر شک کرتے رہے ہیں معذرت چاہتا ہوں امید ہے آپ ہمیں معاف کر دیں گے'' میری اس بات پر قاری عطا الرحمٰن نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں......میں آپ لوگوں سے بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔

صبح ہوتے ہی میں نے چند ذمہ دار ساتھیوں کو رات کی کارروائی سے آگاہ کر دیا اور انہیں بتایا کہ ملا عادل سے ہوشیار رہیں، ملا عادل بھی اس واقعہ کے بعد نہ کبھی باہر گیا اور نہ کبھی پہرے داروں کے برجوں کے نیچے دیکھا گیا اور اس طرح ساتھیوں پر روز روز کا تشدد بھی بند ہو گیا، کیونکہ اندر کی باتیں ملا عادل کے ذریعہ باہر جانا بند ہو گئی تھیں۔

ایک دن ساتھیوں نے میری اوپر اوڑھنے والی چادر دھو کر خشک ہونے کے لیے بیرونی دیوار کے قریب دھوپ میں پھیلا کر چھوڑ دی، عصر کے وقت جب ساتھی چادر اٹھانے کے لیے گئے تو انہیں چادر وہاں نہ ملی۔ ہم نے تمام جیل میں چادر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ساتھیوں سے پوچھا لیکن چادر نہ ملی، بھائی عبیداللہ نے احتیاطاً برجوں پر موجود پہرے داروں سے بھی چادر کے بارے میں پوچھا، انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا چنانچہ ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اگلے دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوپہر کے وقت اتفاقاً ایک بکری کا بچہ کہیں سے جیل میں آ گھسا اور قیدی بکری کے بچے کے ساتھ کھیلنے لگے، ایک ساتھی بکری کا بچہ اٹھا کر مذاقاً جیل کے صحن میں قیدیوں کو حدیث کا سبق دیتے ہوئے مولوی عبدالصمد کے پاس لے گیا مولوی عبدالصمد صاحب بھی درس چھوڑ کر بکری کے بچے سے کھیلنے لگے، دریں اثناء شمال مغربی برج کے ایک پہرہ دار نے چلاتے ہوئے ہمارے باشی (ذمہ دار) بھائی بنیامین کو آواز دیتے ہوئے کہا "بنیامین...... بنیامین یہ تمہارے کسی قیدی کی چادر ہوا سے اوپر برج میں آ گئی ہے آ کر لے جاؤ......"

دراصل چادر ہوا سے اوپر نہیں گئی تھی بلکہ پہرہ دار نے قصداً چوری کی نیت سے اٹھائی تھی کیونکہ آج صبح تک یہ پہرے دار چادر سے بے خبر اور انکاری تھا، اب بکری کا بچہ دیکھ کر پیٹ پھولنے کا خوف جب پہرے دار پر طاری ہوا تو اس نے ہوا کا بہانہ بنا کر چادر واپس لوٹا دی اس طرح یہ بکری کا بچہ میرے لیے رحمت ثابت ہوا۔ درہ الواسا میں بھائی رحمت اللہ کے بوٹ چوری ہونے پر بکری کے بچے پر عمل کرنے کا جو شوشہ ساتھیوں نے چھوڑا تھا یہ بھی اسی کا اثر تھا جو میری چادر واپس مل گئی۔

مارچ کے آخر میں ایک دن ایک ہیلی کاپٹر جیل کے باہر آ کر اترا جس میں چند پنجشیری آفیسر آئے تھے، ان آفیسر نے جیل میں داخل ہوتے ہی بھائی شکیب حسین بھلی (سیالکوٹی) اور عبید یمنی کو اپنے پاس بلاتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ آپ دونوں آزاد ہو رہے ہو، ہم آپ دونوں کو پنجشیر لے جانے کے لیے آئے ہیں جہاں پر آپ کے رشتہ دار آپ کے منتظر ہیں چنانچہ آپ دونوں جلدی سے جانے کی تیاری کر لیں۔

آدھے گھنٹے بعد یہ دونوں ساتھی اور چند افغانی قیدی، پرنم آنکھوں اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ ہمیں الوداع کہتے ہوئے ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر پنجشیر کی طرف روانہ ہو گئے۔

انجیز میں سردیوں کا برفانی موسم جتنا شدید تھا اس سے کئی گنا زیادہ شدت کے ساتھ موسم گرما ہمارے سروں پر آن پہنچا، ویسے تو قید میں شروع دن ہی سے ہمیں بھوک اور بیماریوں سے واسطہ پڑتا آ رہا تھا لیکن انجیز جیل میں گرمی کا موسم اپنے جلو میں ایسی خطرناک بیماریاں لے کر آیا جس نے تمام قیدیوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ایسے میں ہر قیدی کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے منڈلاتی نظر آنے لگی۔

موت کے سائے

سن ۲۰۰۱ء کا موسم گرما شروع ہوتے ہی مجھ سمیت تمام دوسو کے دوسو قیدی ملیریا قسم کے ایک عجیب وغریب بخار میں مبتلا ہو گئے، یہ بخار جب شدت اختیار کرتا تو قیدی اس بخار کے زیر اثر ''ہذیان'' بکنا شروع کر دیتے، ایسے میں عجیب اور دل ہلا دینے والا منظر ہو جاتا، اس بخار کی وجہ سے کہیں کوئی قیدی نعرے لگاتا نظر آتا اور کہیں زور زور سے قہقہے لگاتا، کہیں کوئی کمانڈر ٹائپ قیدی اس بیماری کی حالت میں اپنے آپ کو میدان جنگ میں سمجھتے ہوئے زور زور سے جنگی احکامات و ہدایات دیتا نظر آتا اور کوئی قیدی دشمن کو للکارتا، غرضیکہ اس دوران ہماری جیل کسی پاگل خانے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ بیماری آہستہ آہستہ حملہ آور نہیں ہوتی تھی بلکہ یکدم اور اچانک حملہ کرتی تھی اور جس قیدی پر یہ حملہ ہوتا وہ دیکھتے ہی دیکھتے انتہائی دردناک اور عجیب وغریب اذیت میں مبتلا ہو جاتا۔ آج جو ساتھی اذیت میں مبتلا مریض کی خدمت کر رہے ہوتے اگلے دن وہ خود بھی اس مرض کا شکار ہو جاتے۔

اس نامعلوم بیماری نے یہیں پر بس نہیں کی بلکہ مزید پیش قدمی کرتے ہوئے قیدیوں کی جان بھی لینا شروع کر دی، چنانچہ ایک دن صبح دس بجے کے قریب اس بیماری نے سب سے پہلے بنوں صوبہ پختونخواہ کے رہنے والے بھائی ماسٹر طاہر پر شدید حملہ کیا جس کی تاب نہ لاتے ہوئے بھائی طاہر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس موذی بیماری کی وجہ سے ساتھیوں کی شہادت کا سلسلہ چلا تو موسم سرما شروع ہونے تک چلتا ہی چلا گیا۔ بھائی طاہر ؒ

شہادت کے ایک ہفتہ بعد لودھراں صوبہ پنجاب کے بھائی زاہد کو اس بیماری نے نشانہ بنایا اور وہ شہید ہو گئے، اس کے بعد دو دو تین تین ہفتوں کے وقفے سے ۵، ۶ افغانی ساتھیوں کی اس بیماری نے جان لے لی اور وہ شہید ہو گئے، اس کے بعد اس بیماری کا اگلا شکار ہارون آباد ضلع بہاولنگر کے بھائی جاوید (شیر باز) بنے اور شہید ہو گئے بھائی جاوید (شیر باز) کی شہادت کے ٹھیک ۵ دن بعد رحیم یار خان کے بھائی فیاض کو اس بیماری نے چاٹ لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔

پے در پے ساتھیوں کی شہادت اور خطرناک اور نہ سمجھ میں آنے والی بیماری کی وجہ سے تمام قیدی اپنے اپنے وصیت نامے لکھ کر ناگہانی موت کا سراپا انتظار رہتے تھے، ایسے میں ہر قیدی ایک دوسرے سے معافی تلافی اور توبہ استغفار میں مشغول تھا، علاوہ ازیں اس آزمائش اور بیماری سے پناہ مانگتے ہوئے اللہ رب العزت کے حضور اس بیماری کو دور کرنے کے لیے پوری جیل میں اجتماعی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

یہ بیماری جس نے بہت سارے قیدیوں کی جان لے لی اور تمام قیدیوں کو موت کے دہانے پر لا پہنچایا اگرچہ سمجھ میں نہ آنے والی بیماری تھی لیکن میری ناقص عقل نے اس بیماری کی جوڈائیگنوز (تشخیص) کی اس کے مطابق، سب سے پہلے قیدیوں کو ملیریا ہوتا تھا، غذائی قلت اور کمزوری کی وجہ سے چونکہ قیدیوں کے جسموں میں بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت بالکل نہیں ہوتی تھی اور اگر کچھ قوت مدافعت ہوتی بھی تھی تو وہ بالکل کمزور ہوتی تھی چنانچہ قیدیوں کے جسموں میں بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے ملیریا چند ہی دنوں میں خطرناک ٹائیفائیڈ کی شکل اختیار کر لیتا اور یہ ٹائیفائیڈ ادویات کی عدم دستیابی اور علاج نہ ہونے کی وجہ سے ڈائرکٹ ہیپاٹائٹس سی (c) کی خطرناک اور آخری سٹیج پر جا پہنچتا جس سے مریض چند ہی دنوں میں دار فانی سے کوچ کر جاتا۔ یہ میری ناقص عقل کا تجزیہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا ہے اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

انجیز جیل کے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے جس وجہ سے گرمیوں کے موسم میں یہاں گرمی کی حدت کھلے علاقوں کی نسبت بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی، پائپوں کے ذریعے جیل میں چشموں سے آنے والا پانی اس موسم میں ایسے ہوتا تھا جیسے پیچھے کسی بہت بڑے گیزر سے نکل کر

آ رہا ہو، دوپہر کے وقت گرم ہونے کی وجہ سے اس پانی سے وضو وغیرہ کرنا بھی مشکل ہوتا تھا اور سب سے عجیب بات جو گرمیوں کے موسم میں انجیز جیل میں ہمارے مشاہدے میں آئی وہ یہ تھی کہ اتنی شدید اور جان لیوا گرمی کے باوجود وہاں پر ہم قیدیوں کو پسینہ نہیں آتا تھا حالانکہ پاکستان اور دوسرے علاقوں میں تھوڑی سی گرمی پڑنے پر بھی لوگ پسینے سے شرابور ہو جاتے۔ اس معمے کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکی۔

خدا خدا کر کے موسم گرما کی حدت میں کچھ کمی آئی تو قیدیوں کو سکھ کا سانس نصیب ہوا کیونکہ گرمی کی حدت کم ہوتے ہی قیدیوں کو اس انجانی بیماری سے چھٹکارا ملنا شروع ہو گیا اس بیماری کا زور گرمی کی حدت کم ہونے پر ٹوٹا یا ساتھیوں کا اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے عجز و انکساری کے ساتھ گڑگڑانا اس بیماری کو دفع کرنے کا باعث بنا بہرحال یہ بیماری جس طرح آناً فاناً اور اچانک آئی تھی اسی طرح قیدیوں کو لاغر کر کے اچانک غائب ہو گئی، اس بیماری کا اس طرح اچانک ختم ہو جانا یقیناً قیدیوں کے گڑگڑانے اور دعاؤں ہی کا نتیجہ تھا کیونکہ عام حالات میں کوئی بھی بیماری بغیر علاج معالجے کے کلی طور پر اس طرح ختم نہیں ہوا کرتی۔

۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کی صبح دس گیارہ بجے امریکہ کے کسی صحافتی ادارے کے عرب نژاد دو نوجوان صحافی جیل میں آئے اور دوپہر تک ہم قیدیوں کے انٹرویو کرتے رہے اس دوران ترجمانی کے فرائض ہمارے پاکستانی نژاد برطانوی ساتھی انور خان ادا کر رہے تھے، دوپہر کے وقت جب قیدی کھانا کھانے لگے تو ہم نے ان صحافیوں کو کھانے کی دعوت دی چنانچہ دونوں صحافی بلا تردد ہمارے ساتھ بیٹھ گئے اور ہماری طرح سوکھی روٹی پانی کے ساتھ کھانے لگے، کھانے کے بعد ان دونوں صحافیوں نے وضو کر کے ہمارے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی نماز کے بعد یہ لوگ دوبارہ مختلف قیدیوں سے گفتگو کرنے لگے، ان صحافیوں کے گفتگو کے انداز سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ لوگ صرف ٹائم پاس کر رہے ہوں اور قیدیوں سے انٹرویو کی انہیں کوئی ضرورت نہ ہو حالانکہ صحافی لوگ تو بال کی کھال اتارنے تک جاتے ہیں لیکن یہ لوگ صرف ادھر ادھر کی باتیں اور قیدیوں کو مختلف قسم کی نصیحتیں ہی کر رہے تھے۔

عصر کا وقت داخل ہوتے ہی ان دونوں صحافیوں نے عصر کی نماز باجماعت ادا کی، نماز

پڑھنے کے بعد جب یہ لوگ واپس جانے لگے تو کچھ ساتھیوں نے ترجمان انور خان کی وساطت سے انہیں گذارش کرتے ہوئے کہا ''جب آپ کابل جائیں تو ریڈ کراس والوں کو ہمارا یہ پیغام دے دینا کہ سردیاں شروع ہو رہی ہیں اور ہمارے پاس سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے لہٰذا ہمارے لیے کمبل وغیرہ جیل میں پہنچا دو۔'' ان قیدیوں کی باتیں سن کر صحافیوں میں سے ایک نے قیدیوں کو سرزنش کرتے ہوئے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھ کر سنائی ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ﴾ جب اللہ رب العزت یہ فرمار ہے ہیں کہ یہود ونصاریٰ سے کسی خیر کی توقع نہ رکھو تو پھر یہودیوں کی تنظیم ریڈ کراس کے آگے ہاتھ پھیلانا کیسا اس کے بعد انہوں نے قیدیوں سے پوچھا: ''کیا آپ لوگوں کے پاس قرآن پاک ہیں'' جب قیدیوں نے ہاں میں جواب دیا تو انہوں نے کہا ''آپ لوگ فقط قرآن اور حدیث سے راہنمائی لیں اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے آگے مدد کے لیے ہاتھ پھیلائیں کیونکہ وہی بہتر مدد کرنے والا اور کارساز ہے۔'' یہ نصیحت کرنے کے بعد یہ دونوں صحافی قیدیوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

دونوں صحافی تو چلے گئے لیکن اپنے پیچھے خوشگوار اور دلچسپ بحث چھوڑ گئے، ان صحافیوں کے جاتے ہی قیدیوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی، ہر قیدی دوسرے قیدی کو راز داری سے یہی کہتا ہوا نظر آتا تھا ''یہ صحافی نہیں ہو سکتے.......... صحافی ایسے نہیں ہوتے..........'' کوئی اپنے طور پر فلسفہ جھاڑتے ہوئے سرگوشیوں میں یہ کہتا پھر رہا تھا ''ان صحافیوں کی ڈاڑھیاں بھی تازہ تازہ شیو کی ہوئی لگتی ہیں (یعنی یہاں آنے سے پہلے سنت کے مطابق ان کی ڈاڑھیاں تھیں) غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں مجموعی طور پر تمام قیدی ان صحافیوں سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور اکثر قیدیوں کے دلوں سے ان صحافیوں کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ جہاں قیدیوں کی اکثریت ان عرب صحافیوں کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی وہیں پر چند ایسے سادہ قیدی بھی تھے جو ان عرب صحافیوں کو امریکن CIA کا ایجنٹ بتاتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ یہ لوگ قیدیوں کی جاسوسی اور ان کے خیالات جاننے کے لیے آئے تھے لیکن جلد ہی صرف چند دنوں

کے اندر پتا چل گیا کہ ان صحافیوں کے بارے میں قیدیوں کی اکثریت کا گمان ہی حقیقت پر مبنی تھا۔ کہ یہ عرب صحافی کسی عظیم مقصد کے لیے آئے ہیں......

ان عرب صحافیوں کے جانے کے تین دن بعد ۱۰ ستمبر کے دن اچانک باہر سے آئے ہوئے شمالی اتحاد کے بیس پچیس مسلح فوجی جیل سرپرست معاون عبدالاحد کی قیادت میں آندھی اور طوفان کی طرح جیل میں آ گھسے اور آتے ہی انہوں نے قیدیوں کو زدوکوب کرتے ہوئے کمروں سے باہر نکال کر میدان کے ایک طرف جمع کرنا شروع کر دیا، تمام قیدیوں کو باہر نکالنے کے بعد مسعودی فوجیوں نے قیدیوں کا سامان کمروں سے اٹھا اٹھا کر باہر میدان کی دوسری طرف لا کر پھینکنا شروع کر دیا، کمروں کے اندر نیچے بچھی ہوئی چٹائیاں تک ان مسلح افراد نے لا باہر پھینکیں، تمام کمروں کی ادھیڑنے کی حد تک تلاشی لے کر اور قیدیوں کی مکمل جامہ تلاشی کرنے کے بعد یہ لوگ جس طرح آئے تھے اسی طرح تیزی کے ساتھ واپس چلے گئے، جاتے جاتے یہ لوگ ہمارے برطانوی قیدی ساتھی انور خان کو بھی گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے گئے۔ ہم تمام قیدی حیران و پریشان تھے کہ اچانک ان لوگوں پر کیا افتاد آن پڑی کہ انہوں نے ہماری پوری جیل کو ادھیڑ کر رکھ دیا اور انور خان کو بھی ساتھ لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد قیدیوں میں طرح طرح کی باتیں گردش کرنے لگیں، اس رات ایک قیدی ساتھی نے کسی طرح پہرہ داروں کی احمد شاہ مسعود کے بارے میں گفتگو سن لی اور اس نے ساتھیوں کو آ کر بتایا کہ "میں نے بیت الخلاء کے قریب والے برج کے پہرہ داروں کی کچھ گفتگو سنی ہے وہ دھماکہ میں کسی کے قتل ہونے کی باتیں کرتے ہوئے بار بار احمد شاہ مسعود کا نام لے رہے تھے اور مجھے ایسے لگتا ہے کہ احمد شاہ مسعود قتل ہو گیا ہے۔ احمد شاہ مسعود کے مشکوک قتل کی افواہ آناً فاناً اور راز داری کے ساتھ تمام پاکستانی قیدیوں میں پھیل گئی۔ رات دیر تک ہم قیدی اس خبر پر آپس میں تبصرے کرتے رہے اور اس خبر کی تصدیق یا تکذیب کا کوئی ذریعہ ڈھونڈنے کے بارے میں سوچتے رہے۔

عرب صحافی......اور احمد شاہ مسعود کا قتل

اگلے دن صبح دس گیارہ بجے کے قریب اس خبر کی تصدیق حاصل کرنے کا کارنامہ ہمارے

ایک قیدی ساتھی سابقہ اسیر شبرغان اور صوبہ بلوچستان کے رہنے والے مولانا عبدالصمد نے انجام دیا، وہ اس طرح کہ مولوی عبدالصمد صاحب تلاوت کرتے ہوئے جیل کی عقبی سائیڈ کے جنوب مغربی برج کے نیچے جا کھڑے ہوئے اور برج میں موجود ایک بوڑھے پہرے دار سے سلام دعا کرنے کے بعد گپ شپ لگاتے ہوئے متذکرہ بالا خبر کی تصدیق کے طریقہ کے بارے میں سوچنے لگے کہ پہرہ دار سے کس طرح پوچھا جائے۔ گپ شپ کے دوران بوڑھا، پہرہ دار مولوی صاحب کو آزاد ہونے کی دعائیں دینے لگا۔ مولوی عبدالصمد صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے انتہائی ذہانت کے ساتھ ہوا میں تیر پھینکتے ہوئے دھیمی آواز میں پہرہ دار سے مخاطب ہو کر کہا: ''بابا.........! جب تک احمد شاہ مسعود زندہ ہے ہم آزاد نہیں ہو سکتے۔'' مولوی صاحب کا تیر عین نشانے پہ لگا کیونکہ مولوی صاحب کی بات سن کر بوڑھے پہرہ دار نے اردگرد دیکھ کر دیوار سے نیچے جھکتے ہوئے راز داری کے ساتھ مولوی صاحب کو بتایا کہ ''ہاغا مڑشو'' یعنی وہ (احمد شاہ مسعود) مر گیا ہے'' مولوی عبدالصمد صاحب نے مزید یقین پختہ کرنے کے لیے بوڑھے پہرہ دار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''بابا......! کیوں مذاق کر کے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہو۔ اس پر پہرے دار نے قسمیں اٹھا کر بتایا کہ یہ بالکل حقیقت ہے کہ احمد شاہ مسعود مر گیا ہے، اس میں مذاق اور دلگی والی کوئی بات نہیں ہے۔

تمام قیدی جہاں احمد شاہ مسعود کے مرنے کی تصدیق ہونے پر خوش تھے وہیں ایسے موقع پر ہمارے قیدی ساتھی انور خان کو جیل سے باہر کہیں لے جانے پر تشویش میں بھی مبتلا تھے اور سوچ رہے تھے کہ احمد شاہ مسعود کے قتل ہونے پر یہ لوگ انور خان کو کیوں جیل سے باہر کہیں اور لے گئے ہیں، یہ بات تمام قیدیوں کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی تھی جس کی سمجھ کسی بھی قیدی کو نہیں آ رہی تھی۔

یہ معمہ اس وقت حل ہوا جب شمالی تحاد کے سپاہی چند دنوں کے بعد انور خان کو صحیح سالم حالت میں واپس ہمارے پاس جیل میں پہنچا گئے۔ انور خان کے جیل میں پہنچنے کے بعد جب ساتھیوں نے اس سے پوچھا کہ ''تمہارے ساتھ کیا بیتی'' پہلے تو انور خان نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کر دیا اور قیدی ساتھیوں کو بتایا کہ ''مجھے شمالی اتحاد والوں نے زبان بند رکھنے اور

قیدیوں کو حالات نہ بتانے کا حکم دیا ہے اس لیے میں آپ لوگوں کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔" لیکن انور خان کو یہ باتیں زیادہ دیر تک ہضم نہ رہ سکیں اور بھائی رحمت اللہ کے استفسار کرنے پر اس نے جیل کے ایک کمرے میں بیٹھ کر بھائی رحمت اللہ مجھے اور چند دیگر ساتھیوں کو رازداری اور اس تنبیہ کے ساتھ کہ کسی اور کو نہیں بتانا...... اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات سناتے ہوئے کہنے لگا کہ "مسعودی فوجیوں نے مجھے یہاں سے دو گھنٹوں کی مسافت پر لے جا کر دس پندرہ فٹ گہرے اور خشک کنویں میں ڈال دیا، اگلے دن یہ لوگ مجھے کنویں سے نکال کر چاہ آب ہی کے کسی علاقے کی ایک بڑی سی حویلی میں لے گئے جہاں پر ایرانی، فرانسیسی، اور روسی ماہرین تحقیق کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ شمالی اتحاد کے بہت سے آفیسر اور فوجی موجود تھے۔ ان لوگوں نے مجھے حویلی کے گراسی پلاٹ میں ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ مجھے کرسی پر بٹھانے کے بعد چند غیر ملکی میرا انٹرویو کرنے لگے جبکہ ایک کیمرہ مین میرے بالکل قریب ہو کر فلم بندی کرنے لگا، کچھ ہی دیر بعد جب کیمرہ مین فلم بندی کرتے ہوئے اپنا کیمرہ میرے چہرے کے بالکل قریب لایا تو میرے ارد گرد کھڑے افراد میں سے ایک شخص اچانک زور سے چلایا...... بم...... اس کے منہ سے لفظ "بم" کا نکلنا تھا کہ میرے ارد گرد کھڑے ہوئے افراد تیزی سے بھاگتے ہوئے کچھ دور جا کر زمین پر لیٹ گئے جبکہ میرے سامنے کی طرف مجھ سے کچھ فاصلہ پر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے غیر ملکی افراد سکون سے اپنی جگہ پر بیٹھے ٹکٹکی باندھے نہایت انہماک سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے اور میں ہونقوں کی طرح بیٹھا آنکھیں جھپکاتا سوچ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں اور یہ جو ڈرامہ انہوں نے میرے ساتھ کیا اس سے ان لوگوں کا کیا مقصد ہے۔

اس ڈرامے کے کچھ دیر بعد شمالی فوجیوں نے مجھے چاہ آب شہر لے جا کر ایک عمارت میں بند کر دیا، چاہ آب شہر سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ شہر میں جا بجا احمد شاہ مسعود کی تصویریں آویزاں تھیں اور اکثر عمارتوں پر سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے، ان حالات اور راستے میں آتے ہوئے لوگوں کی کھسر پھسر سن کر مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ احمد شاہ مسعود قتل ہو گیا ہے لیکن کیسے قتل ہوا اور کن لوگوں نے اسے قتل کیا تا حال مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا، مغرب کی

نماز پڑھ کر میں اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا ہوا تھا کہ شمالی اتحاد کا ایک فوجی رات کا کھانا لے کر میرے کمرے میں آ گیا، میں نے باتوں باتوں میں کھانا لانے والے شخص سے محتاط انداز میں احمد شاہ مسعود کے بارے میں پوچھا، میرے سوال پر پہلے تو اس شخص نے ناک بھنویں چڑھائیں لیکن بعد میں میرے پاس بیٹھتے ہوئے متذکرہ شخص نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''انور خان! یہ باتیں مجھے آپ کو بتانی تو نہیں چاہئیں لیکن ایک شرط پر میں آپ کو تفصیلات بتاؤں گا کہ آپ کسی اور کے سامنے ان باتوں کا اور میرا تذکرہ بالکل نہیں کریں گے، میرے راز کو راز ہی رکھنے کے وعدہ پر اس شخص نے مجھے احمد شاہ مسعود کے قتل کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ ''آمر صاحب (احمد شاہ مسعود) ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ولسوالی (ضلع) خواجہ بہاؤ الدین کی ایک چھاؤنی میں خودکش حملے کے نتیجے میں ہلاک ہو گئے ہیں، جس دن یہ سانحہ ہوا اس دن میں بھی ولسوالی خواجہ بہاؤ الدین کی چھاؤنی میں ڈیوٹی پر موجود تھا میں نے دیکھا کہ دو صحافی چھاؤنی میں داخل ہوئے اور چھاؤنی کے ذمہ دار کمانڈر سے ملے جسے انہوں نے بتایا کہ ہم نے آمر صاحب (احمد شاہ مسعود) سے ان کا انٹرویو لینے کے لیے آج کا وقت لیا ہوا ہے اس لیے آپ آمر صاحب کو ہماری آمد کے بارے میں اطلاع کر دو چنانچہ چھاؤنی کمانڈر نے جا کر آمر صاحب کو صحافیوں کی آمد کے بارے میں بتایا تو آمر صاحب نے صرف ایک صحافی کو اندر اپنے پاس آنے کی اجازت دے دی، اس صحافی کی اندر آمر صاحب کے پاس جانے سے پہلے تین جگہ پر انتہائی باریک بینی سے جامہ تلاشی لی گئی جبکہ دوسرا صحافی باہر ہی کھڑا رہا، آمر صاحب کے پاس اندر جانے والے صحافی کے اندر جانے کے تقریباً آدھا گھنٹہ بعد ایک زوردار دھماکہ ہوا اور عین دھماکے کے وقت باہر والا صحافی قریب ہی کھڑے دو میلے (ڈبل بیرل اینٹی ائیر کرافٹ) پر جا سوار ہوا اور اس نے جنگی حالات کی وجہ سے تیاری پوزیشن میں کھڑے دو میلے کا فائر کھول دیا اور ارد گرد تباہی مچانا شروع کر دی اس دو میلے والے صحافی نے دو میلے کے فائر کر کے ہماری درجنوں گاڑیاں تباہ کر دیں اور ہمارے بیسیوں آدمیوں کو جان سے مار ڈالا، جب یہ آدمی ہمارے لوگوں کے للکارنے اور دفاعی فائرنگ کے باوجود قابو میں نہ آیا تو دو میلے کی عقبی طرف سے ہمارے ایک آدمی نے دو میلے والے صحافی پر راکٹ فائر کر کے اس کا

قصہ تمام کر دیا (شہید کر دیا) جبکہ اندر آمر صاحب اندر والے صحافی کے خودکش حملے کے نتیجے میں شدید زخمی ہو چکے تھے، آمر صاحب کے علاوہ اسی خودکش حملہ میں آمر صاحب کا ایک سیکرٹری بھی زخمی ہو گیا تھا چنانچہ ان زخمیوں کو فوری طور پر ہیلی کاپٹر میں ڈال کر تاجکستان کے شہر فرخار کے ملٹری ہسپتال میں پہنچا دیا گیا جہاں پر ڈاکٹروں نے بتایا کہ آمر صاحب (احمد شاہ مسعود) کو مرے تو تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا ہے یعنی وہ خودکش حملہ میں حملہ آور کے ساتھ ہی جان کی بازی ہار چکے تھے، آمر صاحب کے سیکرٹری کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔''

اس متذکرہ شخص نے احمد شاہ مسعود کے زخمی ہونے والے سیکرٹری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ آمر صاحب کے سکریڑی نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا کہ ''جب یہ خودکش صحافی آمر صاحب سے انٹرویو لے رہا تھا تو میں آمر صاحب سے کچھ فاصلہ پر موجود تھا اس صحافی نے آمر صاحب کا مکمل انٹرویو ریکارڈ کرنے کے بعد آمر صاحب سے درخواست کی کہ میں آپ کا قریب سے ایک پوز (فوٹو) لینا چاہتا ہوں، اجازت ملنے پر یہ صحافی اپنا کیمرہ بالکل آمر صاحب کے چہرے کے قریب لے گیا، کیمرے سے ٹوں ٹوں کی آواز برآمد ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکہ ہو گیا جس سے خودکش حملہ آور اور آمر صاحب موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔''

یہاں تک پہنچ کر انور خان نے ہمیں بتاتے ہوئے کہا ''اس آدمی کی زبانی احمد شاہ مسعود کے قتل کی کہانی سن کر مجھے اپنے ساتھ کیے جانے والے ڈرامے کی وجہ سمجھ میں آ گئی، تحقیق کرنے والے دراصل یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ احمد شاہ مسعود کے اس قتل کے منصوبے میں قیدی بھی شامل ہیں یا نہیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ صحافی احمد شاہ مسعود کو قتل کرنے سے تین دن پہلے انجیز میں قیدیوں کے پاس گئے تھے چنانچہ میرے ساتھ کیے جانے والے ڈرامے کے بعد میرے تاثرات کا مشاہدہ کر کے محققین نے یقیناً قیدیوں کے اس معاملہ سے لاتعلق ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ میں بخیر و عافیت آپ لوگوں کے پاس واپس آ گیا ہوں اور ہم تمام قیدیوں پر شمالی اتحاد کی طرف سے کوئی آفت بھی نہیں ٹوٹی۔'' قصہ ختم کرنے کے بعد انور خان نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا........ ''یہ باتیں کسی اور سے مت کرنا'' انور خان کی

بات سن کر وہاں پر موجود سب ساتھی ہنس پڑے......! اس طرح جیل کی خطرناک تلاشی اور انور خان کو لے جانے کا معمہ حل ہو گیا۔

۲۰۰۱ء کے ماہ اکتوبر کے تقریباً آخر میں ایسی جگر پاش اور دل فگار خبریں پہرہ داروں کی زبانی جیل میں گردش کرنے لگیں جنہوں نے ہماری روح تک کو گھائل کر دیا، یہ خبریں کہ امریکہ نے ۴۲ ملکوں کو ساتھ ملا کر نوخیز امارت اسلامیہ افغانستان پر حملہ کر دیا ہے اور وہ خطرناک بمبار طیاروں کے ذریعہ طالبان کے زیر کنٹرول علاقوں پر مسلسل کارپٹ بمباری کر رہے ہیں، سن سن کر ہم قیدی غم ویاس کی تصویر بنے ہوئے تھے، پہلے پہل تو ہم پہرہ داروں کی زبانی یہ خبریں سن کر یقین ہی نہیں کر رہے تھے لیکن جب بھائی رحمت اللہ نے ایک ازبک پہرہ دار کو شیشے میں اتار کر ہر رات ایک گھنٹہ کے لیے اس سے ریڈیو لے کر سننا شروع کیا تو ریڈیو کا ہر چینل چیخ چیخ کر امارت اسلامیہ افغانستان پر امریکی حملے کی تصدیق کر رہا تھا اور پھر جب نومبر کے آخر میں چند پاکستانی ساتھیوں کو ولسوالی ''امام صاحب'' کے کسی محاذ سے گرفتار کر کے ہمارے پاس جیل میں پہنچایا گیا تو ان کی زبانی امریکی واتحادی فوجوں کی وحشیانہ یلغار کی کہانی سن کر ہمیں یقین آیا کہ واقعتاً امریکہ نے بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امارت اسلامیہ کو تہس نہس کر دیا ہے اس سے پہلے ہم اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے سب خبروں کو جھٹلاتے ہوئے اسے دشمن کا پروپیگنڈہ قرار دے رہے تھے۔

ایک دن میں اور کمانڈر علقمہ بدخشی خیمے کے قریب بیٹھے امریکی حملے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جب امریکہ کی کارپٹ اور وحشیانہ بمباری کا ذکر آیا تو کمانڈر علقمہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا اور رونے لگا، میں نے جب اسے تسلی دیتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کی تو کمانڈر علقمہ نے سسکتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''ڈاکٹر صاحب! مجھے امیر المومنین ملا عمر مجاہد اور محاذوں پر موجود اپنے دیگر ساتھیوں کا غم کھائے جا رہا ہے کہ وہ لوگ نہ جانے کس حال میں ہوں گے، میں نے پرنم آنکھوں سے کمانڈر علقمہ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا ''مولوی صاحب! اللہ تبارک وتعالیٰ ضرور ان کی حفاظت فرمائیں گے...... یہ ہمارے اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش ہے اور فتح آخر کار حق والوں ہی کو نصیب ہوگی اور

اللہ کا دین پوری دنیا پر غالب آ کر رہے گا، ان شاء اللہ، ان آزمائش کی گھڑیوں میں ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ رب العزت سے اپنے اور تمام مجاہدین کے لیے صبر اور استقامت کی دعائیں مانگنی چاہئیں۔ یہاں میری یا صرف مولوی علقمہ کی یہ حالت نہیں تھی بلکہ تمام طالبان قیدی اسی کیفیت اور اسی حالت کا شکار تھے۔

طالبان کی حکومت ختم ہونے کے بعد دو تین مہینوں کے اندر اندر تمام افغان طالبان قیدی آزاد ہو کر چلے گئے اب انجیر جیل میں فقط ہم پاکستانی قیدی رہ گئے تھے۔

امریکیوں کے چنگل میں

مارچ ۲۰۰۲ء کے مہینے میں پانچ چھ امریکی چنیوک ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جیل کے اردگرد مختلف سمتوں میں مناسب جگہوں پر اتر گئے، ہیلی کاپٹروں سے بہت سے امریکی فوجی نکلے اور انہوں نے جیل کے چاروں طرف پھیل کر پہاڑی ٹیکریوں پر پوزیشن سنبھال لیں ان فوجیوں کی پوزیشنیں سنبھالنے کے بعد چاروں ہیلی کاپٹر دوبارہ فضا میں بلند ہوگئے اور جیل کے اوپر چکر کاٹنے لگے، ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور یہ امریکی جیل کے اردگرد مورچہ زن ہو کر کیوں بیٹھ گئے ہیں اور اوپر جیل کی فضا میں چکر لگاتے خوفناک ہیلی کاپٹر کیا کرنا چاہتے ہیں کچھ ہی دیر بعد اس ''کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' کا جواب ہمیں اس وقت مل گیا جب ایک ایک قیدی کو باری باری امریکیوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے جیل سے باہر والی عمارت میں لے جایا جانے لگا۔

بھوک اور مسلسل بیماریوں کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچا بنے ہوئے قیدیوں سے بھی امریکی ''بہادر'' اس قدر خوفزدہ تھے کہ ایک قیدی جب جیل کے صدر دروازے سے باہر نکلتا تو اس قیدی کو پانچ امریکی کمانڈوز پکڑ کر تحقیق والے کمرے میں لے جاتے۔ دو فوجی قیدی کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر بازوؤں سے پکڑتے، ایک سپاہی پیچھے سے قیدی کے لباس کے کالر کو پکڑتا جبکہ دو فوجی قیدی کے آگے پیچھے گنیں تان کر چلتے اور تقریباً اٹھاتے ہوئے قیدی کو تحقیق کرنے والوں کے سامنے لے جا پھینکتے۔

دو دن تک امریکی CIA اور FBI کے ماہرین تحقیق ہم قیدیوں کے DNA فنگر پرنٹس

اور بالوں کے نمونے لے کر اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کرتے رہے اور جب تمام قیدیوں کی تفتیش مکمل ہوگئی اور ان کے DNA اور فنگر پرنٹس وغیرہ لیے جا چکے تو دوسرے دن مغرب کے قریب خونخوار امریکی درندے ہیلی کاپٹروں پر سوار ہو کر کسی اور شکار کی تلاش میں واپس چلے گئے۔ اب ہم قیدی گویا کہ شمالی اتحاد کے ہاتھوں سے نکل کر عالمی صیہونی و نصرانی اتحاد کی تحویل میں منتقل ہو چکے تھے۔

امریکی بھیڑیوں کے جانے کے بعد اگلے دن جیل سرپرست معاون عبدالاحد نے مجھے باہر بلا کر امریکیوں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب! امریکہ نے طالبان اور عرب قیدیوں کے لیے کیوبا کے جزیرے گوانتانا موبے میں ایک بدنام زمانہ جیل بنائی ہے، یہ امریکی یہاں پر صرف آپ لوگوں کی تفتیش کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ یہ لوگ آپ قیدیوں کو گوانتانا مو، کی جیل لے جانے کے لیے آئے تھے یہ تو آمر بشیر (گورنر چاہ آب) صاحب کا آپ لوگوں پر احسان ہے کہ وہ جنرل فہیم اور حامد کرزئی کے سامنے آپ لوگوں کے معاملہ میں ڈٹ گئے، آمر صاحب نے امریکیوں کے اس الزام کی کہ یہ قیدی بھی القاعدہ کے افراد ہیں کی تردید کرتے ہوئے جنرل فہیم، حامد کرزئی نے امریکیوں کو بتایا کہ جب یہ قیدی ۱۹۹۶ء میں گرفتار ہوئے تھے تو اس وقت القاعدہ نامی کوئی جماعت دنیا میں موجود نہیں تھی لہٰذا ان قیدیوں کا القاعدہ کے ساتھ تعلق جوڑنا سراسر ناانصافی اور زیادتی ہوگی، اس طرح آمر بشیر ان لوگوں کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ آپ قیدیوں کا القاعدہ سے کوئی تعلق نہیں چنانچہ آپ لوگ آمر بشیر صاحب کی مخلصانہ کاوشوں کے نتیجے میں گوانتانا موبے کے جہنم میں جانے سے بچ گئے۔

مئی کے مہینے کے شروع میں ایک دن چاہ آب کے گورنر آمر بشیر ہیلی کاپٹر کے ذریعہ جیل میں آئے اور ہمارے کمرے میں آ کر بلا تکلف ہمارے ساتھ چٹائی پر بیٹھ گئے جبکہ ہیلی کاپٹر کا پنجشیری پائلٹ منہ پر رومال لپیٹے ہمارے کمرے کے دروازے میں کھڑا ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد اس پائلٹ نے آمر بشیر کو مخاطب کر کے ہم قیدیوں کو گندی گالی دیتے ہوئے کہا ''آمر صاحب آپ ان .... کے پاس کیوں بیٹھے ہیں .... آئیں باہر چلیں۔'' آمر

بشیر نے پائلٹ کو سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا "پنجشیری کتے...... جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ...... یہ قیدی میرے پرانے محاذوں کے ساتھی ہیں اور تم لوگوں سے زیادہ قابل احترام ہیں۔" آمر بشیر کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر یہ پائلٹ کان لپیٹتا ہوا باہر چلا گیا، بعد ازیں آمر بشیر نے موجودہ جنگوں کی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ "آپ پنجابیوں (پاکستانیوں) کی بہادری کا تو میں اس وقت سے قائل ہوں جب آپ کے ساتھی ہمارے ساتھ مل کر تاجکستان پر حملے کیا کرتے تھے لیکن موجودہ جنگوں میں پاکستانیوں کی دلیری اور بہادری نے ہمیں ناکوں چنے چبوا دیئے اور حیران کر کے رکھ دیا" آمر بشیر نے مزید بتاتے ہوئے کہا کہ "کلا کٹا" کے مقام پر تیس پینتیس پاکستانی طالبان کے مورچے تھے "کلا کٹا" کے علاوہ اردگرد کے تمام علاقوں پر امریکی فضائیہ کی مدد سے ہمارے لوگ قبضہ کر چکے تھے اور وہاں کے طالبان یہ علاقے خالی کر کے قندوز کی طرف چلے گئے تھے جس کی وجہ سے "کلا کٹا" کے ان پاکستانیوں کے لیے رسد و کمک کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ ہمارے بار بار اعلان کرنے کے باوجود بھی ان لوگوں نے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ جب بھی ہماری طرف سے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا جاتا تو ان محصور پاکستانیوں کی طرف سے یہی جواب ہمیں سننے کو ملتا کہ "امریکی کتو............! جب تک ہم زندہ ہیں امریکہ اور اس کے غلاموں کے آگے نہیں جھکیں گے......... تمہیں صرف ہماری لاشیں ملیں گی ان لوگوں نے اپنے دعوے کو سچ کر دکھایا اور بے سروسامانی کے عالم جب تک ان کا ایک بھی آدمی زندہ رہا، ہمارا کوئی بھی سپاہی ہر سہولت ہونے کے باوجود ان کے نزدیک نہیں جا سکا جب پاکستانیوں کے مورچوں میں خاموشی چھا گئی اور ان کی طرف سے فائر آنے بند ہو گئے، تو فائرنگ بند ہونے کے کئی گھنٹے بعد بھی ہمارے آدمی اس طرف جاتے ہوئے ڈر رہے تھے جب آخر کار ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں میں بیٹھ کر ہمارے فوجی پاکستانیوں کے مورچوں والی جگہ پر پہنچے تو وہاں پر امریکی طیاروں کی وحشیانہ بمباری سے تمام پاکستانی شہید ہوئے پڑے تھے۔" آمر بشیر نے ہمیں مزید بتاتے ہوئے کہا "خدا کی قسم! اگر یہ لوگ (پاکستانی طالبان) میری بات مان لیتے اور جنگ بند کر کے میرے پاس آ جاتے تو میں انہیں کبھی بھی قیدی نہ بناتا بلکہ جیسے بھی ہوتا میں انہیں عزت کے ساتھ پاکستان پہنچا دیتا۔" ہمارے متجسس ہو

کر پوچھنے پر آمر بشیر نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ''میں طالبان اوران کی اسلامی حکومت کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، میرے نزدیک طالبان ہی مظلوم امت کے نجات دہندہ ہیں۔ مجھے کرسی واقتدار اور میرے کچھ جرائم نے طالبان کی طرف جانے سے روکے رکھا۔ میں شمالی اتحاد میں فقط اپنے اقتدار کو طول دینے اور بچانے کے لیے شامل ہوا تھا۔''

آمر بشیر نے واپس جاتے ہوئے ہم سے وعدہ کیا اور یقین دلایا کہ میں کابل جا کر آپ لوگوں کی رہائی کے لیے بھرپور کوشش کروں گا۔

آمر بشیر دراصل سابقہ مجاہد تھا اور جب ہمارے پاکستانی ساتھی تاجکستان میں روس کے خلاف برسرِ پیکار تھے تو اس وقت یہ یہی چاہ آب مجاہدین کا بیس کیمپ ہوا کرتا تھا اور چاہ آب میں یہی آمر بشیر مجاہدین کا سرپرست ہوا کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ یہ شخص ہمارے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آیا اور پاکستانی مجاہدین کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا، آمر بشیر ہمارے کمرے کے دروازے سے نکلتے نکلتے یک دم رک گیا اور ہم قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''برادران! میں نے آپ لوگوں کے لیے جو کچھ کیا اور جو کچھ کرنے جا رہا ہوں، یاد رکھو یہ میں آپ لوگوں پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اپنی طرف سے آپ لوگوں کے ساتھ برتی جانے والی غفلت اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں.......... اللہ نگہبان..........''

۴ جون ۲۰۰۲ء کی ایک صبح پہرہ داروں نے ہم قیدیوں کو آکر بتایا کہ ''آمر بشیر صاحب نے آپ سب قیدیوں کو چاہ آب طلب کیا ہے لہٰذا آپ لوگ جلدی سے تیاری کر لیں چنانچہ ہم تمام قیدیوں نے ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنا سامان وغیرہ باندھ کر یہاں سے کوچ کرنے کی مکمل تیاری کر لی، جب تمام قیدی تیار ہو چکے تو قیدیوں کا سامان وغیرہ گدھوں پر لاد دیا گیا اور قیدی پہرہ داروں کے نرغے میں ایک قطار کی صورت میں دریائے آمو کی طرف چلنے لگے۔ مجھے اور چند دیگر بیمار ساتھیوں کو حسب سابق گدھوں پر سوار کرا دیا گیا تھا، انجیر بستی کے قریب سے گذرتے ہوئے جب میں گدھے پر بیٹھا اپنے نیچے رکھی چادر کو ٹھیک کرنے کے لیے گدھے کو روک کر ایک پاؤں ایک پتھر پر رکھ تھوڑا سا اوپر ہوا تو گدھا میرے نیچے سے نکل کر آگے چل پڑا

اور میں دھڑم سے زمین پر آ گرا، شکر یہ ہوا کہ گرنے سے مجھے چوٹ وغیرہ نہیں لگی، ساتھیوں نے جلدی جلدی مجھے اٹھا کر دوبارہ گدھے پر بٹھا دیا۔

اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مجھ سمیت تمام قیدیوں کے ذہن میں یہی بات تھی کہ جس طرح پندرہ بیس گھنٹے کا پیدل سفر کر کے ہم انجیز میں پہنچے تھے اسی طرح اب پھر دشوار گذار، سنگلاخ اور خطرناک راہوں پر پندرہ بیس گھنٹے پیدل سفر کرنا پڑے گا لیکن اب کی بار ہم قیدیوں کو جس راستے پر لے جایا جا رہا تھا وہ پہلے والا راستہ نہیں تھا بلکہ ہم قیدی دریا آمو کے بالکل کنارے کنارے مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے اور پھر ہمارا یہ پیدل سفر پندرہ بیس گھنٹوں کی بجائے صرف ۲ گھنٹوں میں ہی ختم ہو گیا کیونکہ ۲ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم جس بستی میں پہنچے تھے وہاں فوجی ٹرک ہمارے منتظر تھے چنانچہ ہم تمام قیدیوں کو ٹرکوں میں سوار کرا دیا گیا اور یہ ٹرک ہمیں لے کر چاہ آب شہر کی طرف روانہ ہو گئے، عصر کے قریب ہم قیدی دوبارہ چاہ آب شہر کی اسی عمارت میں جا اترے جہاں لوڈہ جیل سے آنے کے بعد ہمیں ایک رات ٹھہرایا گیا تھا۔

☆☆☆☆

دسواں حصہ:

چاہ آب جیل سے آزادی کا سفر

چاہ آب جیل میں پہنچنے کے چار، یا پانچ دن بعد ایک آدمی ایک موٹی تازی گائے لے کر جیل میں آیا اور اس نے گائے قیدیوں کے حوالہ کرتے ہوئے کہا "یہ گائے آمر بشیر نے آپ قیدیوں کے لیے بھیجی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ گائے ساری کی ساری آپ قیدیوں کے لیے ہے اس میں جیل انتظامیہ کا کوئی حصہ نہیں ہے لہٰذا آپ قیدی اس گائے کو ذبح کر کے اپنی مرضی سے پکا کر کھائیں۔"

ہم قیدی ایک عرصہ سے گوشت کی شکل دیکھنے کو بھی ترسے ہوئے تھے اب جو آمر بشیر کی بھیجی ہوئے گائے کا گوشت قیدیوں کو ملا تو سب نے خوب جی بھر کے کھایا اور آمر بشیر کو دعائیں دیں۔

آمر بشیر کی اس ضیافت کے دو تین دن بعد ریڈ کراس والے جیل میں آن پہنچے، ریڈ کراس کی ٹیم میں موجود ڈاکٹروں نے جب قیدیوں کا طبی معائنہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ قیدیوں کا وزن انتہائی کم ہو چکا ہے اور وہ انتہائی لاغر اور کمزور ہیں، چنانچہ ریڈ کراس والوں نے ہم قیدیوں کے لیے انرجی بسکٹ لا دیئے، یہ بسکٹ توانائی اور وٹامنز سے بھرپور تھے صرف ایک دو بسکٹ کھانے سے ہمارا پیٹ بھر جاتا تھا اور ہمیں اپنے جسم میں توانائی محسوس ہونے لگتی تھی۔ علاوہ ازیں ریڈ کراس والے آمر بشیر کی اجازت سے ہمارے ایک قیدی ساتھی کو جو حال ہی میں گرفتار ہو کر جیل میں پہنچا تھا اور اسے ٹی بی کا خطرناک مرض لاحق ہو جانے کی وجہ سے آزاد کرنے کے لیے اپنے ساتھ پاکستان لے گئے اور اسے اس کے گھر پہنچا دیا۔

میں اسے بھی ضرور چوم لیتا

انہی دنوں بھائی بنیامین کے والد صاحب حاجی حسن ازبک (افغانی) کے ساتھ قیدیوں کو ملنے کے لیے چاہ آب میں آئے، جیل انتظامیہ نے انہیں جیل میں داخل نہیں ہونے دیا بلکہ جیل کے سامنے ایک گراسی پلاٹ میں انہیں بٹھا دیا، بنیامین کے والد صاحب اور حاجی حسن کو

دراصل پاکستان سے ہماری جماعت والوں نے ہم قیدیوں کے لیے ادویات اور دیگر سازوسامان دے کر بھیجا تھا لیکن جب یہ لوگ انتہائی مشکلات سے گذرتے ہوئے ہمارے پاس پہنچے تو 80 فیصد سامان شمالی اتحاد کے لٹیرے فوجیوں اور وارلارڈز کے ہاتھوں لٹا چکے تھے۔ بہر حال جب جیل انتظامیہ نے بنیامین کے والد صاحب اور حاجی حسن کو جیل کے سامنے والے گراؤنڈ میں بٹھا دیا تو مجھے اور بنیامین کو جیل کمانڈران کے پاس لے گیا جہاں پر بنیامین کے والد صاحب اور حاجی حسن نے ہمیں گرم جوشی سے ملنے اور سلام دعا کرنے کے بعد بتایا کہ اس سے پہلے بھی جماعت والوں نے آپ قیدیوں کے لیے بہت سا سامان فارسی بانوں کے ہاتھ بھیجا جو آپ لوگوں تک نہ پہنچ سکا کیونکہ شمالی اتحاد کے ''بہادر'' وہ سامان راستے میں لوٹ لیتے تھے، اب بھی ہم لوگ اپنا آدھے سے زیادہ سامان راستوں میں لٹوا کر اور اپنی جانیں بڑی مشکل سے بچا کر آپ لوگوں تک یہ بچا کھچا سامان پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بعد ازیں بنیامین کے والد صاحب کی خواہش پر ہم نے جیل کمانڈر کی منت سماجت کر کے ان کو ایک نظر قیدیوں کو دیکھنے اور دور کھڑے ہو کر سلام دعا کرنے کی اجازت حاصل کر لی چنانچہ بنیامین کے والد صاحب اور حاجی حسن جیل میں داخل ہو گئے، انہوں نے ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر دور ہی سے صحن میں جمع تمام قیدیوں سے سلام دعا کی، کئی قیدی تیزی کے ساتھ دوڑ کر ان لوگوں سے مصافحہ اور معانقہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، ہر قیدی کی یہی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن سے آئے ہوئے اس آدمی یعنی بنیامین کے والد صاحب سے ہاتھ ملائیں اور گلے ملیں لیکن جیل انتظامیہ نے ایسا نہ کرنے دیا اور ان آنے والے مہمانوں کو جلدی سے باہر نکال دیا جس کا تمام قیدی ساتھیوں کو بہت افسوس ہوا۔

ان لوگوں کے جیل سے باہر چلے جانے کے بعد جیل کمانڈر نے مولوی عبدالصمد صاحب کو سرزنش کرتے ہوئے پوچھا کہ ''جب ہم نے آپ لوگوں کو منع کیا تھا کہ مہمانوں کے قریب نہیں جانا صرف دور سے سلام دعا کرنی ہے تو آپ کیوں ان سے جا کر گلے ملے......؟'' کمانڈر کی اس بات پر مولوی عبدالصمد نے فی البدیہہ جواب دیتے ہوئے کہا: ''کمانڈر صاحب......! یہ تو باعزت اور بزرگ صورت ہمارا ہم وطن تھا...... خدا کی قسم........... اگر

پاکستان کا کوئی کتا بھی یہاں آجاتا تو میں اسے بھی ضرور گلے ملتا اور اسے چوم لیتا۔'' مولوی صاحب کی بات سن کر جیل کمانڈر ہنستے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

چاہ آب جیل میں پہنچنے کے تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد ایک دن ۱۶ جولائی ۲۰۰۲ء کو عصر کے وقت باہر سے آئے ہوئے آمر بشیر کے دو کمانڈروں نے تمام قیدیوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے بتایا کہ ''کل صبح آپ تمام قیدیوں کو آمر بشیر نے کابل بھیجنے کا انتظام کیا ہے تاکہ وہاں پر آپ لوگوں کی آزادی کو یقینی بنایا جاسکے، کابل سے ہمیں حکم آیا ہے کہ تمام قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر کابل لایا جائے تاکہ راستے میں قیدیوں کی طرف سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آئے لیکن آمر بشیر اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کو آزادنہ طریقہ سے لے جایا جائے تاکہ اتنے لمبے سفر میں آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ لوگ ہمیں ضمانت دیں اور یقین دہانی کرائیں کہ راستے میں آپ لوگ کوئی گڑبڑ نہیں کریں گے۔'' کمانڈر کی اس بات پر تمام قیدیوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ''راستے میں آپ لوگوں کو ہماری طرف سے کوئی شکایت نہیں ملے گی۔'' علاوہ ازیں بھائی رحمت اللہ، بھائی بنیامین، مولوی عبدالصمد اور چند دیگر ساتھیوں نے تمام قیدیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے آنے والے ان کمانڈروں اور جیل انتظامیہ کو یقین دلایا کہ ''ہم تمام قیدیوں کی ضمانت دیتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے اور کسی قسم کی کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے۔'' بعد ازیں یہ لوگ ہمیں صبح تک مکمل تیاری کر لینے کا کہہ کر واپس چلے گئے اور ہم قیدی ابھی سے کل کے سفر کے لیے تیاری میں مشغول ہو گئے۔

اگلے دن یعنی ۱۷ جولائی کی صبح ۸ بجے تین چار بڑے ہینو ٹرک جیل کے باہر پہنچ گئے اور ۹ بجے (صبح) کو تمام قیدیوں کو ٹرکوں پر آزادانہ سوار کرا دیا گیا، مجھے اور چند دیگر ساتھیوں کو ٹرکوں کے کیبنوں میں بٹھا دیا گیا اور ٹرک ہمیں لے کر قندوز کی طرف روانہ ہو گئے، ہر ٹرک پر صرف تین تین چار چار پہرہ دار سوار تھے جبکہ آمر بشیر کے کمانڈروں کی دو جیپیں ہمارے ٹرکوں کے آگے آگے چل رہی تھیں۔ سفر کے دوران نمازوں کے اوقات میں گاڑیاں چشموں یا ندی نالوں کے قریب رک جاتیں جہاں پر تمام قیدی گاڑیوں سے اتر کر آرام سے وضو وغیرہ کر کے

نمازیں پڑھتے، اس دوران پہرہ دار قیدیوں کو بالکل تنگ نہ کرتے، ہم قیدی راستوں سے خربوزے (گرمے) وغیرہ خرید کر کھاتے بڑے آرام وسکون سے سفر کرتے ہوئے طالقان شہر سے گذر کر رات کو عشاء کے قریب قندوز شہر کی ایک ویران سی عمارت میں جا اترے اور ہمیں فی الحال اسی عمارت میں ٹھہرنے کا حکم ملا چنانچہ تمام قیدی اس ویران عمارت کے صدر دروازے کے قریب ایک بڑے سے ہال میں اپنا سامان وغیرہ اٹھا کر جا داخل ہوئے اور رات کو سونے کے لیے اسی ہال میں قیدیوں نے چٹائیاں اور اپنی چادریں وغیرہ بچھا لیں، گرمی کا موسم ہونے کی وجہ سے یہاں شب بسری کے لیے کوئی مشکل نہیں تھی۔

قندوز کی اس عمارت میں پہنچنے کے فوراً بعد ہم قیدی نماز عشاء پڑھنے کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگے۔ اچانک اس عمارت کا بڑا دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جانے لگا، تھوڑی دیر بعد ہمارے کانوں میں گیٹ پر موجود مقامی پہرہ دار کی آواز پڑی جو باہر دروازہ کھٹکھٹانے والے سے نرم لہجے میں کہہ رہا تھا کہ ''برادر! صبح آ کر قیدیوں سے مل لینا......اس وقت ہمیں دروازہ کھولنے کی بالکل اجازت نہیں ہے، پہرہ دار کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر والا شخص جو کوئی بھی تھا پہرہ دار سے دروازہ کھولنے کے لیے اصرار کر رہا تھا تاکہ وہ قیدیوں سے مل سکے۔

ہم تمام قیدی حیران تھے کہ ہم قیدیوں سے ملاقات کا آرزومند یہ شخص کون ہے اور کیوں ہم سے ملنا چاہتا ہے۔ بہرحال ساری رات اس عمارت کا دروازہ وقفے وقفے سے بجتا رہا اور ہم قیدیوں سے ملنے کی خواہش رکھنے والا آدمی ساری رات دروازے کے باہر کھڑا قیدیوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پہرہ داروں کی منت سماجت کرتا رہا۔

ایک مظلوم ماں کا پیغام

صبح جب ہم لوگ نماز فجر ادا کرنے کے بعد فارغ ہوئے اور جب ہر طرف صبح کا اجالا پھیل گیا تو اس عمارت کا صدر دروازہ کھلتے ہی ایک جوان آدمی بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا اور دیوانہ وار باری باری ہم سب قیدیوں سے گلے ملنے لگا، ہم قیدیوں سے گلے ملتے ہوئے یہ شخص مسلسل روئے چلا جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے منہ سے ڈھنگ کی کوئی بات بھی نہیں نکل رہی تھی جب یہ شخص کچھ سنبھلا اور اکثر قیدیوں سے مل چکا تو میں نے اس شخص کو مخاطب کرتے

ہوئے پوچھا: ''برادر! رات کو آپ اس عمارت کا دروازہ بجا رہے تھے............؟ میرے اس سوال پر اس شخص نے آبدیدہ ہو کر کہا ''ہاں............رات کو میں ہی دروازہ بجا رہا تھا............ اور آپ لوگوں سے ملنے کے لیے میں ساری رات پہرہ داروں کی منتیں کرتا باہر کھڑا صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔'' میں نے حیران ہو کر اس شخص سے پوچھا ''آپ صبح ہونے کا انتظار باہر کھڑے ہو کر کیوں کرتے رہے اور صبح تک اپنے گھر کیوں نہ چلے گئے۔''

میرے اس سوال پر اس شخص نے گریہ کرتے ہوئے لہجے میں کہا ''میرے بھائی! میں گھر کیسے چلا جاتا............ میں اس عمارت کے باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا جبکہ میری بوڑھی ماں قیدیوں کا حال احوال جاننے کے لیے ساری رات بے تابی سے گھر کے دروازے میں کھڑی رہی اور اب بھی وہیں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے............میری ماں نے حکم دیا تھا کہ جب تک تم قیدیوں کو ایک نظر دیکھ نہ لو اور ان کی خیریت معلوم نہ کر لو...... ہرگز گھر واپس نہ آنا............ میں رات کو دو تین بار واپس گھر گیا لیکن میری ماں جو مسلسل گھر کے دروازے ہی میں بیٹھی ہوئی تھی نے مجھے گھر میں داخل نہیں ہونے دیا اور کہا کہ جب تک تم قیدیوں کی خیریت معلوم نہ کر لو میرے پاس نہ آنا چنانچہ میں اپنی بوڑھی ماں کے حکم پہ ساری رات باہر کھڑا صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔'' اس شخص نے اپنی بوڑھی ماں کا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ ''میری ماں آپ تمام طالبان قیدیوں کو سلام کہتی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میرے بچو! ہمت نہ ہارنا............ ثابت قدم رہنا............ اللہ کے شیروں پر آزمائشیں آتی رہتی ہیں............ آپ لوگ امت مسلمہ اور اسلام کے محافظ ہیں............ اللہ آپ لوگوں کو جلدی آزادی عطا فرمائے............ آزاد ہونے کے بعد پھر سے اسلام کا جھنڈا مضبوطی سے تھام لینا............ اور اسے کبھی جھکنے نہ دینا............ قندوز وتخار کی مظلوم مائیں اور بہنیں............ آپ کی منتظر رہیں گی............ تاکہ تم دوبارہ آؤ............ اور اسلامی نظام کی بہاریں بھی اپنے ساتھ لاؤ............ مصائب اور آزمائشوں سے گھبرا نہ جانا............ کہیں عزیمت اور جہاد کی راہوں کو چھوڑ کر .... بزدلی، ذلت ورسوائی............ اور غلامی کی زندگی اختیار نہ کر لینا............ آج پوری دنیا کے مظلوم مسلمان .... تمہاری............ اور .... صرف تمہاری راہ دیکھ رہے

ہیں.......... اور وہ تمہی (مجاہدین) سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں.......... اور وہ تم ہی (مجاہدین) کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں.......... خدارا.......... امت مسلمہ کو مایوس نہ کرنا..........''اس شخص نے اپنی بوڑھی ماں کا درد بھرا پیغام دینے کے بعد قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''میری ماں۔نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ لوگوں کی کوئی ضرورت ہو تو ضرور مجھے بتاؤ، میری استطاعت میں ہوئی تو ضرور پوری کروں گی۔''

اس شخص کی بوڑھی ماں کے عظیم پیغام نے اکثر قیدیوں کو آبدیدہ کر دیا، ہم نے اس شخص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''ماں جی کو ہمارا اسلام کہنا اور کہنا.......... کہ ہم اسلام کی عظمت کے پرچم لہراتے ہوئے ان شاء اللہ پھر آئیں گے.......... اور کہنا کہ.......... جب تک آپ جیسی مائیں زندہ ہیں.......... اسلام کو کوئی شکست نہیں دے سکتا.......... آپ ہمارے لیے دعائیں کرتے رہیں۔'' یہ متذکرہ شخص ہم قیدیوں کو ڈھیروں دعائیں دینے کے بعد پرنم آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

قندوز دراصل وہ علاقہ ہے جہاں کے عوام اسلامی حکومت کے قیام کے لیے طالبان کی حمایت میں اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور قندوز کو امارت اسلامیہ کا حصہ بنا دیا تھا جب دور دور تک طالبان کے زیر کنٹرول کسی بھی علاقہ کی سرحد قندوز کے ساتھ نہیں لگتی تھی بلکہ قندوز چاروں طرف سے دشمن میں گھرا ہوا علاقہ تھا، ایک طرف دوستم کا علاقہ تھا دوسری طرف منصور نادری اسماعیلی جبکہ بقایا اطراف میں احمد شاہ مسعود کی سپاہ تھی چاروں طرف سے دشمن میں گھرا ہونے کے باوجود یہاں کے لوگوں کی طالبان کے ساتھ وفا اور استقامت دیدنی تھی اور پھر جب امریکہ پوری دنیا کو ساتھ ملا کر خارش زدہ باؤلے کتے کی طرح افغانستان پر چڑھ دوڑا اور اس نے طالبان کے علاقوں پر بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آتش و آہن کی بارش برسانا شروع کی تو ایسے میں بھی قندوز کے عوام نے آخر تک طالبان کا ساتھ نہ چھوڑا اور عزم و وفا کی حیرت انگیز داستانیں رقم کرتے ہوئے قندوز کے عوام نے طالبان کے لیے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور اسلامی حکومت اور طالبان کے دفاع کے لیے ان لوگوں نے اپنے گھر بار اور معصوم بچے تک داؤ پر لگا دیئے مگر طالبان سے بے وفائی کا ذرہ بھر بھی ارتکاب نہ کیا اور آج

متذکرہ بالا شخص کی والدہ کے پیغام اور جذبات نے ثابت کر دیا کہ قندوز کے عوام ظلم وستم کی بھٹیوں سے گزرنے کے باوجود اور امریکی طیاروں کی کارپٹ بمباری سے اپنے بچے شہید کروانے کے بعد بھی اسلام اور طالبان کے شیدائی ہیں اور ان کے عزم وحوصلہ میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا۔

یہ قندوز شاید طالقان ہی کا حصہ ہو کیونکہ یہاں کے لوگوں کی اسلام کے لیے بے مثال قربانیاں دیکھ کر نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث مبارک ذہن میں آتی ہے کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''زہے نصیب! طالقان' اس میں اللہ کے خزانے ہیں لیکن یہ خزانے سونے چاندی کی صورت میں نہیں بلکہ وہاں ایسے مردان کا ہوں گے جو اللہ کو پہچانیں گے جیسے پہچاننے کا حق ہوتا ہے اور وہ مہدی آخرالزمان کے مددگا ہوں گے۔'' واللہ اعلم (کنزالعمال ۲۹۱/۱٤)

ایک دن اور دو راتیں قندوز شہر کی اس عمارت میں گذارنے کے بعد ۱۹ جولائی ۲۰۰۲ء صبح ۱۰ بجے ہم تمام قیدیوں کو تین مرسڈیز بسوں میں سوار کرا دیا گیا اور یہ بسیں ہمیں لے کر کا کی طرف روانہ ہو گئیں، حسب سابق آمر بشیر کے کمانڈروں کی دو جیپیں ہمارے آگے آ. چل رہی تھیں۔

آرام دہ بسوں پر کابل کی طرف جاتے ہوئے ہمارا یہ سفر بالکل ایسے تھا جیسے ہم کسی پکنک پر جا رہے ہوں کیونکہ جب بھی ہماری بسیں کسی دریا کے کنارے رکتیں تو قیدی بسوں سے اتر دریا میں جا گھستے اور خوب ہلہ گلا کرتے، ایسے میں کوئی بھی پہرہ دار یا افسر قیدیوں سے کو اعتراض نہ کرتا اور ان کے کھیل کود میں مزاحم نہ ہوتا۔

ہماری بسیں ''بغلان'' سے گزر کر جوں جوں درہ سالنگ کی بلندیوں کی طرف بڑھ رہی تھیں ٹھنڈک میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر جب ہماری بسیں سالنگ ٹنل سے گزر کر آگے ایک کھلی جگہ پر جا کر نماز عصر کے لیے رکیں اور ہم قیدی وضو وغیرہ کرنے کے لیے بسوں سے باہر نکلے تو درہ سالنگ میں چلنے والی تند و تیز ہواؤں کی وجہ سے ہمیں اپنے آپ کو قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا اور بے پناہ سردی کی وجہ سے تمام قیدیوں کے دانت بج رہے تھے اور چشموں کے یخ

ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بھی وہاں پر کار دارد تھا بہر حال جیسے تیسے ہم نے وضو کرنے کے بعد نماز عصر ادا کی اور جلدی جلدی دوبارہ بسوں میں آ کر بیٹھ گئے اور بسیں ہمیں لے کر دوبارہ کابل کے راستے پر محوِ سفر ہو گئیں۔

اگرچہ یہ گرمی کا موسم تھا، چاہ آب اور قندوز میں ہم کافی گرم موسم چھوڑ کر آئے تھے لیکن سالنگ کی بلندیوں پر بدستور برفانی موسم اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ موجود تھا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ درہ سالنگ سمت شمال کا بلند ترین علاقہ ہے اور یہاں اکثر تیز ہوائیں چلتی رہی ہیں اس وجہ سے یہ علاقہ سارا سال سردی کی لپیٹ میں رہتا ہے جبکہ سردیوں میں یہاں اتنی زیادہ برفباری ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے یہ علاقہ کئی مہینوں تک آمد ورفت کے قابل نہیں رہتا۔

بتدریج نشیب کی طرف سفر کرتے ہوئے ہماری گاڑیاں رات تقریباً ۹ بجے ''جبل سراج'' پہنچ گئیں، جہاں جبل سراج کے مین چوک میں ایک ہولناک منظر ہمارا منتظر تھا، جبل سراج چوک پر جب ہماری گاڑی پہنچی تو میں نے گاڑی کی ونڈ سکرین سے گاڑی کی لائٹوں کی روشنی میں دیکھا کہ دو کٹی پھٹی لاشیں چوک کے عین درمیان میں لکڑی کے پولوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں، میں زیادہ دیر تک یہ منظر نہ دیکھ سکا کیونکہ ہماری گاڑی تیزی سے آگے کی طرف بڑھ گئی یہاں سے تھوڑا آگے جا کر ایک چوکی پر ہماری تمام گاڑیوں کو روک لیا گیا گاڑیاں رکتے ہی دو دو شمالی فوجی ہر گاڑی میں داخل ہو گئے اور اپنی گندی زبانوں سے مغلظات بکنے لگے اور بعض قیدیوں کو نیچے اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم تمہیں بھی ذبح کر کے چوک میں لٹکی ہوئی عربوں کی لاشوں کے ساتھ لٹکائیں گے وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ آمر بشیر کے کمانڈروں کی جیپیں زیادہ دور نہیں تھیں جس کی وجہ سے وہ ہماری گاڑیوں کو رکتا دیکھ فوراً واپس آ گئیں، آمر بشیر کے کمانڈروں نے اپنی گاڑیوں سے نکل کر خبیث شمالی فوجیوں سے بڑی مشکل کے ساتھ ہماری جان چھڑائی، وگرنہ ان کے تیور واقعتاً خطرناک تھے اور وہ کچھ بھی کرنے کے لیے مکمل طور پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔

یہاں سے جان چھوٹنے کے بعد جب ہماری گاڑیاں کابل کی طرف روانہ ہوئیں تو کچھ دور جانے کے بعد میں نے اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ جبل سراج چوک

میں لٹکی ہوئی لاشیں کس کی ہیں......؟ (اگرچہ پہرہ داروں کی زبانی ہمیں اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ لٹکی ہوئی لاشیں عرب مجاہدوں کی تھیں) میرے سوال پر ڈرائیور نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ "یہ القاعدہ کے عربوں کی لاشیں تھیں، یہ دونوں عرب چند دن پہلے اچانک کہیں سے نکل کر جبل سراج میں نمودار ہوئے اور امریکیوں کے ایک قافلے پر جھپٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں نے کلاشنکوفوں اور ہینڈ گرنیڈوں کی مدد سے ۱۷ کے قریب امریکی فوجی مردار کر دیئے بعدازیں یہ دونوں دریا کے دائیں کنارے (یہ دریا پنجشیر سے آتا ہے اور کابل روڈ سے گزر کر آگے چلا جاتا ہے) پر مورچہ زن ہو گئے اور کئی گھنٹے تک شمالی اتحاد کے فوجیوں اور امریکی فوجیوں سے مقابلہ کرتے رہے جس جگہ یہ عرب مورچہ زن تھے اس جگہ غالباً انہوں نے پہلے سے ایمونیشن چھپایا ہوا تھا اسی لیے وہ کئی گھنٹے دنیا کی (لعنتی) سپر پاور اور شمالی اتحاد کے (مردار خور) فوجیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، تین چار گھنٹوں کے بعد امریکی ہیلی کاپٹر آن پہنچے، چنانچہ امریکی فوجیوں نے اڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر سے شیلنگ کر کے ان دونوں عربوں کو قتل (شہید کر دیا) یہ دونوں قتل ہونے سے پہلے بہت سے امریکی اور شمالی اتحاد کے فوجیوں کو موت کی گھاٹ اتار چکے تھے۔ بعدازیں شمالی اتحاد کے فوجیوں نے ان عربوں کی لاشوں کی بے حرمتی کی حد کرتے ہوئے ان لاشوں کو جبل سراج چوک میں لٹکا دیا، دو تین دن سے یہ لاشیں یہیں پر لٹک رہی ہیں۔

ڈرائیور کی زبانی ان دو عرب مجاہدوں کی شجاعت و بہادری کی داستان سن کر مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ ان مجاہدوں نے دیارِ غیر میں اپنی جانوں کی قربانی دے کر ثابت کر دیا کہ اللہ کے شیروں کو قوت اور طاقت کے بل بوتے پر دبایا جا سکتا ہے اور نہ ہی جھکایا جا سکتا ہے۔

ہماری گاڑیاں سفر کرتی ہوئیں جب رات ۱۱ بجے کابل شہر کی حدود میں داخل ہوئیں تو وہاں پر ایک مرتبہ پھر ہمارے قافلہ کو روک کر صبح ہونے تک شہر میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا چنانچہ ہم قیدیوں نے شمالی اتحاد کے مسلح سپاہیوں کے حصار میں پوری رات بسوں میں گذاری۔

خاد ایجنسی کی جیل ''صدارت کابل''

جب ۲۰ جولائی ۲۰۰۲ء کو سورج نے طلوع ہو کر پورے عالم بقعۂ نور بنا دیا تو ایسے میں ہمارے قافلہ کو شہر کابل میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی چنانچہ ہماری گاڑیوں نے یہاں سے حرکت کی اور کابل شہر سے گذرتے ہوئے ''صدارت کابل'' نامی ایک بڑی عمارت میں جا داخل ہوئیں یہاں پر آمر بشیر اور اس کے کمانڈروں نے ہمیں باقاعدہ طور پر کرزئی انتظامیہ کے حوالہ کرتے ہوئے کاغذی کارروائی مکمل کی اور یہاں سے رخصت ہو گئے جبکہ کرزئی انتظامیہ کے لوگوں نے ہمیں اس عمارت کی بالائی منزل کے مختلف کمروں میں لے جا کر بند کر دیا۔

جنگل بیابانوں کی جیلوں سے اٹھ کر افغانستان کے دارالحکومت کابل میں خفیہ ایجنسی کی اس عالی شان عمارت میں پہنچ کر ہم قیدیوں کو کچھ امید بندھی تھی کہ جتنے دن ہم یہاں رہیں گے ہمیں اچھا اور مناسب کھانا دستیاب ہوگا لیکن یہ ہماری خوش فہمی تھی کیونکہ یہاں پر بھی کھانا صرف برائے نام ہی ملتا تھا جس کی وجہ سے ہمیں پیٹ بھرنے کے لیے اپنے پیسوں سے روٹیاں خریدنی پڑتی تھیں یہاں پر صرف ایک سہولت دستیاب تھی کہ ہم قیدی ریڈیو اپنے پاس رکھ سکتے تھے چنانچہ یہاں پہنچتے ہی بھائی رحمت اللہ بھائی ابوعبیدہ اور دیگر چند قیدی ساتھیوں نے پہرہ داروں کے ذریعہ ریڈیو خرید لیے۔

''صدارت کابل'' کی اس عمارت میں ہم چوبیس گھنٹے کمروں میں بند رہتے تھے، دو تین دن کے بعد ہم قیدیوں کو صرف آدھا گھنٹہ کے لیے ایک چھوٹے سے میدان میں ٹہلنے کے لیے نکالا جاتا تھا، اسی دوران باہر جاتے ہوئے دوسری گیلریوں کے کمروں سے اکثر ہمیں عورتوں اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں جن کے بارے میں ہمیں چند پہرے داروں کی زبانی معلوم ہوا کہ امریکہ اور شمالی اتحاد کے فوجیوں نے غیر ملکی مجاہدین کے بیوی بچوں کو یہاں پر قید کیا ہوا ہے جن پر آئے روز طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔

پوری دنیا میں انسانی حقوق، انسانی حقوق کا واویلا کرنے اور ڈھنڈورا پیٹنے والے نام نہاد امن کے ٹھیکداروں کے ہاتھوں آج افغانستان کے اندر انسانیت کی ایسی تذلیل ہو رہی ہے کہ شاید معلوم انسانی تاریخ میں ایسے گھناؤنے جرائم اور سفاکیت کا مظاہرہ کسی نے نہ کیا ہو لیکن

اقوام متحدہ اور ہیومن رائٹس کی بڑی بڑی تنظیمیں افغانستان کے اندر امریکی واتحادی افواج کی طرف سے ہونے والی انسانیت کی تذلیل کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی چپ سادھے ہوئے نہ صرف خاموش ہیں بلکہ در پردہ یہ ادارے مکمل طور پر امریکہ کے حمایتی اور مددگار ہیں۔

ملا عمر اور اسامہ کہاں ہیں

کابل پہنچنے کے تقریباً ایک مہینے بعد امریکن CIA اور FBI والوں نے ہماری تفتیش شروع کر دی اور ایک ایک قیدی کو تفتیش کے لیے باری باری اسی عمارت کے ایک کمرے میں اپنے پاس بلانے لگے، مجھے اپنی باری پر جب امریکن تفتیش کاروں کے سامنے لے جایا گیا تو میں نے دیکھا کہ CIA کے اہلکار اپنے سامنے میز پر ڈالروں کے بنڈل سجا کر بیٹھے ہوئے تھے، کمرے میں داخل ہو کر جب میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو CIA کے ایک بیوقوف افسر نے انتہائی احمقانہ سوال کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ ''ملا عمر اور اسامہ بن لادن کہاں ہیں؟ اگر تم ان کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کرو تو میز پر پڑے ہوئے یہ سارے ڈالر تمہارے ہو سکتے ہیں۔'' CIA کے ناہنجار افسر کے اس بے تکے سوال پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی، مجھے ہنستا دیکھ کر امریکی افسر انتہائی درشت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ''ہنستے کیوں ہو......؟ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم چھ سات سال سے قید میں پڑے ہوئے ہیں اور آپ لوگ ہم سے ملا عمر اور اسامہ کے بارے میں پوچھتے ہو کہ وہ کہاں ہیں۔'' میرے اس جواب کے بعد CIA والوں نے مجھ سے دوسرے سوال کرنے شروع کر دیئے۔

آخری سوال جو CIA والوں نے مجھ سمیت تمام قیدیوں سے پوچھے وہ یہ تھے کہ ''ہم لوگ آپ قیدیوں کو آزاد کر رہے ہیں...... آپ لوگ آزاد ہو کر کیا کریں گے.......... کیا آپ لوگ دوبارہ لڑنے کے لیے افغانستان آئیں گے۔'' ان سوالوں کے ہم تمام قیدیوں نے تقریباً ایک جیسے جواب دیئے یعنی ''ہم جا کر اپنا کام کریں گے.......... درس و تدریس کریں گے وغیرہ..........اور کبھی بھولے سے بھی افغانستان کا رخ نہیں کریں گے۔

جہاں ہم رخصت پر عمل کر کے جان چھڑانے والے ۱۱۰ قیدی تھے وہیں پر بلوچستان کا رہنے والا ایک ایسا قیدی بھائی قاری امین اللہ بھی تھا جس نے غیرت ایمانی کے بل بوتے پر

رخصت پر عمل کرنے کی بجائے عزیمت کا راستہ اختیار کیا، قاری امین اللہ نے امریکیوں کے آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''اگر تمہارے فوجیوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی گنوں میں سے کوئی گن میرے ہاتھ آ جائے تو میں عملی طور پر تمہیں ابھی بتا سکتا ہوں کہ میں آزاد ہو کر کیا کروں گا اور میں یہاں سے ہرگز اپنے گھر نہیں جاؤں گا بلکہ آخری دم تک اور خون کے آخری قطرے تک میں تم امریکی کتوں کے خلاف جہاد کروں گا۔

قاری امین اللہ کے اس پرعزم بیان پر BBC نے خوب واویلا کرتے ہوئے اسی رات یہ خبر نشر کی کہ ''سات سال قید و بند کی صعوبتیں گذارنے والے ایک پاکستانی قیدی قاری امین اللہ کا دماغ ابھی تک درست نہیں ہوا اور وہ اب بھی امریکہ کے خلاف جہاد کرنے کی باتیں کرتا ہے۔''

یہود و نصاریٰ کے ان جغادریوں کو کیا خبر کہ ہم ۱۱۱ قیدیوں میں سے ایک قاری امین اللہ ہی ایسا قیدی تھا جس کا دماغ اب تک درست تھا اور اس کے جذبے جواں تھے، اس نے قید کی حالت میں بھی ملعون کافروں کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ظاہر نہیں کیا بلکہ اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قاری امین اللہ نے امریکی بھیڑیوں کو کھری کھری سنا ڈالیں۔

ایک دن آدھی رات کے قریب ہماری عمارت کے ساتھ والی عمارت جہاں بہت سے غیر ملکی مجاہد قید تھے سے کچھ شور شرابا ہمیں سنائی دیا، اس شور کے کچھ ہی دیر بعد شمالی اتحاد کے فوجی ہماری بیرکوں میں آن گھسے اور وہ افراتفری کے عالم میں قیدیوں کی گنتی کرنے لگے، ہم تمام قیدی حیران تھے کہ آدھی رات کے وقت ان لوگوں پر کیا افتاد آن پڑی کہ یہ لوگ قیدیوں کو گننا شروع ہو گئے۔

صبح ہونے پر ہمیں معلوم ہوا کہ ساتھ والی عمارت سے چار غیر ملکی مجاہد پہرہ داروں کا اسلحہ چھین کر فرار ہو گئے ہیں، ان قیدیوں نے یہاں سے فرار ہو کر راستے میں پڑنے والی ایک امریکی چیک پوسٹ پر حملہ کر دیا جہاں پر ان فرار ہونے والے مجاہدین نے ۷ امریکی فوجیوں کو قتل کر ڈالا مقابلہ میں ایک مجاہد بھی شہید ہو گیا جبکہ بقایا تین مجاہد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ رات کو ہماری عمارت کے پہرہ دار جو افراتفری کے عالم میں ہم قیدیوں کی گنتی کرنے

آئے تھے دراصل وہ یہ تسلی کرنا چاہتے تھے کہ ان بیرکوں میں سے بھی کوئی قیدی نہ بھاگ گیا ہو۔

انہیں دنوں ایک بین الاقوامی رفاعی تنظیم ''ایمر جنسی'' کے افراد جیل میں ہمارے پاس آئے اورانہوں نے ہم قیدیوں میں، چینی، پتی، شیمپو اور تولیے وغیرہ تقسیم کیے اور تمام قیدیوں کو تنظیم ''ایمر جنسی'' کے کارڈ بنا کر دیئے۔

۴ ستمبر ۲۰۰۲ء کو ریڈ کراس والے جیل میں ہمارے پاس آئے اور آتے ہی ہم قیدیوں کی لسٹیں ترتیب دینے لگے، اس دوران ریڈ کراس والے ان لسٹوں کے بارے میں کہ یہ کیوں بنائی جارہی ہیں کچھ بھی نہیں بتا رہے تھے لیکن عصر کے قریب جب یہ لوگ واپس جانے لگے تو ان میں سے ہم نے ایک آدمی کو کسی بہانے سے اپنی بیرک کے دروازے کے پاس روک لیا اور اس سے پوچھا کہ ''آپ لوگ یہ لسٹیں وغیرہ کیوں بنا رہے ہیں۔'' پہلے تو اس ریڈ کراس والے غیر ملکی نے ہمیں ٹرخانے کی کوشش کی لیکن جب ہم کسی طرح بھی اسے بغیر پوچھے چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے تو اس نے آخر کار ہتھیار ڈالتے ہوئے نہایت رازداری سے ہمیں بتایا کہ ''کل آپ لوگ آزاد ہو رہے ہیں۔'' اتنا کہہ کر یہ آدمی جلدی سے واپس اپنے ساتھیوں کے پیچھے چلا گیا۔

آزادی کی خبر سن کر ہمارے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، ہم نے آزادی کی یہ خبر آناً فاناً اپنے ساتھیوں کی تمام بیرکوں میں پہنچا دی چنانچہ تمام بیرکوں میں عید کا سا سماں پیدا ہو گیا اور تمام قیدی ابھی سے ہی کل کے لیے تیاری کرنا شروع ہو گئے۔

اگلے دن ۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو ایک بار پھر ریڈ کراس والے ہمارے پاس جیل میں آ پہنچے اور ہم ۵۵ قیدیوں کو سامان سمیت انہوں نے بیرکوں سے باہر نکال کر ایک قطار میں کھڑا کر دیا بعد ازیں ہم ۵۵ قیدیوں کو ایک قطار میں باہر لے جا کر وہاں پر موجود بسوں میں بٹھا دیا گیا جب تمام قیدی باہر کھڑی ۲ بسوں میں سوار ہو چکے تو یہ بسیں ہمیں لے کر کابل ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گئیں اور کچھ ہی دیر بعد یہ بسیں کابل ہوائی اڈے کی عمارت میں جا داخل ہوئیں جہاں پر ہمیں بسوں سے اتار کر پھر ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔

اب ہم رن وے کی طرف جانے والی رسیوں سے بنی راہداری میں ایک قطار کی صورت میں کھڑے ہوئے تھے، ہمارے سامنے کچھ ہی فاصلہ پر سبز ہلالی پرچم کے مونو گرام والا پاکستانی C130 جہاز کھڑا ہوا تھا جس کے اردگرد SSG کے پاکستانی کمانڈوز ہاتھوں میں G3 رائفلیں پکڑے کھڑے ہوئے تھے۔ پاکستانی کمانڈوز باری باری ایک ایک قیدی کو قطار سے نکال کر جہاز کے قریب لے جاتے جہاں پر قیدی کو الٹا زمین پر لٹا کر انتہائی توہین آمیز طریقے سے تلاشی لیتے اور پھر لے جا کر جہاز میں بٹھا دیتے۔ جب میری باری آئی تو مجھے بھی جہاز کے قریب لے جا کر الٹا لٹا دیا گیا اور جب پاکستانی کمانڈو میری تلاشی لینے لگا تو تلاشی کے دوران تلاشی لینے والا کمانڈو انتہائی دھیمے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''محترم آپ لوگ ہمارے قابل فخر بھائی ہیں ہمیں آپ کی اس طرح تلاشی لیتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی ہے لیکن ہم اپنے اعلیٰ افسروں اور سامنے کھڑے امریکیوں کے ہاتھوں مجبور ہیں.......... اس لیے ہمیں معاف کر دینا۔''

جب ہم پہلے گروپ کے تمام قیدی تلاشی کے ذلت آمیز مرحلے سے گزر کر جہاز میں سوار ہو چکے تو پاکستان کے ''بہادر'' کمانڈوز نے ہم لاغر اور ناتواں قیدیوں کو جہاز کے اندر زنجیروں میں جکڑ دیا اور ہمارے سروں پر ہڈ (کالے رنگ کے موٹے تھیلے) چڑھا دیئے۔

جب تمام قیدی جہاز کے اندر اچھی طرح جکڑے جا چکے تو جہاز ہمیں لے کر فضا میں بلند ہو گیا۔ جہاز کے فضا میں بلند ہوتے ہی SSG کے کمانڈوز نے ہم قیدیوں کو ٹھنڈا اور خوش ذائقہ شربت پلایا اور ہمیں بتایا کہ یہ شربت حکومت کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ہم نے خود پیسے جمع کر کے آپ مجاہد بھائیوں کے لیے بنایا ہے، اس دوران ہمارے ایک قیدی ساتھی بابالعل محمد نے پاکستانی کمانڈوز کی باتوں باتوں میں اچھی خاصی درگت بنائی اور انہیں کھری کھری سنائیں، کمانڈوز نے بابالعل کی باتوں کا برا نہیں منایا اور اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی ہم سے گفتگو کرتے رہے۔

☆☆☆☆

گیارھواں حصہ:

سنٹرل جیل پشاور صوبہ پختونخواہ پاکستان

آدھے گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز پشاور کے ہوائی اڈے پر جا اترا جہاں ہمارے سروں سے تھیلے اتار کر ہمیں جہاز سے نیچے اتار کر ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ جہاز سے نیچے اتر کر میں نے دیکھا کہ رن وے سے کچھ دور ایئر پورٹ کے صدر دروازے کے باہر عوام الناس کا ایک جم غفیر کھڑا ہوا تھا، یہ لوگ ہم قیدیوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ایئر پورٹ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے جنہیں پولیس والوں نے باہر ہی روکا ہوا تھا۔

پاکستانی کمانڈوز نے ہمیں جہاز سے اتار کر اور ہمارے ہاتھ وغیرہ زنجیروں سے آزاد کر کے پشاور پولیس کے حوالہ کر دیا، پولیس والے ہمیں پولیس وینوں میں بٹھا کر ایئر پورٹ کے ایک بغلی دروازے سے تیزی کے ساتھ نکال کر سیدھے سنٹرل جیل (پشاور) لے گئے جبکہ ہمارے استقبال کو آئے ہوئے لوگ ایئر پورٹ کے مین گیٹ کے باہر کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے لوگوں کو اس وقت پتہ چلا جب ہماری گاڑیاں ایئر پورٹ کی چار دیواری سے نکل کر روڈ پر دوڑنے لگیں لوگوں نے ہم قیدیوں کی گاڑیوں کی طرف دوڑ لگائی تا کہ وہ قیدیوں کو ایک نظر دیکھ سکیں لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے.......... کیونکہ گاڑیاں کافی آگے نکل چکی تھیں......

ہمارے پشاور سنٹرل جیل میں پہنچنے کے اگلے دن ۶ ستمبر ۲۰۰۲ء کو پیچھے رہ جانے والے ۵۶ قیدیوں میں ۵۵ قیدیوں کو بھی پشاور جیل پہنچا دیا گیا جبکہ قاری امین اللہ کو امریکیوں نے حق گوئی کے ''جرم'' کی پاداش میں آزاد نہیں کیا بلکہ کابل ہی میں پابند سلاسل رکھا۔

پشاور جیل کے حکام نے ہمیں جیل کے سب سے عمدہ اور صاف ستھرے ہال میں رکھا، علاوہ ازیں ہم جتنے دن پشاور جیل میں رہے جیل انتظامیہ نے ہمارے ساتھ معزز مہمانوں جیسا سلوک روا رکھا اور ہم پوری جیل میں آزادانہ گھومتے پھرتے تھے، جیل کے ڈاکٹر بھی ہم قیدیوں کا اکرام کرتے تھے، ہم میں سے جب بھی کوئی قیدی جیل ہسپتال کے ڈاکٹر کے پاس دوائی

وغیرہ لینے کے لیے جاتا تو ڈاکٹر ہمیں جیل ہسپتال سے دوائی دینے کی بجائے تفریح کی غرض سے پشاور شہر کے ہسپتال بھیجنے کا بندوبست کر دیتا، اس طرح ایک دن میں بھی صرف سر درد کی دوائی لینے کی غرض سے جیل کے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنے کی بجائے ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھا ''شہر کا چکر لگانے کو تو آپ کا دل نہیں کر رہا۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا ''اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔'' ''میرے اس جواب پر ڈاکٹر صاحب نے میرا نام وغیرہ لکھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ ''آپ اپنی جگہ پر واپس جا کر انتظار کریں تھوڑی دیر تک جیل پولیس کے اہلکار آپ کو بلا کر شہر کے ہسپتال میں لے جائیں گے چنانچہ میں واپس اپنے ہال میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس اہلکار مجھے اور چار دیگر ہمارے قیدی ساتھیوں کو بلا کر باہر لے گیا جہاں پر ہمارے ایک ایک ہاتھ میں زنجیر ڈال کر ہمیں پولیس وین میں سوار کرا دیا گیا اور پولیس وین ہمیں لے کر پشاور شہر کی سڑکوں پر دوڑنے لگی اور کچھ ہی دیر بعد لیڈی ولینگڈن ہسپتال میں جا رکی، پولیس کے سپاہی ہمیں گاڑیوں سے اتار کر معائنے کے لیے ہسپتال کے ڈاکٹروں کے پاس لے گئے، ڈاکٹروں نے ہمارا چیک اپ کرنے کے بعد ہمیں دوائیاں لکھ دیں اور کہا کہ بازار سے خرید لیں، ہم دوائیوں کے نسخے لے کر پولیس والوں کی معیت میں ہسپتال کے باہر ایک میڈیکل سٹور پر آ گئے۔ جب ہم نے دوائیاں خریدنے کے لیے اپنے نسخے میڈیکل سٹور والوں کو دیے تو وہاں پر موجود ایک آدمی نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا: آپ لوگ افغانستان سے آئے ہوئے طالبان قیدی ہیں......؟'' جب میں نے ہاں میں جواب دیا تو میڈیکل سٹور پر موجود تمام لوگ بے پناہ خوشی کے ساتھ اپنے تمام گاہکوں کو چھوڑتے ہوئے ہم قیدیوں سے بغل گیر ہونے لگے، اس دوران پولیس والے ہمارے درمیان بالکل مزاحم نہ ہوئے بلکہ ایک طرف ہماری زنجیروں کو پکڑ کر کھڑے ہمارے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے بعد ازیں میڈیکل سٹور والوں نے ہم پانچوں قیدیوں کے نسخوں کے مطابق علیحدہ علیحدہ دوائیاں پیک کر کے ہمارے ہاتھوں میں تھما دیں' جب ہم نے دوائیوں کی قیمت کے بارے میڈیکل سٹور والوں سے پوچھا تو انہوں نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا ''آپ لوگ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں......... آپ لوگوں کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر

ہے.........آپ لوگوں سے دوائیوں کی قیمت وصول کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی.........اور ہم اپنے مجاہد بھائیوں سے زیادتی کرنا ہرگز پسند نہیں کریں گے.........اس لیے آپ لوگ جائیں اور ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔''

ہم پولیس وین میں بیٹھ کر واپس جیل میں آ گئے، جیل میں اپنے ہال میں پہنچنے کے بعد جب ہم نے اپنی دوائیوں کی پیکنگ کھولی تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہم پانچوں قیدیوں کے پیکٹوں کے اندر کاغذ کے لفافوں میں بند دو دو ہزار روپے موجود ہیں اور لفافوں کے اوپر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی ''اپنے مجاہد بھائیوں کے لیے ایک حقیر سا تحفہ۔''

یہ معاملہ صرف ہم پانچ قیدیوں کے ساتھ ہی پیش نہیں آیا بلکہ جو بھی ہمارا طالبان قیدی ساتھی دوائیوں کی غرض سے پشاور شہر لے جایا گیا، پشاور شہر کے محبّ اسلام لوگوں نے اس کے ساتھ ہمدردی، ایثار اور محبت کا ایسا ہی سلوک کیا۔

پشاور جیل میں پہنچتے ہی جہاں پاکستان کی مختلف خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار ہماری تفتیش کرنے، ہماری تصویریں اور فنگر پرنٹس وغیرہ لینے کے لیے آن پہنچے، وہیں پر ہم قیدیوں کی ملاقاتیوں کا بھی تانتا بندھ گیا، کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جب ہمارے ملاقاتیوں کی ایک بڑی تعداد ہم قیدیوں سے ملاقات کے لیے نہ آتی ہو، میری ملاقات کے لیے سب سے پہلے میرے بڑے بھائی شیخ محمد ارشد پشاور جیل میں پہنچے اور ان کے ملاقات پر آنے کے دو تین دن بعد میرے چچا شیخ مشتاق احمد مجھے ملنے کے لیے جیل میں آئے بعد ازیں کچھ دنوں کے وقفے سے میرے بچپن کے دوست جمال عبدالناصر بھی جیل میں آ کر مجھے ملے۔

پشاور جیل میں ہم قیدیوں سے ملاقات کے لیے آنے والوں کو کسی بھی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا، جو بھی آدمی ہم طالبان قیدیوں کی ملاقات کے لیے آتا اسے جیل انتظامیہ کو صرف اپنا شناختی کارڈ دکھانا پڑتا تھا اور جس قیدی سے ملاقات کرنی ہوتی اس کا نام بتانا پڑتا تھا اور ہم طالبان قیدیوں سے ملاقات کرنے کے لیے رشتہ دار ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی بلکہ ہر جاننے والا آدمی ہم سے ملاقات کر سکتا تھا اسی وجہ سے ہماری جماعت کے سپریم کمانڈر مولانا عبدالجبار صاحب اور دیگر تنظیمی ساتھی بھی پشاور جیل میں ہم قیدیوں سے وقتاً فوقتاً

ملاقات کرنے کے لیے آتے رہتے تھے علاوہ ازیں ہماری جماعت کے ساتھیوں نے پشاور جیل میں ہمارے لیے کھانے پینے کی اشیاء کے ڈھیر لگا دیئے، تینوں وقت تازہ اور نہایت ہی عمدہ کھانا باہر سے ہمارے ساتھیوں کی طرف سے ہمارے لیے جیل میں آتا تھا، ہمارے باہر کے ساتھیوں نے یہاں پر ہماری چھ سات سالہ کھانے پینے کی محرومیوں کا بھرپور طریقے سے ازالہ کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے چند دنوں کے اندر ہی ہم قیدیوں کو اپنے جسموں کے اندر توانائیاں دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

☆☆☆☆

بارھواں حصہ:

کوٹ لکھپت جیل لاہور سے آزادی تک

انہی دنوں وفاقی حکومت نے حسب ضابطہ ہم قیدیوں کو اپنے اپنے صوبوں میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۲ء کو عصر کے قریب پنجاب پولیس والے ہمیں لینے کے لیے آ گئے، کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد پنجاب پولیس کے اہلکاروں نے پنجاب سے تعلق رکھنے والے ہم ۴۲ قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر پنجاب پولیس کی گاڑیوں میں سوار کرا دیا اور یہ گاڑیاں ہمیں لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئیں۔

پولیس کی بھاری نفری، ایلیٹ فورس اور پولیس کمانڈوز کے حصار میں لے جاتے ہوئے رات کے دو بجے ہم قیدیوں کو سنٹرل جیل کوٹ لکھپت لاہور میں منتقل کر دیا گیا۔

لاہور جیل میں پہنچتے ہی جیل انتظامیہ نے ہماری جیبیں خالی کرواتے ہوئے جیبوں کا سامان اپنے پاس جمع کر لیا علاوہ ازیں ہماری گھڑیاں اور فالتو سامان بھی جیل انتظامیہ نے اپنے پاس رکھ لیا اور ہر قیدی کے سامان کی تفصیل اپنے پاس رجسٹر میں درج کر لی بعد ازیں ہمیں سیاسی قیدیوں کی بیرکوں میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔

لاہور جیل میں ہمارا پہلا مہینہ انتہائی تکلیف میں گزرا کیونکہ پہلے مہینے ہمیں مکمل طور پر بیرکوں میں بند رکھا گیا اور ٹہلائی وغیرہ کے لیے بالکل باہر نہیں نکالا گیا اور نہ ہی ہمارے ملاقاتیوں کو ہم سے ملنے کی اجازت دی گئی، دوسرے مہینے صرف ماں باپ، بیوی بچوں اور سگے بہن بھائیوں کو ہم قیدیوں سے ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی لیکن وہ بھی اس طرح کہ ان لوگوں کو ہم سے ملاقات کرنے کے لیے پہلے پنجاب کے ہوم سیکرٹری سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا پھر کہیں جا کر باریک جالیوں کے پیچھے سے ہمارے والدین وغیرہ ہم سے ملاقات کرنے کے قابل ہوتے تھے۔

ملاقات کی اجازت ملنے کے بعد میری والدہ محترمہ (اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!) اور میرے بڑے بھائی محمد ارشد مجھے ملنے کے لیے جیل میں تشریف

لائے، لاہور جیل میں پشاور جیل کی طرح ملاقات کے لیے کھلا وقت نہیں دیا جاتا تھا بلکہ یہاں پر ملاقات کے لیے بہت ہی مختصر ٹائم دیا جاتا تھا اور ہفتے میں صرف ایک مخصوص دن ہمارے ملاقاتی ہم سے ملاقات کے لیے آسکتے تھے۔ کوٹ لکھپت جیل میں سختی اور مشکلات کے باوجود ہماری جماعت والوں نے نہ ہم قیدیوں کو فراموش کیا اور نہ ہی نظر انداز بلکہ جماعت کے ساتھی مسلسل وافر مقدار میں کھانے پینے اور استعمال کی دوسری چیزیں جیل میں ہم تک پہنچاتے رہے اور انہوں نے ہمیں کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا علاوہ ازیں جماعت والوں نے پشاور اور لاہور میں آنے والے ہمارے ملاقاتیوں کے لیے بھی کافی حد تک آسانیاں فراہم کر رکھی تھیں۔

اکتوبر کے مہینے میں جیل انتظامیہ نے ہم قیدیوں کے کوائف ویری فیکیشن کے لیے ہمارے مقامی تھانوں کو ارسال کر دیئے جہاں سے ہم قیدیوں کے مقامی تھانوں کے ایس ایچ اوز ہمارے علاقوں سے ہمیں ویری فائی کرنے کے بعد نومبر کے مہینے میں ہماری تفتیش کرنے کے لیے جیل میں آن پہنچے، جیل میں پہنچنے کے بعد ان ایس ایچ اوز نے اپنے اپنے علاقے کے قیدیوں کی تفتیش شروع کر دی، میرے لیے دو علاقوں کے ایس ایچ اوز آئے ہوئے تھے، ایس ایچ او ریاض میرے آبائی علاقہ سے آیا تھا جبکہ ایک ایس ایچ او تھانہ ٹاؤن شپ لاہور سے آیا تھا، جب ان دونوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی مستقل رہائش کونسی جگہ پر ہے تو میں نے ان کو بتایا کہ "ہم ۱۹۹۳ء سے لاہور کے علاقہ ٹاؤن شپ میں رہائش پذیر ہیں اور آزاد ہونے کے بعد بھی میں لاہور ہی میں رہوں گا۔"

میرے اس جواب کے بعد میرے آبائی علاقہ کے SHO نے میرا ریکارڈ تھانہ ٹاؤن شپ لاہور کے SHO کے حوالے کر دیا، چنانچہ تھانہ ٹاؤن شپ لاہور کے SHO نے ہی میری تفتیش کی اور میرا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

آزادی

دسمبر ۲۰۰۲ء کا مہینہ شروع ہوا تو دسمبر کی ۲ یا ۳ تاریخ کو رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ بھی شروع ہو گیا اور جوں جوں رمضان کا مہینہ گذرنے لگا ہم قیدیوں میں پریشانی اور اضطراب

سا پیدا ہونا شروع ہو گیا کیونکہ ہر قیدی کی خواہش تھی کہ کم از کم عید ہم اپنے گھروں میں اپنے پیاروں کے ساتھ جا کر منائیں لیکن آدھا رمضان گزرنے کے باوجود بھی جیل میں ہمیں دور دور تک آزادی کی کوئی بات سنائی نہیں دے رہی تھی علاوہ ازیں ہمارے اضطراب کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ انہیں دنوں ہمیں اپنے ملاقاتیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ دوسرے صوبوں کے قیدی ستمبر ہی میں آزاد کر دیئے گئے تھے، اس خبر کے سننے کے بعد قیدیوں میں بے چینی پیدا ہونا ایک فطری بات تھی کہ ہم پنجاب والوں کو کیوں آزاد نہیں کیا جا رہا۔

اسی اضطراب اور پریشانی میں پورا رمضان گذر گیا اور آخری روزہ آن پہنچا، آخری روزہ کی سحری کے وقت ہم تمام قیدیوں نے اللہ رب العزت کے حضور خوب گڑ گڑا کر آزادی کی دعائیں مانگیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری دعائیں قبول ہوگئیں کیونکہ اسی دن نماز ظہر کے بعد ہم تمام قیدیوں کو ہمارے ساز و سامان سمیت بیرکوں سے نکال کر جیل کے صدر دروازے سے متصل کمروں میں لے جایا گیا جہاں پر ہر قیدی کے دو دو رشتہ دار اپنے اپنے قیدی کی ضمانت دینے کے لیے پہنچے ہوئے تھے، میری ضمانت کے لیے میرے بہنوئی حبیب احمد اور میرے بڑے بھائی محمد ارشد آئے ہوئے تھے۔

جیل انتظامیہ نے قیدیوں کا جو سامان اپنے پاس جمع کیا تھا وہ بھی اس دوران انہوں نے ہم قیدیوں کو لٹا دیا۔

جب ضمانتوں کی کاغذی کارروائی مکمل ہوگئی تو سرکاری حکام نے تمام قیدیوں کو جیل سے باہر کھڑی ویگنوں میں لے جا کر بٹھا دیا جب تمام قیدی اور ان کے رشتہ دار گاڑیوں میں سوار ہو چکے تو گاڑیاں ہمیں لے کر لاہور شہر کی سڑکوں پر دوڑنے لگیں اور آدھے گھنٹے بعد سنگ پورہ (باغبان پورہ) کے ایک سکول میں جا رکیں جہاں پر ساتھیوں نے ہم قیدیوں کی افطاری کا انتظام کیا ہوا تھا۔

بیگم پورہ کے اس سکول میں مجاہدین کے پیر و مرشد حضرت مولانا مفتی غلام مصطفیٰ صاحب دامت برکاتہم پہلے سے ہمارے استقبال کے لیے پہنچے ہوئے تھے، افطاری سے پہلے حضرت مولانا مفتی غلام مصطفیٰ صاحب نے ہم قیدیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ہمیں بہت ہی قیمتی

اور نادر نصیحتوں سے نوازا، بعدازیں انہوں نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں دعا کروائی۔

افطاری کرنے کے بعد ہم سب لوگ آزاد تھے چنانچہ مفتی غلام مصطفیٰ صاحب نے ہم سب لوگوں کو اپنے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رخصت کر دیا، وقت رخصتی انتہائی رقت آمیز منظر تھا، تمام قیدی ایک دوسرے کو پرنم آنکھوں کے ساتھ الوداع کہہ رہے تھے اس دوران بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت ہی محبت کرنے والے سگے بھائی ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہوں۔

دوسرے قیدیوں کی طرح میں بھی اپنے بڑے بھائی اور بہنوئی کے ساتھ رکشہ میں بیٹھ کر ٹاؤن شپ میں اپنے گھر آن پہنچا جہاں پر میری بہنیں اور میرے عزیز واقارب پہلے سے میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔

میرے گھر پہنچنے سے عید کی رات کو ہی عید کا سماں پیدا ہو گیا اور میرے تمام عزیز واقارب خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے مجھے ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے، سب سے زیادہ میری والدہ محترمہ (اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین) میری بہنیں اور میرے بڑے بھائی میری آزادی پر خوش تھے اور شکرانے کے نفل ادا کر رہے تھے۔

۱۹۹۶ء میں وادی پنجشیر سے شروع ہونے والا قید وبند کا یہ سفر بالآخر ۲۰۰۳ء کی پہلی رات لاہور میں اپنے اختتام کو پہنچ گیا اور اس طرح ۲۰۰۳ء کا سورج ہماری آزادی کی نوید بن گیا۔

☆☆☆☆

نظم

امت مسلمہ اور بالخصوص رہائی پانے والے مجاہدین کے نام اسیر مجاہدین کا پیغام

میرے زندان کے ساتھی کہیں تم بھول نہ جانا
اذیت کے کٹہروں میں جو ہم نے دن گزارے تھے
وہ میدانوں کی جب ہم جنگ ایوانوں میں ہارے تھے
عدو کی صف میں جس دم کھڑے محسن ہمارے تھے
اگر آزاد دنیا کی طرف جاؤ تو واں جا کر
ہمیں دل کے نہا خانوں سے یکسر مت ہٹا دینا
ہمارے انتظار آرزو کا عزم کا قصہ
ادھر جا کر سنا دینا سبھی کو یہ بتا دینا
وہاں پر دور پنجروں میں کچھ ایسے لوگ رہتے ہیں
جو حق کے معرکوں کے واسطے ہر دم ترستے ہیں
وہ سب رحمٰن کے بندے عجم کی آنکھ کے تارے
وہ سب ایمان کے ساتھی عرب کے وہ گہر پارے
جنہیں دشت و جبل نے عزم کے پیکر میں ڈھالا تھا
جنہیں مالک نے کتنی بھٹیوں سے چن نکالا تھا
وہ جن کے سوز میں اخلاص کے ساغر چھلکتے تھے
وہ جن کی آنکھ میں امید کے جگنو چمکتے تھے
جو دن روزے سے رہتے تھے غم شب ہنس کے سہتے تھے
ہمارا رب ہے اک اللہ فقط یہ بات کہتے تھے
میرے مشکل دنوں کے ہمسفر زندان کے ساتھی

ہمارے دل کے ٹکڑے ان کے آگے پیش کر دینا
دعاؤں سے ہماری ان کے دامن خوب بھر دینا
انہیں یہ بھی بتا دینا جو ہم اس راہ میں نکلے
سوائے دردِ امت کے ہمیں درپیش غم نہ تھے
ابھی بیمار ماں کو بھی معالج کو دکھانا تھا
ضعیف اک باپ کا بھی ہاتھ پھر ہم کو بٹانا تھا
مگر ہم سر ہتھیلی پر لیے فی اللہ نکل آئے
یہ فرض عین بھی آخر ہمیں ہی تو نبھانا تھا
میرے زندان کے ساتھی اگر تم یاد رکھ پاؤ
انہیں پیغام دے دینا جنہیں آزاد تم پاؤ
کہ آؤ اک حسیں دنیا کے مل کر خواب ہم دیکھیں
خلافت ہو جہاں اسلام کی غالب شریعت ہو
جہاں پر آخرت کا خوف ہو یہ دل جہاں پگھلیں
جہاں سے اندلس و اقصیٰ کی جانب قافلے نکلیں
جہاں تیغ و سپر ایمان اور صبر و توکل ہو
جہاں پر شوکت اسلام کے لشکر مشکل ہوں
ہر اک طاغوت سے ہر شرک سے انکار کی دنیا
ابوبکر و عمر عثمان کی کرار کی دنیا
جہاں ہو نور کی بارش سبھی دل یوں منور ہوں
ہر اک دوجے سے یہ پوچھے تیرا ایمان کیسا ہے
ہے علم دین کیا اور تعلق قرآن کیسا ہے
اخوت کے حسیں رشتوں محبت پیار کی بستی
مہاجر کے لیے جائے پناہ انصار کی بستی

مگر وہ دن تو آئے گا کہ جب یہ جان لیں گے ہم
اس اک اللہ کی رسی کو مل کر تھام لیں گے ہم
اگر تم نرم قالینوں کھلے صحنوں بھری بنکوں کی دنیا میں پلٹ جاؤ
تو ان سے یہ بھی کہہ دینا
شبر غان و ابو غریب کے اور گوانتا ناموں کے
وہ چین ہند کے القدس کے اور اس پار آمو کے
اسیروں کا چھڑانا اک معین فرض ہے تم پر
کہ فلک العانی ہے حکم نبیؐ جو قرض ہے تم پر
پڑے ہم منتظر ہیں کب کوئی طارق کوئی قاسم
ہماری چوکھٹوں کی یہ سلاخیں توڑ ڈالے گا
صیہونی اور صلیبی دست قاتل موڑ ڈالے گا
مسلط کتنی مدت کے یہ پہرے سب ہٹا لے گا
نگاہیں منتظر ہیں دل تمہیں آواز دیتا ہے
تمہارا رب تمہیں خود جنتوں کے راز دیتا ہے
بس اک وعدہ کرو ہم سے کہ اب آزاد ہو کر بھی
دعائے نیم شب سے تم ہمیشہ شاد رکھو گے
میرے زندان کے ساتھی ہمیں تم یاد رکھو گے

☆☆☆☆

بے درد تماشائی نہ بنو

اگر قیامت کا آنا حق ہے اور یہ جھوٹ نہیں کہ خدا کا وجود ہے تو مسلمانان عالم کے پاس اس وقت کیا جواب ہوگا؟ جب قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ تم کروڑوں کی تعداد میں زندہ وسلامت موجود تھے، تمھارے جسموں سے روح کھینچ نہیں لی گئی تھی۔ تمہاری قوتوں کو سلب نہیں کر لیا گیا تھا۔ تمھارے کان بہرے نہ تھے۔ نہ ہاتھ کٹے ہوئے اور پاؤں لنگڑے۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تمہارے سامنے بھائیوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئیں۔ وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے۔ اسلام کی آبادیاں غیروں کے قبضہ وتسلط سے پامال ہوگئیں۔ پر نہ تو تمہارے دلوں میں جنبش ہوئی نہ تمہارے قدموں میں حرکت ہوئی۔ نہ تمہاری آنکھوں نے محبت و ماتم کا ایک آنسو بخشا اور نہ تمہارے خزانوں پر سے بخل و زر پرستی کے قفل ٹوٹے؟ تم نے چین وآرام کے بستروں پر لیٹ لیٹ کر بربادئ ملت پامالی اسلام کا یہ خونیں تماشا دیکھا اور اس بے درد تماشائی کی طرح بے حس وحرکت تکتے رہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر ڈوبتے ہوئے جہازوں اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہا تھا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد)

مکتبہ شاہ اسماعیل شہید خانیوال